

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_188325**

UNIVERSAL  
LIBRARY

188325

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۸ Accession No. ۴۲۶۲

Author گوری مسک گوری - ۱

Title گوری کی آہستہ

This book should be returned on or before the date  
last marked below.

---





سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۶

# گورکی کی آپ بیتی

حصہ اول — میرا بچپن

از  
میکسم گورکی

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ڈی لٹ (پیرس)

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

۱۹۴۰ء

.....  
حکیم ذکی احمد خاں نے ”جید پریس“ دہلی میں چھاپا  
اور  
نیجرا انجمن ترقی اردو (دہند) نے دہلی سے شائع کیا

مقدم

انیسویں صدی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا جب میکسم گورکی کی ادبی زندگی آغاز ہوا۔

”یہ وہ دن تھے جب انقلابِ فرانس کے پیدا کیے ہوئے تمدنی اقتدار کا اثر مٹ رہا تھا اور ایک نیا دور نئے مطالبات کے ساتھ وجود میں آ رہا تھا۔ انسانیت پروری اور برہنہ پرکائی جم رہی تھی۔ مشینوں کی ہماہمی، فوجوں کی گہما گہمی، سامراجیوں کی کٹا چھنی — دنیا کا یہ منظر تھا۔ سماجی نظام تو بدل ہی رہا تھا، اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رہتے سہنے اور سوچ بچار کی ہنج بھی کچھ سے کچھ ہو رہی تھی۔

مگر روس ابھی اس منزل پر تھا جہاں فرانس اپنے انقلاب سے پہلے تھا۔ زار اور اس کے حالی موالی اتنے عرصے سے ملک کی رگ جان پر جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے کہ بظاہر لہو کی بوند بھی اس میں باقی نہ تھی۔ یورپ — خصوصاً فرانس — کی ترقی پسند تحریکوں نے روس میں بیداری کا جو صور پھونکا تھا اب اس کی صدائے بازگشت مدھم پڑ گئی تھی۔ کہاں روسی ادب کے مسیحائے اشد "کاترانا آزادی" اور کہاں چیخوف کی دنیا۔

انیسویں صدی کے آخری دہائیوں میں یورپ اور روس کی

ادبی محفل پر بیزاری اور اُداسی کی سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ ادیب نئی طاقتوں اور نئی تہذیبوں کو دیکھ تو رہا تھا مگر انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ فرانس کے ادیب ٹلے ہوئے تھے کہ سماج کی تلچھٹ کو کھنگالا جائے، پیا جائے اور پلایا جائے۔ ان میں سے بہترے تنزل پسندی کا بے سُراگِ الاپ رہے تھے۔ ادھر انگریزی ادب کا وکٹورین عہد ختم ہو رہا تھا۔ ٹامس ہارڈی کے ناولوں کی مغنومیت — ساتھ ہی ساتھ اخلاقی جرات ایک نئے راستے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ادھر اوسکرویلڈ جمال پرستی کا جادو جگانے نکل رہا تھا۔ یہ دو رجحان — یعنی زمانہٴ تغیر کی پیچیدگیوں کی وجہ سے مایوس ہو جانا یا ان سے متہ جہرانا — ہر طرف عام ہو گئے تھے۔

یہی حال رُوس کا تھا۔ مشینوں اور کارخانوں کا لگا یہاں بھی لگ چکا تھا اور ان کی وجہ سے پہلے لوگوں کی معاشی اور پھر معاشرتی زندگی تیزی سے بدلنے لگی تھی۔ مگر زار شاہی اپنی ساری لعنتوں کے ساتھ اب بھی مسلط تھی۔ بڑھتے ہوئے اقتصادی نظام اور رجعت پرور سیاسی نظام میں بنیادی تضاد تھا۔ اس کی وجہ سے ملک کی زندگی کی رُوں کوئی یک جہتی نہ تھی۔ اس انتشار کا اثر ادیبوں نے بھی مختلف طریقوں سے قبول کیا۔ اس دور کے سب سے بڑے ادیب چینوف کو دیکھو تو وہ انسانوں کی بے حسی، بے دروی اور بے عقلی پر نالاں ہو۔ وہ دیکھتا ہو کہ اس کا ماحول بے رنگ ہو جس میں

ایک سے لوگ ایک سی زندگی بسر کرتے مر جاتے ہیں۔ نہ ان میں تصور ہو نہ تخیل، نہ ان کی حیات کا کوئی مقصد ہو۔ نطق انسانی کا سب سے بامعنی لفظ 'کیوں؟' ان کی زبان پر کبھی آتا بھی ہو تو اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ چیخوف کا درمند دل ان دو ٹنگے چانوروں کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی دُور رس نگاہ اس طوفان تک جا پہنچتی ہو جو اُفق پر سمٹ رہا ہو اور آن کی آن میں ظلم و جہل کے اس خراب آباد کو مٹا دے گا۔ اپنے ڈراموں میں کہیں کہیں وہ یہ توقع ظاہر بھی کرتا ہو: ”وہ زمانہ آ رہا ہو، ہم سب میں کوئی عظیم الشان قوت کروٹ بدل رہی ہو۔ ایک زبردست طوفان اُٹھ رہا ہو اور تیزی سے ہمارے قریب آ رہا ہو۔ دم کے دم میں وہ ہمارے سماج سے کاہلی، بے پروائی، بے کاری اور بے لطفی کو اُڑا لے جائے گا۔“

(Three Sisters)

مختصراً روس کی یہ سماجی اور ادبی کیفیت تھی جب میکسم گورکی نے ۱۹۰۲ء میں اپنا پہلا افسانہ شائع کیا۔ اس کا اصل نام 'الکسی پیشکوف' تھا اور وہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۸ء کو 'نرینی نووگورد' میں پیدا ہوا تھا۔

گورکی نے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی داستان خود ہی لکھی ہو اور حق یہ ہو کہ خوب لکھی ہو۔

آپ بیتی کی یہ تینوں جلدیں ، روزنامے کے چند اوراق اور طاسطائی کی یادداشت ————— یہ گور کی کے شاہکار ہیں۔ پیش نظر کتاب نئے گور کی کو زندگی کی چوکھٹ پر لاکر کھڑی کر دیتی ہے۔ اس کا باپ ایام طفلی میں ہی مرجکا تھا ، ماں دوسری شادی کر لیتی ہے اور گور کی کی پرورش نانا نانی کے سپرد ہوتی ہے۔ ابھی وہ نو دس سال کا ہوگا کہ ماں گھر لوٹ کر مرجاتی ہے ، نانا گنگال ہو جاتا ہے اور گور کی سے کہتا ہے: ”اب تمہارے لیے میرے گھر میں جگہ نہیں ہے، جاؤ دنیا میں اپنا راستہ آپ بناؤ۔“ یہاں گور کی کی کتاب زندگی کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نگرے یتیم کی رام کہانی ہے اور ادب عالم میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہاں آپ مبلغ گور کی نہیں، آرٹسٹ گور کی کو اپنے اوج کمال پر دیکھیں گے۔ یہ اس کے مشاہدے کا کمال ہے۔ من کے سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے گور کی اسے سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ نہ تو اسے دُور کی چیزوں کو دیکھنے کا ڈھب آتا تھا ، نہ اپنے کردار کے دل و دماغ کو سمجھنے کا وسیلہ۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ اس کی زندگی گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزری اور اسی لیے وہ باہر کی دنیا سے باخبر مگر اندر کی ہوتی انہونی سے بے خبر ہو جی ہو آس پاس کی چیزوں اور آدمیوں کو وہ جتنا جانتا پہچانتا ہے اور کوئی نہیں۔ وہ جس آدمی سے ملتا تھا ————— اور یاد رہے

کہ اس کے واقف کار ہزاروں کی تعداد میں سارے  
 رؤس میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہر اشارے  
 ہر کنائے اور ہر جملے کو ذہن نشین کر لیتا تھا۔ مشاہدہ اور حافظہ۔  
 یہاں گور کی کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ اس کی مثال آپ کو اس  
 کتاب میں ملے گی۔ کہتا ہو: میرا بچپن گویا شہد کا چھتا تھا۔  
 جس طرح شہد کی مکھیاں وہاں شہد لے لے کر آتی ہیں سیدھے  
 سادے اور گننام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لے لے کر  
 میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال  
 کر گئے: حیرت اس امر پر ہو کہ تیس بیستیس سال بعد زار شاہی  
 کے دست برد سے نکل کر اپنے وطن سے کالے کوسوں  
 دور جب وہ اطالیہ کے جزیرہ کا پری میں یہ آپ بیتی لکھنے  
 بیٹھا تو اسے بچپن کی سب باتیں جوں کی توں یاد رہیں۔  
 اوائل عمر کے ہر ساتھی کی جیتی جاگتی صورت اس کے سامنے  
 آگئی۔ اس کی کہانیاں اور گیت کانوں میں گونجنے لگے۔ اس کی  
 چال ڈھال تک اسے نہ بھولی۔

گور کی کی اس تصنیف کو پڑھ چکنے کے بعد اگر آپ  
 اس کا مقابلہ اس کے ناولوں سے کریں گے تو میری رائے  
 سے اتفاق کریں گے کہ اس کا اصل میدان سوانح نگاری ہو۔  
 اس فن کو اس نے ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور آندرے  
 مور وایا ایل لڈوگ کا سلسلہ اس سے آکر ملتا ہو۔ فرد کو  
 وہ پس منظر میں رکھتا ہو۔ اس کی زیادہ توجہ ماحول کی

تصویر کشی پر صرف ہوتی ہے۔ تخیل نفسی سے اسے رغبت نہیں، وہ تو یہی دیکھتا ہے کہ انسان کا باطن کس روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ داخلی زندگی سے اس دامن کشی کی وجہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ علاوہ بریں اس کا فلسفہ زندگی بھی اسی کی تلقین کرتا تھا۔ انسان کو وہ آئے دن کی زندگی سے پہچانتا ہے، بڑے بڑے واقعات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے تجسس کی کوئی انتہا نہیں۔ اپنی دُور بین نگاہوں سے وہ ہر باریک سے باریک ممکنے کو گھورا کرتا ہے اور طاسطائی جیسے استاد کو بھی گور کی کی یہ چھان بن سخت ناگوار ہے۔ اسے وہ گور کی کی شک پرست طبیعت پر محمول کرتا ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ گور کی کو کسی شے پر ایمان مطلق نہیں۔ اس کی واحد کسوٹی انسان کی زندگی ہے اور اسی پر وہ سب کے قول و فعل کو پرکھتا ہے۔

لیکن گور کی اپنے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے مشہور ہوا، اس کی تحریروں کے مذکورہ بالا حصے کو قبول عام میسر نہ ہوا۔

زندگی کے اس دُور کو گزار چکنے کے بعد جس کے حالات آپ بیتی کی تینوں جلدوں میں قلم بند کیے ہیں، گور کی نے مصنف کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۶ - ۲۷ سال ہوگی۔ اپنی ادبی زندگی اس نے چھوٹے افسانوں سے شروع کی۔ ان کا مجموعہ شائع ہوا ہی تھا کہ



سارے ملک میں گور کی کی دھوم مچ گئی۔ ملک ادیب سے جو پیغام سنا چاہتا تھا وہ بڑی دیر کے بعد یہاں سنائی دیا۔ یہ سچ ہے کہ پشکن اور گور کی کا درمیانی دور روسی ادب کا زرین عہد تھا۔ اس میں باہر کی دنیا کو روسی روح کا اصل جوہر تو ملتا ہے لیکن روس والے اس دکھ بیتی سے تھک گئے تھے۔ وہ اپنے بند غم کو توڑنے کے لیے بیکل تھے اور ادب میں روشنی اور امید کی وہ جھلک دیکھنا چاہتے تھے جن کی پہلی کرنیں سیاسی فضا کو اُجالا رہی تھیں۔ یہ سندلیہ سب سے پہلے گور کی نے سنایا اور ایسے نرالے انداز سے کہ سب چونک پڑے۔ دوسروں کا مطالعہ اب تک روسا، متوسط طبقہ یا کسانوں کی زندگی تک محدود تھا اور سماج کے یہ طبقے بیمار تھے۔ گور کی نے اپنے رہنے کے لیے نئی دنیا تلاش کی۔ اس کی ادبی کاوشیں آوارہ گردوں کی کردار نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں۔ روسی کی فطرت میں ایک خاص قسم کی فلسفیانہ آوارگی پسندی ہوتی ہے جس کا مقابلہ ہندستان کے کن پھٹے جوگیوں اور ان کے منتر جنتر سے نہیں ہو سکتا۔

موچی، خلاصی، نان بائی، دربان، قلی۔ غرض کہ آٹھ دس سال کی مدت میں بیسیوں دھندوں کی ناکام مشق کے بعد گور کی نے آوارہ گردی کا ہمیشہ اختیار کیا

اور برسوں ایک سرے سے دوسرے تک روس کی خاک چھانتا پھرا۔ آوارہ گردوں کے فلسفہ حیات کا اس پر گہرا اثر ہوا اور دیر تک باقی رہا۔ اپنے ناولوں، اسکچوں اور افسانوں میں اس کا اظہار اس نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ آوارہ گرد کو کسی خاص مقام سے محبت نہیں ہوتی۔ وہ ہر قسم کی اخلاقی اور قانونی پابندی کا مخالف ہوتا ہے۔ کئی آزادی اور نراجی اس کا مشرب ہے۔

اسی آزاد مشرب کو گور کی نے اپنا ہیرو بنایا۔ جیسے جیسے اس کی سوچ بوجھ میں وسعت آتی گئی اور سماجی مسائل کی تہ تک اس کی نگاہ پہنچتی گئی، اس کے آوارہ ہیرو کی بے راہ روی بھی کم ہوتی گئی۔ وہ پہلے باغی اور پھر انقلابی و اشتراکی بن بیٹھا۔ اس کے آئینے میں گور کی کے ارتقا کی شکل صاف نظر آتی ہے۔

ان افسانوں کی اشاعت کے وقت گور کی کی عمر صرف تیس سال تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے جو مقبولیت ملی اس کی مثال ادبی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ بڑی بات تھی کیونکہ طاسطائی ابھی زندہ تھا اور چیخوف اپنے کمال کے عروج پر تھا۔ گور کی مارکہ سگریٹ اور گور کی چھاپ کی دیا سلامی ہر ہاتھ میں نظر آنے لگی۔ اٹھائی گھرے بھلے مانسوں کو سڑک پر روک کر گور کی کا جام صحت پینے کے لیے دام طلب کرنے لگے! کچھ من چلے تو سرکاری افسروں کے

قتل کے لیے ریوالور خریدنے کی غرض سے گور کی کے نام پر چندہ بھی مانگنے لگے !! - گور کی کا والہانہ لباس فیشن میں آگیا اور دیوان خانوں میں انقلاب پسند معشوق گلی کوچوں کی بولی کھولی فخریہ زبان پر لانے لگے -

اس شہرت کی اصل وجہ افسانوں کی ادبی خوبی سے زیادہ ان کے موضوع کی نوعیت اور مصنف کی شخصیت تھی۔ لوگ جن بے گھروں کو در در کی خاک چھانتے دیکھتے تھے اب وہ سماجی احتجاج کے علم بردار بن کر نکلے تھے۔ اور ان کا سالار ایک عامی تھا جو للکار رہا تھا: ”میں زندگی کی صدائے حق ہوں، میں ان ٹھکرائے اور روندے ہوئے مظلوموں کی آواز ہوں جو سماج کے سب سے نیچے زینے پر پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنا فسانہ غم سنانے بھیجا ہے۔“

اس طرح ادب میں تہی دست طبقہ کی ترجمانی شروع ہوئی۔ اس کی گونج دؤر دؤر تک پہنچی اور اس ادبی انقلاب کی بنا پڑی جس کے اثرات ہم گھر باہر ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گور کی کسی ’حظ‘ کے لیے نہیں بلکہ ایک واضح مقصد کے لیے لکھ رہا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی تحریروں میں نصیحت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ موقع بے موقع اس کے کردار اس کے خیالات کا اظہار لہنی لہنی تقریروں میں کرنے لگتے ہیں اور یہ گور کی کے

آرٹ کا بڑا عیب ہو۔ مگر یہی عیب عوام کے نزدیک اس کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ انھیں نصیحتوں اور تقریروں میں اس کا فلسفہ حیات سمویا ہوا ہو۔

میں اس دنیا سے اختلاف کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔۔۔۔۔۔ یہ گورکی کی حیات کا جیکار (Slogan) ہے۔ تیس سال لگاتار وہ زار شاہی کے خلاف لڑتا رہا، بارہا جیل گیا، نظر بند ہوا، دیس نکالا جھگتا۔ اس دوران میں وہ بولشیویک پارٹی کا حامی بن گیا اور بعض اختلافات کے باوجود قلمی درمے اس کی مدد کرتا رہا۔ انھیں کی صحبت اور خصوصاً لینن کی دوستی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی باغیانہ خواہ ایک ڈھڑے پر لگ گئی اور اس کا قلم احتجاج سے بڑھ کر انقلاب کی تلقین کرنے لگا۔ اس قسم کی تحریروں میں اس کا ناول (Mother) سب سے زیادہ ممتاز ہے۔

گورکی کی ادبی زندگی تین حصوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد اور ان دونوں عہدوں میں رؤس سے باہر انقلاب کے پہلے کا دور سیاسی سرگرمیوں اور خصوصاً ناول نگاری کا ہے۔ بعد ازاں جب کبھی وہ رؤس میں رہا اپنا زیادہ وقت انقلاب کی تہذیب پر صرف کرتا رہا۔ مگر اس کے ادبی شاہکاروں کا بیشتر حصہ دیس سے

باہر لکھا گیا۔ اٹلی کے جنت نظیر جزیرہ کاپری کو انھیں جہنم دینے کا فخر حاصل ہے۔ مجھے قیام یورپ کے زمانے میں یہاں جانے کا موقع ملا۔ نیپس کی بندرگاہ سے اسٹیمر گھنٹے بھر میں یہاں پہنچا دیتا ہے۔ نیلے سمندر کے بچوں نیچ پہاڑیوں کے دامن میں یہ ہرا بھرا ٹاپو ابدی بہار کی رنگینوں سے بھرپور ہے۔ سیاح اب بھی وہ مکان دیکھنے جاتا ہے جہاں ادب جدید کے پیغمبر نے اپنی امر کہانی لکھی تھی۔ دُور بیٹھ کر گور کی زیادہ وسیع النظری اور توازن سے اپنے خیالات و مشاہدات کو سمیٹ سکتا تھا۔ روس کے اندر وقتی ہنگاموں کا اثر اس کی پُر جوش طبیعت فوراً قبول کر لیتی تھی اور وہ زندگی کی بے کرائی کو فراموش کر جاتا تھا۔

انقلاب روس سے پہلے جلا وطنی کی حالت میں کاپری میں دن گزارتے ہوئے، وہ اپنے ماضی کی ورق گردانی کرنے بیٹھا۔ پہلے تو وہ حیس و بیس میں رہا کہ اوائل عمر کے جلتے ہوئے پھپھولوں کو چھڑے یا نہیں، مگر ضمیر نے دلاسا دیا: ”جب روس کی اُس وحشیانہ زندگی کا خیال آتا ہے تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیوں کیا جائے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ ذکر جائز ہے کیونکہ حقیقت پر مبنی ہے۔“

یہ وہ ہیں کا پیڑ ہر جس کی جڑ تک ہمیں پہنچنا ہے۔ اسے لوگوں کی رُوحوں اور ذہنوں سے نکالنا اور اپنی مکروہ دتاریک دنیا سے مٹانا ہے۔“

اس کتاب میں گور کی ناظر کو بتلاتا ہے کہ ہر معمولی سے معمولی آدمی اپنی شخصیت رکھتا ہے۔ اس کے ثواب و عذاب الگ ہیں، خواب و ارمان جدا ہیں۔ ہر زندگی ایک افسانہ ہے۔ ہر آدمی ایک کیرکٹر ہے۔ آنکھوں والا چاہیے۔ یوں اس نگار خانے میں تماشوں کی کمی نہیں۔

مگر انسانوں کے ارد گرد گویا کوئی مکڑی جالا بن رہی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ زنجیروں میں کسے ہوئے ہیں، کن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے سپنے بھیانک، ان کے ارمان گھونے۔ وہ سب اسیر ہیں، زندگی کے اسیر۔

ان میں سے کسی کسی کو آزادی کی راگنی یاد ہے اور اس کی تان اس ہیبت ناک ماحول کو منور کر دیتی ہے۔ گورگی کی نانی بھی انھیں میں سے ہے اور اس اندھیری دنیا میں جگنو کی طرح چمک رہی ہے۔

گورگی نے یہ تذکرہ بڑی بے تکلفی سے لکھا ہے۔ اس کے اندازِ بیان میں صداقت اور خلوص کی ایسی

گھلاوٹ ہو، سادگی کے ساتھ ہلکی سی رنگینی کی ایسی ملاوٹ ہو، جو من موہ لیتی ہو۔ وہ اپنے میں اور ناظر میں کوئی فص نہیں رکھتا۔ طاسطائی میں ایک قسم کا رُسیانہ تپاک ہو، دستوویکی میں بیماروں کا چڑچڑا پن ہو، چیخوف میں مفکّرانہ تنہا پسندی ہو جو ناظر کو اُن کے قریب جانے سے روکتی ہو۔ مگر گورکی میں ایسی اپنائیت ہو جو اپنے پرائے میں تیز نہیں کرتی۔ اس کتاب کے سب کردار نام بدل دیں تو زندہ جاوید ہر گلی کوچہ میں چلتے پھرتے ملیں گے۔ وہ دیکھیے، نانا جان ماسٹھے پر بل ڈالے مخدوش انداز سے ڈنڈا ہلاتے چلے آ رہے ہیں۔ ادھر نانی اماں آنگن میں بیٹھی کہا نیاں کہہ رہی ہیں، پہیلیاں بجا رہی ہیں، بوڑھا جاکوٹ دیوار کی اوٹ سے بچوں کی شرارت دیکھ رہا ہو اور انھیں سزا دلانے کے منصوبے باندھ رہا ہو۔

گورکی کی ترجائی کے لیے اس کی آپ بیتی کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ اس کی بہترین تصنیف ہونے کے علاوہ وہ انگریزی زبان میں کم یاب ہو۔ ہماری بد نصیبی کہ یورپین ادب انگریزی چھلنی سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہو اور انگریزی مزاج جس چیز کو قبول کرنے کا

اہل نہیں وہ دیر کے بعد ہمیں ملتی ہے۔ اس آپ بیتی کی  
باقی دونوں جلدوں کے ترجمے زیر ترتیب ہیں اور  
انجمن انھیں بھی عنقریب ہدیہ ناظرین کرے گی۔

اختر حسین



میرا بچپن



## باب ۱

ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھڑکی کے پاس میرا باپ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت لمبی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ننگے پاؤں کی انگلیاں عجیب طریقے سے پھیل گئی تھیں۔ ہاتھ سینے پر بے حرکت پڑے تھے اور ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ اس کی سُکراتی ہوئی آنکھیں تانبے کے دو سیاہ ٹکڑوں کے بارے سے بند تھیں۔ چہرے کا نور اُڑچکا تھا اور وہ حمیامیہانک ڈھنگ سے اپنے دانت دکھا رہا تھا، اس سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

ایک سُرخ سائے سے اپنا نیم جسم ڈھانکے ہوئے میری ماں دو زانو بیٹھ گئی اور بابا کے نرم و دراز بالوں کو اُسی کالی کنگھی سے سُجھانے لگی جس سے میں تربوز کے چھلکے اُتارنے کا کام لیتا تھا۔ وہ اپنی بھڑائی ہوئی دھیمی آواز میں لگاتار بڑبڑاتی جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی موسلا دھار جھڑی اس کی سوچی ہوئی آنکھوں کو بہا لے جائے گی۔

میری نانی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کا سر بڑا اور گول تھا۔ آنکھیں پھیلی پھیلی اور ناک پھولی پھولی سی۔ اس بڑبھیا کی شخصیت بہت دل چسپ تھی۔ وہ بھی رو رہی تھی اور اس کا دکھ

میری ماں کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک بار اس نے مجھے بابا کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن خون و ہراس کے مارے میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اس سے پہلے میں نے عمر رسیدہ لوگوں کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔ نہ وہ الفاظ میری سمجھ میں آئے جنہیں میری نانی بار بار دہراتی جاتی تھی :

”بابا کو خدا حافظ کہ لے ! اب تو اسے کبھی نہ دیکھے گا.... وہ مر گیا۔ ہائے کیا نامُراد چلا !“

میں ابھی ابھی سخت بیمار ہی سے اُٹھا تھا۔ خوب یاد ہے کہ مجھے روگ لگنے کے بعد بابا مجھے کس طرح ہنسیا کھلایا کرتے تھے۔ لیکن وہ دفعتاً غایب ہو گئے اور ان کی جگہ میری نانی آگئی جس سے میں قطعاً نامانوس تھا۔

میں نے پوچھا: ”تم کہاں سے چل کر آئی ہو؟“  
 ”بھئی سے اور کہاں سے ! میں کوئی پانچو پیدل آئی ہوں۔ آگن بوٹ مجھے یہاں لایا ہے۔ ارے بھٹنے پانی پر بھی کوئی چلتا ہے۔“  
 یہ بات میرے لیے سراسر ان ہونی تھی۔ اوپر کی منزل میں ایک ڈڑھیل مگر بانکا ترچھا ایرانی رہتا تھا اور بجلی کو ٹھہری میں ایک زرد رو کھلک آباد تھا جو بھیڑ کی کھال بچا کرتا تھا۔ جس کا جی چاہے میٹھی سے اوپر چڑھ سکتا تھا اور گر گیا تو نیچے لڑھک سکتا تھا۔ یہ تو میرا ذاتی تجربہ تھا لیکن یہاں پانی کی گنجائش کہاں تھی؟ نانی کی کہانی تھی تو بے پردگی لیکن اس کے بے نیگے پن میں بھی بڑا نطف تھا۔  
 ”اچھا، تو میں بھٹنا کیوں ہوں؟“

”کیوں؟ اس لیے کہ تو اتنا چیتا چلتا ہی“ اس نے ہنس کر کہا۔  
اس کی آواز میں مہر و محبت تھی اور پہلے ہی دن ہم دونوں میں  
دوستی ہو گئی۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ جلدی سے مجھے اس  
کمرے سے نکال لے جائے۔

اتنا نے مجھے اپنے سے ہٹا لیا۔ اس کی ہچکیاں اور آنسو مجھے  
بے چین کرنے لگے۔ پہلی مرتبہ میں نے اُسے اس حال میں دیکھا تھا۔ ہمیشہ  
سے وہ کم سخن اور سخت گیر تھی۔ چکنی چٹری، ہٹتی کٹی۔ اس میں بلا کی  
سلکت تھی اور اس کے بازو آہنی سلاخوں کی طرح مضبوط تھے۔ لیکن اس  
وقت وہ کانپتی بسورتی ہوئی بالکل بے دم ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے  
بال، جن کا جوڑا بڑی صفائی سے گندھا ہوا ایک چوڑی سی خوبصورت  
ٹوپی کے نیچے چھپا رہتا تھا، اب بکھر کر اس کے شانے اور چہرے پر  
پھیل گئے تھے۔ کچھ گندھی ٹیٹیں بابا کے بے حس چہرے پر جھوننے لگیں۔  
گو میں دیر سے کمرے میں بہوت کھڑا تھا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر  
مجھے نہ دیکھا۔ بابا کی زلفوں کو سلجھانے اور خفاں و فریاد کے سوا  
اور کچھ کرنے سے وہ معذور سی ہو چکی تھی۔

اتنے میں کچھ سیاہ فام گورکن ایک سپاہی کے ساتھ اندر جھانکنے لگے  
سپاہی بگڑ کر چلنے لگا، ”چلو، نکلو یہاں سے! دیر نہ کرو!“

کھڑکی پر ایک سیاہ چادر ڈال دی گئی تھی اور وہ ہوا کے مارے  
بادبان کی طرح پھول گئی تھی۔ مجھے یہ بات یوں معلوم ہوئی کہ ایک روز  
بابا مجھے پال والی ڈونگی پر لے گئے تھے۔ اتنے میں بجلی زور سے کڑکنے لگی  
اور بابا نے مجھے گھٹنوں پر بٹھا کر ہنستے ہوئے کہا: ”ڈرنے کی کوئی بات

نہیں ہو۔

ایک بیک میری ماں فرش پر لوٹنے لگی اور اس کے بال خاک آلودہ ہو گئے۔ اس کا زرد چہرہ بالکل بے رنگ ہو گیا۔ بابا کی طرح دانت نکال کر اس نے ڈراؤنی آواز میں کہا: ”دروازہ بند کر دو! — الکی یہاں سے ہٹ جا!“

مجھے ایک طرف ہٹا کر نانی دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی جمپٹی: ”دوستو ڈرو نہیں۔ ہمیں دق نہ کرو۔ اللہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اسے ہیفہ نہیں۔ وہ درد زہ میں مبتلا ہی..... خدا کا واسطہ ہٹ جاؤ۔“

کونے میں ایک صندوق کے پیچھے میں ڈبک گیا۔ وہاں سے کیا دیکھا کہ ماں ہانپتی ہوئی زمین پر ترپ رہی ہو۔ نانی اس کے پاس بیٹھی ہوئی بڑے نرم انداز میں کہہ رہی تھی: ”بھتے خدا اور عیسیٰ کا واسطہ! درشکا ذرا ضبط سے کام لے۔ مریم! تو ہماری مدد کر!“

میں دم بخود تھا۔ وہ دونوں بابا کے پاس بیٹھی کراہ رہی تھیں اور اسے چھو چھو کر آہ و بکا کرنے لگی تھیں۔ لیکن وہ تھا کہ کچھ کہنے کے بدلے سرد مہری سے مسکرا رہا تھا۔ دیر تک وہ اسی طرح رنگتی گھسنتی رہیں۔ بار بار ماں کھڑی ہو ہو کر گر پڑی اور نانی ایک بڑے سے گیند کی طرح یہاں وہاں پھدکتی رہی۔ یکایک ایک بچہ کے رونے کی آواز آئی اور نانی بول اُٹھی: ”شکر اللہ! یہ تو لڑکا ہو!“ اور اس نے فوراً ایک موم بتی جلا دی۔

اس دوران میں مجھے نیند آگئی ہوگی کیوں کہ بعد کی تفصیل

مجھے یاد نہیں۔

دوسرا واقعہ جو میری یادداشت میں ہنوز محفوظ ہے، میں ہر سات سے بھیکے ہوئے ایک دن کسی قبرستان کے ایک سنان کونے میں ہوں۔ میں گیلی مٹی کے تودے کے پاس کھڑا ہوا اس خندق میں جھانک رہا ہوں جس میں بابا کا تابوت ڈال دیا گیا تھا۔ خندق کی تہ میں پانی ہوا، پانی میں مینڈک تیر رہے ہیں۔ ان میں سے دو اچھل کر تابوت کے پیلے ڈھکن پر بیٹھ گئے ہیں۔

قبر کے کنارے میرے اور نانی کے سوا ایک پادری اور دو گورکن کھڑے تھے۔ بادلوں کا پانی کاپنج کی اُجلی اُجلی پوتوں کی طرح برس رہا تھا اور ہم سب اس میں شرابور ہو گئے تھے۔ پادری نے چلتے چلتے کہا: ”قبر بھر دو“

نانی رونے لگی اور اس نے سر پر پڑے ہوئے شال کے کونے سے اپنا سر چھپا لیا۔ گورکن اڑدوں بیٹھ گئے اور جلدی جلدی مٹی کے ڈھیلے قبر پر ڈالنے لگے اور ان مینڈکوں کو جو تابوت پر چڑھ بیٹھے تھے، مار مار کر نیچے گرانے لگے۔

نانی نے میرا شانہ ہلا کر کہا: ”بیٹا، اب چلا آ“ لیکن میں وہاں سے جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

نانی مجھ پر اور اللہ میاں پر بڑبڑانے لگی۔ ”یارب اب کیا ہوگا“ کچھ دیر وہ مایوسی سے سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

قبر بھر جانے کے بعد بھی وہ کھڑی رہی، تا دم تک گورکنوں نے اپنے پھاؤڑے زور سے ٹمک نہ دیے اور ہوا کا ایک تیز جھکڑ

بادلوں کو اڑا نہ لے گیا۔ تب وہ مجھے لیے بہے ایک کلیسا کی طرف چلی جس کا رستہ سیاہ صلیبوں کے جھرمٹ سے ہو کر گزرتا تھا۔

جب ہم اس گورِ غریباں سے باہر نکل آئے تو نانی نے پوچھا: ”تو روتا کیوں نہیں؟“ تجھے رونا چاہیے۔“

میں نے جواب دیا: ”میں رونا نہیں چاہتا۔“

اس پر نانی نے نرمی سے کہا: ”تیری مرضی نہیں، تو نہ رو۔“

مجھے تعجب ہوا، کیونکہ میں بہت کم روتا تھا اور روتا بھی تھا تو غصے میں، دکھ درد میں نہیں۔ بابا مجھے روتا دیکھ کر ہنس پڑتے تھے اور اماں ڈانٹ کر کہتی تھی: ”خبردار جو رویا۔“

اب ہم گاڑی پر سوار ہو کر ایک چوڑی مگر گندی سڑک سے

گزرے جس کے دائیں بائیں سُرخ مکاؤں کا ہجوم تھا۔

رستے میں میں نے نانی سے پوچھا: ”وہ مینڈک کبھی باہر بھی نکلیں گے؟“

جواب ملا: ”کبھی نہیں!۔ اللہ انھیں بخنے۔“

میں سوچنے لگا کہ اماں اور نانی اس موقع پر اللہ میاں کا

ذکر اس کثرت اور اس محبت سے کیوں کر رہی ہیں۔

.....

کئی روز بعد وہ دونوں مجھے لے کر ایک اسٹیمپر سوار ہوئیں

جس میں ہمارے پاس ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔

میل چھوٹا بھائی میکسم مرگیا تھا اور اس کی لاش سُرخ و سفید

کپڑوں میں لپیٹی ہوئی ایک مینر پر رکھی تھی۔ گھٹریوں اور صندوقوں

کے انبار پر کھڑے ہو کر میں روشن دان سے باہر جھانکنے لگا اور نہ



جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ یہ گھوڑے کی آنکھ ہی۔ نیچے ٹیلا پانی اٹھلاتا بل کھاتا دھواں دھار بہ رہا تھا۔ ایک موج اس زور سے روشن دان سے ٹکرائی کہ میں بھیگ کر فرش پر گر پڑا۔  
 ”ڈرمت“ یہ کہہ کر نانی نے ہولے سے مجھے گود میں اٹھایا اور پھر اسی جگہ کھڑا کر دیا۔

نناک اور دُھندلی کہر کی چادر پانی پر پڑی ہوئی تھی۔ گاہ گاہے دُور تاریک زمین کا کوئی ٹکڑا پل بھر کے لیے نظر آتا۔ پھر جھاگ اور کہر میں چُھپ جاتا تھا۔ ارد گرد کی ہر چیز متحرک تھی، میری ماں کے سوا جو دیوار سے سر ٹکائے ہاتھ باندھے بے حس و خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ لوسے میں ڈھلا ہوا سا لگتا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور ساکت جسم کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ کوئی اجنبی ہے جسے میں نہیں پہچانتا۔ اس کے کپڑے تک مجھے غیر مانوس معلوم ہونے لگے۔

آہستگی سے نانی اس سے کہتی جاتی تھی: ”ورثکا، کچھ کھاؤ گی نہیں؟“ لیکن اماں بُت بنی کھڑی تھی، نہ کچھ بولتی تھی، نہ ہلتی تھی۔ نانی مجھ سے تو زیرِ لب باتیں کرتی تھی، لیکن اماں سے وہ زور سے بولتی تھی — سنبھل سنبھل کر جھجک جھجک کر۔ میں سمجھ گیا کہ نانی اس سے ڈرتی ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ اس سے ہم دونوں اور بھی قریب ہو گئے۔

اچانک ہم سب کو چونکا کر اماں نے ڈپٹ کر کہا: ”سارا تون! .. . وہ جہازی کہاں گیا؟“

میرے لیے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ سارا توف؟ جہازی؟۔  
 ایک سینہ دراز، سفید ریش شخص جو نیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔  
 ایک چھوٹا سا صندوق لیے ہوئے داخل ہوا۔ تانی نے صندوق لے لیا  
 اور اس میں میرے چھوٹے بھائی کی لاش رکھنے لگی۔ پھر وہ صندوق  
 باہر لے جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر کیمین کا دروازہ اتنا  
 تنگ تھا کہ موٹی تازی نانی جان بہ مشکل اس سے نکل سکتی تھیں۔  
 اس لیے وہ اس کے آگے ایسے حصے میں پڑ گئیں کہ دیکھ کر ہنسی  
 آتی تھی۔

”صدقے جاؤں امی آپ کے“ یہ کہہ کر میری ماں نے بے صبری  
 سے وہ چھوٹا سا تابوت اس سے چھین لیا۔ وہ دونوں چلی گئیں اور  
 میں اس نیل پوش آدمی کو سر تا پا گھورنے لگا۔  
 اس نے جھک کر پوچھا: ”کیوں یار تمہارا چھوٹا سا بھیا چل بسا؟“  
 ”تم ہو کون؟“  
 ”میں جہازی ہوں“  
 ”اور سارا توف“

”سارا توف ایک شہر ہی۔ کھڑکی سے سر نکال کر دیکھ، باہر نظر  
 آئے گا۔ جھانک کر دیکھا تو زمین تلے اوپر ہو رہی تھی۔ اس کہہ آؤ زمین  
 کے دُھندلے دُھندلے خدو خال ایسے لگتے تھے گویا کسی گرم گرم روٹی  
 کا ایک ٹکڑا نوچ بیایا ہو۔“

”نانی جان کہاں گئیں؟“  
 ”اپنے ننھے نواسے کو دفنانے کے لیے“

”کیا وہ زمین میں دفن کیا جائے گا؟“

”ہاں ہاں، زمین میں۔“

اب میں نے جہازی کو اُن مینڈکوں کا قصہ سنایا جو حینِ حیات بابا کے ساتھ دفن ہو گئے تھے۔

جہازی نے مجھے گود میں اٹھا کر پیار کیا اور کہا: ”ارے ننھے نادان تو کیا سمجھ۔ قابلِ رحم وہ مینڈک نہیں بلکہ تیری ماں ہی۔ سوچ تو سہی کہ غم سے وہ کیسی نڈھال ہو گئی ہو؟“

اتنے میں اوپر سے ایک سامعہ خراش آواز آئی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس قسم کی آواز اسٹیمر نکالا کرتا ہی اس لیے میں سہا بھی نہیں البتہ مجھے فرش پر ڈال کر وہ جہازی یہ کہتا ہوا جھپٹا کہ مجھے بھاگنا چاہیے۔ باہر نکلنے کو میں اتنا ڈلا ہوا تھا۔ ہمت باندھ کر باہر نکل آیا۔ تنگ و تاریک صحن سونا پڑا ہوا تھا اور تھوڑی دُوری پر پتیل کی سیڑھی جگمگا رہی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو اوپر مسافروں کا غول تھیلیاں اور بچے دبائے ساحل پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی یہاں سے کوچ کر دوں۔

لیکن جب میں زینۂ ساحل کے قریب کسانوں کی بھیڑ میں پہنچا تو وہ سب بیک آواز مجھ پر چیخنے لگے۔

”وہ یہ کس کا بچہ ہے؟ ارے تو کس کے ساتھ ہے؟“  
کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔

دیر تک وہ مجھے ادھر ادھر بجاتے رہے، حتیٰ کہ وہی جہازی لپکا اور یہ کہتے ہوئے مجھے پکڑ لیا: ”یہ تو کسین والا استراخان لڑکا ہے۔“

وہ مجھے کیچ کر کیمین میں لے گیا اور گٹھریوں کی ڈھیری پر پٹک کر گھونسا دکھاتے ہوئے جاتے ہوئے کہہ گیا: "ایسی کمندی کروں گا کہ یاد رکھے گا"

اوپر کا شور و غوغا رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ بوٹ کی تھر تھراہٹ بھی رفتہ رفتہ بند ہو گئی تھی اور نہ اب وہ لہروں کے ساتھ جھولا جھول رہا تھا کیمین کا بھرکا پانی کی دیواروں سے بند تھا۔ اندر اندھیرا تھا اور ہوا ایسی تھی کہ دم گھٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گٹھریاں بڑی ہو گئی ہیں اور میں ان کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ اس خیال سے ڈر سا لگنے لگا کہ میں ہمیشہ کے لیے اس اُجاڑے کوٹھری میں تو قید نہیں کر دیا گیا ہوں۔

ساری کوشش کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ جب پینٹل کا ہتھکڑ سے مس نہ ہوا تو میں نے دودھ کی بوتل اٹھا کر پوری طاقت سے اس پر دے ماری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بوتل ٹوٹ گئی اور سارا دودھ میرے پاؤں پر گر پڑا اور میرے جوتوں کے اندر گھس گیا۔ اس ناکامی سے بیزار ہو کر میں روتا ہوا گٹھریوں پر گر پڑا اور فوراً سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اسٹیمر چل رہا تھا اور کیمین کی کھڑکی سورج کی طرح دمک رہی تھی۔

نانی میرے پاس بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ناک بھوں چڑھائے کچھ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ اس کے بے حساب بال شانے سے گھٹنے اور گھٹنے سے فرش تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ نیلا کالا تھا۔ بالوں کو ایک ہاتھ سے بہ مشکل زمین سے اٹھائے ان کی

لٹوں کو وہ ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی سے سلجھا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اینٹے ہوئے تھے، کالی آنکھیں تاؤ کے مارنے جل رہی تھیں اور بالوں کے ہالے میں چھپا ہوا چہرہ کیسا ننھا مٹا لگتا تھا۔

اس وقت اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ مگر جب میں نے پوچھا کہ تمہارے بال اتنے لمبے کیوں ہیں تو اس نے حرب معمول اپنے شیریں انداز میں کہا، ”یہ میرے گناہوں کی سزا ہے!“ کنگھی چوٹی کے باوجود بگڑاؤں کو دیکھو!..... جب جوان تھی تو ان پر ناز کرتی تھی لیکن بڑھاپے میں انھیں کوسوں نہیں تو کیا کروں؟..... لیکن تو سوتا کیوں نہیں۔ ابھی پہ پھٹی ہی بڑا سویرا ہے“

”لیکن میں دوبارہ نہیں سونا چاہتا“

”اچھا تو نہ سو“ اس نے فوراً کہا اور کنگھی کرتے ہوئے اس بیچ کی طرف دیکھنے لگی جس پر اماں غافل سو رہی تھی۔

”بچھلی رات تو نے دودھ کی بوتل کیسے توڑی۔ میرے کان میں

بسح بسح کہ دے“

اس کی گفتگو کا یہی انداز تھا اور وہ ایسے میٹھے بول استعمال کرتی تھی جو خوش رنگ اور سدا بہار پھولوں کی طرح میری یادداشت میں لہلہانے لگتے تھے۔ جب وہ مسکراتی تھی تو اس کی کالی کالی رس بھری آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی تھیں اور ایک عجیب دل کشی سے منور ہو اُٹھتی تھیں۔ اس کے مضبوط سفید دانت خوشی سے کھل اُٹھتے تھے۔ اس کے جلے ہوئے رنگ اور لا تعداد سنکوں کو نظر انداز کر دو۔ تو اس کی چہرہ میں اب بھی جوانی کا نور بسا ہوا تھا۔ اس کی صورت

کو بگاڑنے میں اس کی ناک اور لال ہونٹوں کا خاص حصہ تھا۔ چاندی سے منڈھی ہوئی سیاہ ناس دانی کا ہڈاس سونگھتے سونگھتے اس کے ننھے چوڑے پڑ گئے تھے اور شراب کی بہتات نے ہونٹوں کو لال گلال کر دیا تھا۔ اس کا ظاہر بے رنگ تھا، لیکن باطن میں ایک تیز و تند اور کبھی نہ بجھنے والی چنگاری روشن تھی جس کا پرتو اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس کی کمر جھک چلی تھی لیکن اس کی چال میں بلی کی سی نزاکت تھی اور وہ بلی کی ہی طرح حلیم تھی۔

اس سے ملنے سے پہلے میں گویا سویا ہوا سا اور تاریکی کے بحان میں چھپا ہوا سا تھا۔ لیکن جب وہ آئی تو اس نے مجھے جگایا اور دن کے اُجالے میں لاکھڑا کیا۔ میرے تاثرات کو اس نے ایک بار میں پرویا اور انھیں رنگا رنگ کی لڑیوں میں گوندھا۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے میری غم خوار بن گئی۔ وہ میری رگ جان سے قریب ہی اور اس کی یاد مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کائنات کے لیے اس کی بے غرض محبت نے میری شخصیت کو مالا مال کیا اور مجھے وہ قوت بخشی جو ایک پُر خار زندگی کے لیے از بس ضروری ہے

.....

چالیس سال پہلے کشتیوں کی رفتار سُست ہوتی تھی۔ ہم عرصے سے یمنی کا سفر طو کر رہے تھے اور میں اُن دنوں کو کبھی نہ بھولوں گا جو حُسن کے بار سے دبے ہوئے تھے۔

موسم گرما کا جل چلاؤ تھا، خزاں کی آمد آمد تھی۔ صبح سے شام تک میں نانی کے ساتھ ٹھیک پر رہتا تھا۔ اوپر صاف و سادہ آسمان کا

شامیانہ تنا رہتا تھا اور ہم لوگ دریائے دولگا، کے آب کشیدہ کناروں کے درمیان کشاں کشاں گزر رہے تھے۔ ایک بھرا لنبی سی رستی سے ہمارے سرخ اسٹیم سے بندھا ہوا تھا اور نیلے پانی پر چھکے کھاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہم سفر تھا۔ بھرا بھرا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے دیک کا خیال آتا تھا۔

آنکھ اوجھل سورج، دولگا پر تیرتا پھرتا تھا۔ ہر ساعت ہمارے آگے ایک نیا نظارہ پیش کرتی تھی۔ زمین پر ابھری ہوئی سبز پہاڑیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ایک بڑے سے لہنگے پر چُنت پڑی ہوئی ہی۔ کنارے شہر اور گاؤں سے بے ہوئے تھے۔ سنہری پتیاں پانی پر تیر رہی تھیں۔

”دیکھو، دنیا کیسی سہانی ہے!“ نانی ہر آن یہ کہتی ہوئی بوٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے کا چکر لگاتی جاتی تھی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اکثر ساحل کو تکتے تکتے وہ مجھے بھول جاتی تھی۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ ڈیک پر خاموش کھڑی ہو جاتی اور مسکراہٹ کے باوجود اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ میں اس کے سیاہ سائے کو کھینچ لیا کرتا تھا اور وہ چونک کر کہ اٹھتی تھی: ”افو! مجھے غینہ آگئی ہوگی اور میں سُبنا دیکھ رہی ہوں گی“

”لیکن تم رو کیوں رہی تھیں؟“

ہنستے ہوئے وہ جواب دیتی تھی: ”خوشی اور ضعیفی کے مارے! تم جانتے ہو کہ میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ اب میں ساٹھ سال کی ہو چکی“

پھر ناس سونگھتے ہوئے وہ مجھے رحم دل ڈاکوؤں، پہنچے ہوئے  
ورڈیشوں، بھانت بھانت کے جانوروں اور بھوت پریتوں کے عجیب  
وغریب قصے سنانے لگتی تھی۔

قصے سنانے وقت اس کی آواز پُر اسرار ہو جاتی تھی۔ سر سے سر  
بھڑا کر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی  
تھی اور واقعاً مجھے اُس طانت کا احساس دلانے لگتی جو اندہ ہی اندہ  
مجھ میں پیدا ہو رہی تھی۔ میں اُس خوشی کو بیان نہیں کر سکتا جو اُس کے  
قصے سن کر ہوتی تھی۔

ایک کے بعد میں دوسری کہانی کی فرمائش کرتا تھا اور وہ کہتی  
جاتی تھی: ”تندور میں ایک بڈھا بھوت رہتا تھا۔ ایک بار اس کے  
پہنچے میں کانٹا چبھ گیا اور وہ روتا ہوا یہاں وہاں بھاگنے لگا۔“  
چوہے رے چوہے، بڑا درد ہو رہا ہے، میں اسے برداشت نہیں  
کر سکتا۔“

اپنا پیر ہاتھ میں لے کر وہ اُچھلنے لگتی تھی اور یوں منہ بناتی  
تھی جیسے کانٹا اسی کے لگا ہے۔

نیک دل ڈرٹھیل جہانمی یہ قصے سنتے اور ہنستے ہوئے اُن کی  
تعریف کرتے اور باصرانہ کہتے: ”بڑی بی ایک اور، ایک اور۔“  
آخر میں وہ کہتے: ”بڑی بی، آؤ، کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔“  
کھانے کے ساتھ وہ اُسے خوب دودھ کا (روسی شراب) پلاتے اور  
میری خاطر تربوزوں سے کرتے تھے۔ تربوز کی دعوت پردہ راز میں  
ہوتی تھی کیونکہ بوٹ پر ایک سارنگ گھوم پھر کر بھل کھانے کی نہت



کرتا تھا اور نگاہ پڑتے ہی پھلوں کو ندی میں پھینک دیتا تھا۔ وہ خلاصیوں کی وردی پہنے رہتا تھا اور ہمیشہ نشے میں چور رہتا تھا سب لوگ اُس سے کتراتے تھے۔

کبھی کبھی میری ماں ڈیک پر آتی تھی اور ہم سے الگ ہٹ کر ایک کونے میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتی تھی۔ اس کا سڈول جسم، فکر مند چہرہ، چمکتے ہوئے گھنے بالوں کا جوڑا — غرض کہ بند بند سے چُستی اور توانائی ٹپکتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی جھلجھلے بادل یا جھینے بینے پردہ کھر میں لپٹی ہوئی ہے، جس میں سے وہ بڑی بڑی بھوری آنکھوں سے بے ہر انداز میں تاکا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ اس نے ڈانٹ کر کہا: ”اماں، لوگ تم پر ہنس رہے ہیں مگر نانی نے لا پرواہی سے جواب دیا: ”خدا ان کا بھلا کرے! ہنستے ہیں تو ہنسنے دو!۔ ان کے منہ میں گھی شکر!“

مجھے نانی کی وہ طفلانہ مسرت ہنوز یاد ہے جو غبی کو دیکھ کر اسے ہوئی تھی۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے اپنے آغوش میں کھینچ لیا اور چیخ کر کہا: ”دیکھ وہ کس قدر خوب صورت ہے! یہی نانی ہے۔ جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور گر جا گھر کو دیکھ! یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے پر نکل آئے ہیں؟“ پھر میری ماں کی طرف مڑ کر روپھی آواز میں بولی: ”ورخکا، کیا تو نہیں دیکھنا چاہتی؟۔ یہاں آ۔ تو تو سب کچھ بھول گئی۔ اری، تجھے تو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی!“

میری ماں ماتھے پر بل ڈال کر، نہایت تلخ انداز میں مسکراتے لگی

جب اسٹیمر اس خوب صورت شہر کے باہر ان کشتیوں کی بھیڑ میں پہنچا جو دونوں ندیوں کے دھارے کو روکے ہوئے اپنے سبک مستولوں کو ہوا میں بچا رہی تھیں، تو ایک بڑی سی ڈونگی کئی آدمیوں کو لیے ہوئے اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ یکے بعد دیگرے اس کے سب مسافر ہمارے بوٹ پر اتر آئے۔ ایک پستہ قد سیاہ پوش بوڑھا، جس کی ناک طوطے کی سی، آنکھیں ہری ہری اور ڈاڑھی کچھ گلابی کچھ سنہری تھی، دوسروں کو دھکیلے ہوئے ہماری طرف بڑھا۔ ”اباجان“ مڑدھی ہوئی آواز میں یہ کہتی ہوئی میری ماں اس کے گلے سے چٹ گئی۔ لیکن اس کے چہرے کو اپنے لال لال ہاتھوں میں لے کر نانا نے جلدی سے اس کے گالوں کو پھٹکا اور کہا:

”بیوقوف کہیں کی، تجھے ہو کیا گیا ہے؟“

نانی نے پھر کی کی طرح گھوم گھوم کر چٹا چٹ ان سب کو چوما اور گلے لگایا۔ پھر مجھے ان کی طرف بڑھا کر جلدی جلدی کہا: ”دیر نہ کوڑ“ یہ ہیں ماموں مائیکل، یہ ہیں ماموں جاکوف، یہ ہیں ممانی نتالیا، یہ دونوں تمہارے ماموں نداد بھائی ہیں، دونوں کا نام ساشا ہے اور یہ ان کی بہن کترینا ہے۔ یہ ہمارا خاندان ہے۔ کیا یہ کافی بڑا نہیں ہے؟“ نانا نے پوچھا: ”کیوں جی، تم اچھی ہو؟“ پھر دونوں نے تین مرتبہ ایک دوسرے کو چوما۔

اب نانا نے اس بھیڑ میں سے مجھے نکالا اور سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے پوچھا: ”کیوں بھی تم کون ہو؟“

”میں کبین والا استراخانی لڑکا ہوں“

نانا نے میری ماں کی طرف دیکھ کر کہا: ”یہ کیا بکتا ہے؟“ پھر مجھے ہلاتے ہوئے بولے، ”تو ہماری ہی ہٹنی کا پتا ہے۔ چل، ڈونگی پر بیٹھ۔“ ساحل پر اتر کر ہمارا جلوس گلیوں سے بٹی ہوئی ایک سڑک سے ہو کر پہاڑی پر چڑھنے لگا جس کے دونوں نشیب گھاٹوں سے ڈھلکے ہوئے تھے۔

اماں اور نانا آگے آگے جا رہے تھے۔ نانا اماں سے ایک بالشت چھوٹے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ رنگ رہے ہیں اور اماں انھیں ایک بلندی سے دیکھتی ہوئی ہوا میں اڑتی جلی جا رہی ہیں۔ ان کے بعد چکنے چپڑے بالوں والے ماموں مائیکل نانا کی سی جھڑیاں منہ پر ڈالے گھنگھڑاے اور چمکیلے بالوں والے جاکوف کے ساتھ تھے۔ پھر کچھ موٹی عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہنے چھو عدد بچوں کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ یہ چھو کے چھو عمر میں مجھ سے بڑے تھے مگر سب کے سب منہ میں گھنگھنیاں بھرے ہوئے تھے۔ میں اپنی نانی اور ممانی نتالیا کے ساتھ تھا۔ ممانی کا رنگ پیلا، آنکھیں نیلی اور بدن بھاری تھا۔ رُک رُک کر وہ ہانپنے لگتیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہتی جاتیں: ”اٹا ہا! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا!“ نانی بگڑ کر کہتیں: ”وہ ناحق تھیں ساتھ لائے۔ سب اُلو ہیں۔“ مجھے نہ تو بڑھے پسند آئے اور نہ بچے۔ ان میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں، نانی بھی مجھے کچھ بیگانہ سی لگنے لگیں۔

سب سے زیادہ نفرت مجھے نانا سے ہوئی۔ پہلی ہی نظریں

بھانپ گیا کہ وہ میرا دشمن ہو اور میں اس کی طرف سے ممتاز  
بھی ہو گیا اور متعجب بھی۔

اب ہم اپنی منزل کو پہنچ گئے تھے۔

پہاڑی کی چوٹی پر داہنے بازو، سڑک کی پہلی عمارت کھڑی  
تھی۔ اس ایک منزلہ مکان کی گلابی قلعی اب دھندلی پڑ گئی تھی۔  
کھڑکیاں باہر نکلی پڑتی تھیں اور چھت نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ باہر  
سے دیکھنے میں وہ مکان خاصا بڑا لگتا تھا، لیکن چھوٹی چھوٹی اندھیرا  
کوٹھڑیوں کے مارے وہ گتھ سا گیا تھا۔ جدھر دیکھو، بگڑے دلوں  
کا ہجوم باہم دست و گریباں تھا اور ایک مکروہ بدبو ساری فضا  
کو مکدر کر رہی تھی۔

میں آنکھ میں نکل آیا، لیکن وہ بھی زرا دیران پڑا تھا۔ ہر  
طرف گیلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے اور یک رنگ گندے پانی کی  
ناندوں میں کپڑے بھیگنے کے لیے جھوڑ دیے گئے تھے۔ ایک ٹوٹے  
ہوئے چھپرے کے نیچے تندور میں تیز آگ جل رہی تھی جس میں کوئی  
چیز پک رہی تھی اور کوئی آواز یہ الفاظ منتر کی طرح جب رہی  
تھی: ”گندھک! تیزاب! توتیا!“

## باب ۲

اب حیرت ناک سرعت سے ایک ہنگامہ خیز اور رنگا رنگ زندگی کا دھارا رواں ہوتا ہے۔ مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بارہا جی چاہتا ہوں کہ میں اس کی تردید یا تاویل کروں۔ ایک بے بُلائے رشتہ دار کی زندگی وہ سوہاں روح ہے جس کا خیال تک تکلیف دہ ہے لیکن حقیقت رحم سے زیادہ قوی ہے۔ اور پھر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اُس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام رؤسی رہتا تھا — اور اس کا بھی رہتا ہے۔ میرے نانا کے گھر میں باہمی رقابت اور کدورت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بڑے سیانے ہی نہیں بلکہ بچے بھی اس مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ اتفاق سے نانی کی زبانی یہ بھنک میرے کان تک پہنچی کہ میری ماں جس دن آئی اُسی روز اُس کے بھائیوں نے نانا سے جالدا کے بٹوارے کا مطالبہ کیا۔ اماں کی اچانک آمد سے انہیں ایک نیا بہانہ ہاتھ آیا کیوں کہ وہ ڈرے کہیں اماں اپنا جہیز نہ مانگے جو نانا نے اس لیے نہیں دیا تھا کہ اس نے ان کی مرضی کے خلاف خفیہ شادی کر لی تھی۔ میرے ماموں مُصر تھے کہ یہ

جھیز اُن سب میں بانٹ دیا جائے۔ علاوہ بریں وہ آپس میں اس بات پر عرصے سے لڑ رہے تھے کہ شہر یا فلاں گائوں میں اُن میں سے کون نیا کارخانہ قائم کرے۔

ہمیں آئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ کھانے کے وقت یکایک جنگ چھڑ گئی۔ میرے ماموں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرے جھک کر نانا پر بکنے جھکنے لگے اور کتوں کی طرح غرائے لگے۔ نانا کا چہرہ سُرخ پڑ گیا اور اس نے چچہ زور سے ہٹک کر ایسی گھڑکی دی گویا مرغا بانگ دے رہا ہو: ”میں تم سب کو نکال باہر کروں گا“ نانی کا چہرہ گویا شدتِ کرب سے مسوس گیا تھا۔ اس نے کہا: ”وہ جو مانگتے ہیں دے دو! پھر تو چین کا ایک پل نصیب ہوگا“ نانا نے آنکھیں نکال کر کہا: ”چپ رہ بڑھیا ڈھڈو!“

تعجب ہوتا تھا کہ باسٹ بھر کا آدمی اس زور سے کیسے چیخ لیتا ہو۔ اماں میرے اُٹھ کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس گئیں اور سب کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئیں۔

اتنے میں مائیکل ماموں نے اپنے بھائی کے ایک پٹر رسید کر دیا۔ یہ حضرت غصے سے بوکھلا کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں فرش پر پٹنیاں کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو گالی دینے لگے بچے رونے لگے اور مافی نتالیا، جو محل سے تھیں، سبکیاں بھرنے لگیں۔ میری ماں انھیں پکڑ کر کہیں باہر لے گئیں۔ کم عمر نوکرانی یوحینا نے بچوں کو باورچی خانے سے نکال دیا۔ گریساں تیرتیر ہوئیں اور ان کے نیچے نوجوان کاریگر سگنوک ماموں مائیکل کی پیٹھ پر

سوار نظر آیا۔ اور کارخانے کا منتظم گرمی گوری اپنی رنگین عینک گنجی کھوپری اور لمبی داڑھی ہلاتا ہوا بڑے اطمینان سے ماموں کے ہاتھ باندھنے لگا۔

ادھر ادھر سے مارتے ہوئے اور اپنی چھدری کالی داڑھی سے فرش بھاڑتے ہوئے ماموں مائیکل بُری طرح گالیاں بک رہے تھے۔ اور نانا مینر کے ارد گرد اچھلتے ہوئے بے بسی سے کہتے جاتے تھے: ”یہ بھائی ہیں — یہ سگے بھائی ہیں! . . . . . ارے لعنت ہو تم پر!“

جنگ جھڑتے ہی میں ڈر کے مارے تندور کے اوپر دبک کر جا چھپا تھا۔ دہاں سے حیرت و ہراس کے عالم میں میں نے دیکھا کہ نانی جاکوف کا کٹا ہوا منہ پانی سے دھو رہی ہے اور وہ مچل مچل کر رو رہا ہے۔ نانی دروناک لہجے میں کہتی جاتی تھی: ”یہ بھیڑیے ہیں! یہ جنگلی جانور ہیں! . . . . . معلوم نہیں، خدا انھیں کب سمجھ دے گا!“

نانا اپنے پھٹے ہوئے کُرتے کو سنبھالتے ہوئے اُس پر برس پڑے: ”ارے بڑھیا، کیا تجھے کُتے کے پتے ہی جسنے تھے؟“ جب جاکوف چلا گیا تو نانی ایک کونے میں جا کر غم سے ڈوبی ہوئی آواز میں دعا مانگنے لگی: ”مریم، اے خدا کی ماں، میرے بچوں کو عقل دے!“

نانا اس کے پاس کھڑے ہوئے مینر کو دیکھ رہے تھے جس پر ہر چیز اُلٹ گئی تھی۔ پھر آہستہ سے بولے: ”کیوں جی، یہ اچھے ہیں





اس نے مجھے ہلکی سی چپٹ لگا کر یہ کہتے ہوئے ڈھکیل دیا :  
 ”میرا نا اپنے باپ کا بیٹا ! نکل یہاں سے !“  
 باورچی خانے سے نکل کر میری جان میں جان آئی۔

.....

میں خوب جانتا تھا کہ نانا کی تیز آنکھیں ہر جگہ میری ٹوہ میں  
 رہتی ہیں اور میں ان سے ڈرنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میں کس طرح  
 اس کی آتشیں نگاہوں سے پناہ ڈھونڈا کرتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا  
 کہ بڑھے کی طبیعت میں بدی بھری ہوئی ہے۔ وہ ہر آدمی پر بدشست  
 لہجے میں طعنہ زنی کیا کرتا تھا اور خود چڑچڑا ہونے کے سبب سے  
 ساری دنیا کو اُکسانے کی جستجو میں رہتا تھا۔  
 ”ہشت ! دھت !“ یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔

”ہشت“ کی لمبی سسکاری اب بھی میرے جسم میں لرزہ پیدا  
 کر دیتی ہے۔ شام کی جانے کے وقت جب نانا، ماموں اور تمام کارگر  
 تھکے ہارے باورچی خانے میں داخل ہوتے تھے، تو ان کے تارکول  
 میں لٹھڑے ہوئے اور تیزاب سے جلے ہوئے ہاتھوں، نیز رومال میں  
 لپٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر خدا کے اُس سیاہ مجسمہ کا خیال آتا تھا  
 جو کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اس خوفناک ساعت میں نانا میرے  
 پاس بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے اور میں دوسرے بچوں کی رشک  
 آگیں نگاہوں کو تار جاتا تھا جو اس قربت کی وجہ سے مجھے کھائے  
 جاتی تھیں۔ نانا کی ہر بات جھنجی تکی ہوتی تھی۔ وہ جو ریشم کی کناری  
 والی صدی پہنے رہتے تھے وہ پڑانی ہو گئی تھی۔ رنگین روئی کا کرتا

دُھلتے دُھلتے خستہ ہو گیا تھا۔ تیلون کے گھٹنے چنبیوں سے نکل آئے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کی سچ دھج میں اپنے بیٹوں سے زیادہ بانچپن تھا اور نکھار تھا، جو نقلی ریشم کی قمیصیں اور جھل جھلی ٹائیاں باندھے رہتے تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ہی نانا نے مجھے دُعا میں رٹنے کا حکم دیا۔ دوسرے سب بچے عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور گر جا کے محرّر سے لکھنا پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ شرمیلی مُمّانی نتالیا دھیمی آواز میں مجھے پڑھایا کرتی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر بچپن کی سی معصوبت تھی اور اس کی آنکھیں اتنی شفاف تھیں کہ ان میں اس کے دل کا حال جھلکتا تھا مجھے اس کی آنکھوں کو مکشکی باندھ کر دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ جب وہ اپنا سر موڑتی تھی تو آنکھیں تاروں کی طرح جھللاتی تھیں۔ وہ بڑی نرمی سے کہتی تھی: ”بہت ہیڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب کہو آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس باقی رہے“ اور اگر میں پوچھتا تھا کہ نام کی تقدیس کیا چیز ہے؟ تو وہ سہم کر آزد بازو دکھتی اور مجھے ڈانٹتی کہ ”مُحبت نہیں کیا کرتے، یہ گناہ ہے۔ کہتے جاؤ،“ آسمانی باپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

اس بات سے مجھے حیرت ہوتی تھی۔ سوال پوچھنا گناہ کیوں ہے؟ نام کی تقدیس — یہ الفاظ میرے ذہن میں کسی پُر اسرار منتر کی طرح جم گئے اور میں موقع بے موقع ان کا غلط سلط استعمال کرنے لگا۔

لیکن میری مُمّانی اپنی تھکان کے باوجود صبر نہ ہاری اور گلا

صاف کر کے جو ہمیشہ سوکھا رہتا تھا، کہنے لگی: ”یہ ٹھیک نہیں ہے، صرن ہی کہو، تیرے نام کی تقدیس باقی رہے۔ آخر اس میں دقت کیا ہے؟“ لیکن میرے لیے یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ میں کبیدہ خاطر ہو گیا اور دعا کو کسی طرح یاد نہ رکھ سکا۔

ایک روز نانا نے پوچھا: ”اولیثا“ آج تو کیا کرتا رہا ہے؟ کھیل؟ تیرے ماتھے کی چوٹ تو یہی ظاہر کرتی ہے۔ چوٹ لگانا مشکل نہیں ہے اور آسمانی باپ کا کیا ہوا؟ تو نے اسے یاد کیا ہے؟“

نمائی نے آہستہ سے کہا: ”اس کی یادداشت بہت خراب ہے۔“ یہ سن کر نانا کی باجھیں کھل گئیں اور ناک بھوں چڑھا کر بولے: ”اس سے کیا۔ اس کا واحد علاج بید ہے۔“

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا: ”کبھی تیرے باپ نے تجھے ٹھونکا تھا؟“ میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے، اس لیے میں خاموش رہا۔ لیکن میری ماں نے جواب دیا: ”نہیں میکسم نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور نہ مجھے اس کی اجازت دی۔“

”آخر اس کی وجہ؟“

”وہ کہتے تھے کہ مار پیٹ سے علم نہیں آتا۔“

”میکسم — وہ ہر معاملے میں احمق تھا۔ . . . . خدا مجھے معاف

کرے کہ مرحوم کے لیے ایسی بات زبان سے نکل گئی۔“ نانا نے جھلّا کر یہ عذر خواہی کی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس کی باتوں سے غصے میں آ گیا ہوں۔ ”منہ کیوں بنا رہا ہے؟ . . . . . ہیں! . . . . . ہشت! دھت!“ پھر اپنے پکے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولاً: ”اس سینچر کو میں ساشا کی مرمت کرنے والا ہوں“  
 میں نے پوچھا: ”مرمت کیسی ہوتی ہو؟“  
 سب لوگ ہنس پڑے اور نانا نے کہا: ”ذرا ٹھہرو، پھر پتا  
 چلے گا۔“

”تنہائی میں میں لفظ ”مرمت“ کے مطالب پر غور کرنے لگا۔ یہ  
 تو ظاہر تھا کہ بید اور ٹھکائی سے اس کا خاص تعلق تھا۔ میں نے لوگوں  
 کو گھوروں، کتوں اور بلیوں کو پیٹتے دیکھا تھا اور استراخان میں  
 سپاہی ایرانیوں کو مارا کرتے تھے۔ لیکن اب تک میں نے چھوٹے بچوں  
 کو پیٹتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس گھر میں میرے ماموں اپنے بچوں کو  
 مارنے سے نہ چوکتے تھے۔ وہ بھی بے چون و چرا اسے برداشت کر لیتے  
 تھے اور اپنی چوٹوں کو سہلا کر رہ جاتے تھے۔ اگر میں پوچھتا کہ چوٹ تو  
 نہیں لگی تو وہ بڑی دیدہ دلیری سے جواب دیتے تھے: ”نام کو  
 بھی نہیں۔“

انہیں دنوں انگشتانے کے سلسلے میں ایک بڑے لطف واقعہ ہوا۔  
 شام کی چائے اور رات کے کھانے کے درمیان، میرے ماموں اور کارخدا  
 مل کر رنگی ہوئی تھگلیوں کی بخیہ گرمی کرتے اور اُن پر ٹکٹ چسپاں کیا  
 کرتے تھے۔ ایک روز مائیکل ماموں نے کوتاہ ہیں گریگوری پر فاختہ  
 اُڑانے کا تہیہ کیا اور اپنے نوسالہ بھتیجے کو ہدایت کی کہ گریگوری کے  
 انگشتانے کو آگ میں تباہ کرے۔ ساشا نے گریگورم کر کے اُسے چپ  
 چاپ گریگوری کے پاس رکھ دیا اور خود تندور میں چپ کیا۔ سوئے  
 اتفاق کہ اُسی آن نانا جان کا گزر اُدھر ہوا اور کام کرنے کی نیت سے

انہوں نے جھٹ سے وہ انگشتانہ اپنی انگلی میں چڑھالیا۔  
شور سن کر میں بھی باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ نانا کی اس مضحکہ  
خیز ہیئت کو میں کبھی نہ بھولوں گا جب جلی ہوئی انگلی ہلاتے ہوئے  
وہ یہاں وہاں کود رہے تھے اور چلاتے جاتے تھے: ”وہ سُوَر کہاں  
ہو جس نے یہ شرارت کی“

مائیکل ماموں جھک کر انگشتانے پر پھونک مارنے لگے۔ گریگوری  
لاپرداہی سے اپنے کام میں مصروف تھا اور اس کی چوڑی چکلی گنبنی  
کھوپڑی پر چیزوں کی پرچھائیں ہل رہی تھیں۔ اتنے میں جاکوف ماموں  
دوڑے آئے اور کونے میں چھپ کر ہنسنے لگے۔ نانی آلو کے پھلکے اُتاری  
ہوئی بیٹھی رہی۔

اچانک مائیکل ماموں بول اُٹھے: ”یہ جاکوف کی کرتوت ہیں۔“  
”جھوٹے کہیں کے!“ یہ کہہ کر جاکوف اپنی جائے پناہ سے نکل آیا۔  
لیکن اس کا بیٹا روتے ہوئے بولا: ”ابا جان! انہیں نے تو  
مجھ سے کہا تھا۔“

دونوں ماموں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن نانا کا غصہ  
کافور ہو گیا اور وہ انگلی پر آلو کی پلٹس رکھ کر مجھے لیے ہوئے باہر نکل  
آئے۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہ شرارت مائیکل کی ہے۔ میں نے  
سادہ لوحی سے رائے دی کہ ان کی مرتبہ ہونی چاہیے۔

نانا نے چور آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا: ”ضرور، ضرور۔“  
لیکن مائیکل ماموں مینر بہ مٹکا مار کر میری ماں پر گرج پڑے:  
”ورثکار! اپنے پٹے کا منہ بند کر، ورنہ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔“

میری ماں نے کہا: ”ہی ہمت؟ ذرا اسے چھو کر تو دیکھنا“ پھر کسی کو منہ کھولنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

میری ماں میں یہ بڑا کمال تھا کہ وہ لوگوں کو گھاس پھوس کی طرح اپنی راہ سے ہٹا دیتی تھی اور اس کے دو چار ٹھٹھے انھیں ہوش میں لانے کو کافی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ سب اُس سے خوف کھاتے ہیں یہاں تک کہ نانا بھی اس سے گفتگو کرتے وقت اپنا لہجہ بدل دیتے تھے یہ دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی اور میں اپنے بھائیوں سے فخر یہ کہا کرتا تھا: ”اکیلی میری ماں ان سب پر بھاری ہے“ اور وہ بھی اس امر سے انکار نہ کر سکتے تھے۔

لیکن سینچر کے واقعات نے اماں کا رُتبہ میرے دل سے کم کر دیا۔

.....

اس دن گویا مجھ پر بھی سینچر سوار ہوا۔ میں بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ کار خندار کس آسانی سے مختلف چیزوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ کسی پیلی چیز کو اٹھا کر وہ کالے رنگ میں ڈبو تے اور وہ نیلی ہو کر نکلتی۔ کسی بھوری چیز کو سُرخ پانی میں ڈالتے تو وہ ارغوانی ہو جاتی۔ بات تھی تو آسان لیکن میرے لیے یہ جادو کا کھیل تھا۔ میراجی بہت چاہتا تھا کہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں سے رنگوں اور میں نے یہ خواہش ساشا سے ظاہر کی۔ وہ بڑا سمجھ دار تھا اور سب سیانے اُسے پسند کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ نیک دل ہونے کے علاوہ دوسروں کی خدمت کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس کی کار پر دازمی اور حکم برداری کو اور سب تو سراہتے تھے لیکن نانا جان کی آنکھوں میں وہ کھٹکتا تھا

اور وہ کہا کرتے تھے: بڑا کامیاں ہر یہ لوند! ”

ساشا سانولا اور دُبلّا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سدا چوکس رہتی تھیں اور وہ اتنی تیزی سے بولتا تھا گویا الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے ہیں بولتے وقت وہ سہمی ہوئی چتوڑوں سے دائیں بائیں دیکھتا جاتا تھا گویا پتا کھڑکتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی پتیلیاں بے حرکت رہتی تھیں، لیکن جب وہ وحشت زدہ ہوتا تو یہ آنکھ کی سفیدی میں غایب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یہ ساشا پسند نہ تھا۔

ساشا نمبر دو مجھے زیادہ پسند تھا۔ اس بیچارے کو سب لوگ حقارت سے پوستی اور آلکسی کہا کرتے تھے۔ وہ کم سخن تھا اور اپنی درد مند آنکھوں اور دل کش تبسم کی وجہ سے اپنی ماں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اس کے دانت بد نما تھے اور اوپر کی ڈاڑھ میں ان کی دو قطاریں جلوہ نما تھیں۔ اس عیب کا خیال اُسے چوبیس گھڑی رہتا تھا اور پچھلی صف کو گرانے کے لیے وہ اپنی اُگلگی سدا منہ کے اندر رکھتا تھا۔ جب کبھی کوئی اسے دانت گننا نے کو کہتا تو وہ بڑی خوشی سے منہ کھول دیا کرتا تھا۔ یوں وہ اس بھرے پُرے گھر میں بھی تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ دن کو وہ اندھیرے کونوں میں چھپا رہتا اور شام کو کھڑکی کی سل پر بیٹھ جایا کرتا۔ شیشے پر اپنا گال رکھ کر وہ گھنٹوں اُن کوڑوں کو تاکا کرتا جو کبھی زمین پر اور کبھی درختوں پر اُچکنے رہتے تھے اور شفق کی سرخی میں کلیسا کے گنبد پر منڈلانے کے بعد غول باندھے سیاہ بادلوں کی اوٹ خدا جانے کہاں غایب

ہو جاتے تھے۔ وہ کبھی اس نظارے کا ذکر کسی سے نہ کرتا تھا۔ لیکن دیر تک اس کی خوش نمائی اسے مگن رکھتی تھی۔

اس کے برعکس جاکوٹ ماموں کا بیٹا ساشا نمبر نمبر ہر معاملے پر سیانوں کی طرح تفریح کیا کرتا تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ مجھے رنگ سازی کا شوق اُٹھا ہے تو اس نے مجھے رائے دی کہ الماری سے مینر کی عمدہ سی چادر نکالو اور اسے نیلے رنگ میں رنگو۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ رنگ سفید کپڑے پر ہی اچھا چڑھتا ہے۔

میں نے ایک بھاری سی مینر کی چادر نکالی اور آئینے میں پہنچ کر اس کا کونا نیلی ناند میں ڈالا ہی تھا کہ کہیں سے سگنوک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اپنے آہنی ہاتھوں سے چادر پھین کر اس نے ساشا کو پکارا جو دور سے میری کارروائی کا معائنہ کر رہا تھا۔ ”اپنی نانی کو دوڑ کر بلا لا۔“

اپنے کالے کالے سر کی جنبش سے کسی مصیبت کی اطلاع دیتے ہوئے وہ بولا: ”بچو، اب بچ کر کہاں جاؤ گے؟“

نانی روتی چلتی ہوئی دوڑی: ”ارے بد نصیب، اب خدایٰ تجھے مار سے بچائے۔“

مگر پھر اس نے سگنوک سے کہا: ”بھیا تو نانا سے کچھ نہ کہو، خدا کوئی ایسی تدبیر کرے گا کہ ان کی نظر چادر پر نہ پڑے گی۔“

سگنوک نے اپنے رنگ بہ رنگ پیش بند میں ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا: ”میں؟ مجھے کیا پڑی ہے۔ ہو سکے تو ساشا کا منہ بند کرو۔ اس کی زبان لنبی ہے۔“



سینچر کو میری طلبی باورچی خانے میں ہوئی، جہاں کامل خاموشی اور تاریکی کا قسطل تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ سب دروازے بند تھے اور برسات کی شام کا کھرہ رطرت پھیلا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں ٹپا ٹپ کر رہی تھیں۔ تندور کے آگے چوٹے سے تخت پر سگنوک خلاف عادت منہ بنائے بیٹھا تھا۔ نانا پانی کے بالٹی سے کئی لہنی لہنی سیدیں نکال کر انہیں ناپ رہے تھے اور کبھی کبھی انہیں ہوا میں گھماتے تھے تو شائیں شائیں کی صدا سے کرا گونج اٹھتا تھا۔ نانی الگ کھڑی ہوئی ناس شرک کر بڑبڑا رہی تھی :

”ظالم آج تو تیری مراد برآئی“

سانا جاکوف بیچ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی آنکھوں کو مل کر کسی بوڑھے فقیر کی طرح گرد گردا رہا تھا، ”خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دیجیے“

کرسی کے آزد بازو ماموں مائیکل کے دونوں بچے بُت بنے کھڑے تھے۔

ایک بھگی ہوئی بید کو شبپاتے ہوئے نانا نے کہا: ”جب میں تمہیں ٹھونک چکوں گا تو معاف کر دوں گا۔۔۔۔۔ اچھا، اب اپنا پانچامہ اُتارو“

بڈھا بہت اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز، نانی کی بے چین ہجر مچر اور سانشا کی کرسی کی چرچاہٹ — کوئی بھی چیز اس موت کے سکوت کو نہ توڑ سکی جو اندھیری بھت کے نیچے اُس تنگ سی کوٹھری پر چھایا ہوا تھا۔

ساشا نے اپنا ہاتھ گھٹنوں تک اُتار دیا اور اسے ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا پنج پر بیٹھ گیا۔ اس کی یہ حالت جبرتناک تھی اور میں بھی اپنے پیروں کی تھرتھری محسوس کر رہا تھا۔

وہ بیٹھ پر اونڈھا لیٹ گیا اور سگنوک نے ایک چوڑی سی تیلیے سے اس کی گردن اور ہاتھ باندھ دیئے۔ پھر جھک کر اپنے سیاہ ہاتھوں سے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

نانا نے مجھے ہکا بکا: ”اکیسی یہاں آ! اور قریب آ! کیا تو پہرا ہو گیا ہے؟“ اب دیکھ کہ مرمت کیسی ہوتی ہے!“

ننگے جسم پر اس نے بید کا ایک ہلکا ہاتھ رسید کیا اور ساشا مجروح جانور کی طرح چیخ اُٹھا۔

”ہشت!“ نانا نے کہا: ”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔ آٹے وال کا بھاؤ تو اب معلوم ہو گا!“

یہ کہہ کر اس نے اُسے تاہڑ توڑ اتنا پٹیا کہ جسم نیلا نیلا ہو گیا اور جگہ جگہ سُرخ چکّے پڑ گئے۔ میرے بھائی کی گھگھی سی بندھ گئی تھی۔ نانا ہر وار کے ساتھ پوچھتے جاتے تھے: ”اب مڑا ملا؟ کیسا لگ رہا ہے! یہ ہے انگشتا نے کا بدلا!“

جب وہ ہاتھ اُٹھاتا تھا میر دل بھی اوپر اُچھل آتا تھا اور ہاتھ کے گرتے ہی بیٹھ جاتا تھا۔

ساشا نے ایک دل خراش آہ بھر کر کہا: ”اب کبھی نہیں کروں گا! کیا میں نے آپ کو میر کی چادر کا قصہ نہیں بتایا تھا؟“

نانا نے اس اطمینان سے، گویا وہ انجیل پڑھ رہا ہو، جواب دیا:

”جفل خوری کوئی نیک کام نہیں۔ جاسوس کو پہلے سزا ملنی چاہیے۔  
اس لیے یہ لے منیر کی چادر کا صلہ“

نانی مجھ سے لپٹ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر چلائی: ”میں الکسی کو ہرگز  
نہ پٹنے دوں گی۔ بھیڑیے کہیں کے! تو اسے چھوکر دیکھ“ اور وہ دروازہ  
بھڑ بھڑاتی ہوئی پکار اٹھی: ”ور شکا، اری ور شکا!“

نانا اس پر جھپٹا اور ایسا دھٹکا مارا کہ وہ گر پڑی اور مجھے بکھنچ کر  
بینچ کی طرف لے چلا۔ میں اسے تھکے مارنے لگا۔ اس کی ڈاڑھی بھی نوچی  
اور اس کی انگلیوں میں اپنے دانت پیوست کر دیے۔ وہ ممیا اٹھا اور  
مجھے گویا شکنجے میں پکڑ لیا۔ بالآخر پنج پر پٹک کر اس نے میرے منہ پر  
ایک گھونسا رسید کیا۔ میں اس کی وحشت ناک چیخ کو کبھی نہ بھولوں گا:  
”اے باندھو! میں آج اس کا خون پی کر رہوں گا“ اور نہ میں اپنی  
ماں کے زرد چہرے اور خوف زدہ آنکھوں کو بھولوں گا جب وہ دوڑتی  
ہوئی کمرے میں آئی اور دردناک انداز میں بولی: ”ابا! اللہ، اسے  
نہ ماریجے!۔ اسے مجھے دے دیجیے“

نانا نے مجھے اتنا پٹایا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ میں کئی روز بیمار  
رہا اور ایک چوڑے سے پلنگ پر اوندھا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔  
چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک روشن دان تھا اور ایک چراغ  
کونے میں بی بی مریم کے شہ نشین کے آگے شب و روز جلا کرتا تھا۔  
اس غم آگیز زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔ میری  
طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا اور میں خود اپنے میں ایک

حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور میں اپنے اور ان کے دکھ درد کا اتنا خیال کرنے لگا گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اُس میں سوز و غم کا جہان بسا دیا ہے۔

اس وجہ سے مجھے اپنی تانی اور ماں کو جھگڑتے دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا۔ اس وقت تنگ سی کوٹھری میں نانی بہت بھاری بھر کم لگنے لگی اور غصے میں اماں کو کونے میں دبوچ کر چلانے لگی؛ ”تو نے اسے چھین کیوں نہیں لیا؟“

”میں ڈر گئی تھی۔“

”ایسی سُند و توانا ہوتے ہوئے بھی! ورثہ کا بچہ شرم آنا چاہیے۔ بڑھی ہو کر بھی میں کسی سے نہیں دبتی۔ ٹُف ہر تجھ پر!“

”اماں، جانے بھی دو۔ میں اس دانتا کلکلیل سے تنگ آ گئی ہوں۔“

”نہیں، ساری بات یہ ہے کہ تو اسے نہیں چاہتی۔ بچھے اس غریب یتیم کا کوئی خیال نہیں۔“

میری ماں نے اُداسی سے کہا: ”میں زندگی بھر یتیم رہی ہوں۔“

اس کے بعد وہ دونوں ایک صندوق پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہیں۔ پھر میری ماں نے کہا: ”الکسی کا خیال نہ ہوتا تو میں اس گھر میں دم بھر نہ ٹھہرتی۔ اماں میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔“

نانی نے ہلک کر کہا: ”ہائے میری دُلا رہی۔ ہائے میری آنکھوں کی پتلی؟“ یہ سب باتیں مجھے یاد رہیں۔ ماں کمزور تھی اور دوسروں

کی طرح وہ بھی نانا سے ڈرتی تھی اور میں اسے وہ گھر چھوڑنے سے روک رہا تھا جس کا قیام اس کے لیے ناممکن تھا۔ یہ میری سیہ بختی نہیں تو کیا تھی؟ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میری ماں ایک بیک غائب ہو گئی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نانا جان گویا چھپر بھاڑ کر ٹپک پڑے اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنے سر ہاتھوں سے میرا سر سہلانے لگے : ”کیوں حضرت کیا حال ہے؟ آؤ بھی مُنہ نہ بناؤ۔ بولو، اب کیا کہنا ہے؟“ جی تو بہت چاہا کہ بڑھے کے ایک لات جاؤں لیکن پیر سرکانے سے بھی درد ہوتا تھا۔ اس کا سرجو اس وقت زیادہ مٹیالا تھا، بے چینی سے ادھر ادھر بل رہا تھا۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیوار میں کوئی پینر ڈھونڈتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک سیب، سرخ انگور کا ٹکچھا، شکر کا ایک سینک اور سیٹھی روٹی کی ایک بکری نکالی۔ اور انہیں تیکے کے پاس ٹھیک میری ناک کے نیچے رکھ دیا۔

”اب تو خوش ہوا۔ یہ تیرا انعام ہے۔“

ٹھک کر اس نے پیشانی پر مجھے بوسہ دیا۔ پھر میرے سر کو اپنے بے رحم ہاتھوں سے — جن کے ٹیڑھے میڑھے ناخن پیلے پڑ گئے تھے — پھتہ پھتاتے ہوئے کہنے لگا: ”یار، میں نے بھی تمھاری ساری اکڑ نکال دی۔ تم بہت بوکھلائے، مجھے نوچا کھسٹا اور پھر میں بھی آپلے سے باہر ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ سزا ملنے کی وجہ سے تمھیں کوئی حصاص نقصان تو نہ ہوگا۔ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اگر تمھیں کوئی اپنا سگا مارے تو ہرگز بُرا نہ مانو۔ یہ گویا تمھاری تعلیم کا ایک جُز ہے۔ اگر

کوئی غیر ہاتھ لگائے تو دوسری بات ہے، لیکن اپنوں کی مار کا خیال نہیں کرتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کبھی پٹیا نہیں گیا ؟ تم خواب میں بھی قیاس نہیں کر سکتے کہ کس کس طرح میری چڑی اُدھڑی جاتی تھی !۔ اس بے رحمی سے میری گوشالی ہوئی، کہ اللہ میاں بھی اسے دیکھ کر رو پڑے ہوں گے اور اس کا نتیجہ کیا ہوا ؟ . . . . . میں جو ایک بے نوا یتیم تھا۔ ایک مفلس بیوہ کا بیٹا تھا، آج اس مرتبہ کو پہنچا کہ ایک کارخانے کا مالک اور اُستاد کاری گر ہوں۔“

اپنے پُر شکن اور جُست چالاک جسم کو میری طرف جھکا کر وہ اپنے بچپن کا قصہ مجھے سنانے لگا۔ اس کی سبز آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب اس کی تیز آواز میرے منہ پر پھنکار مارتی تھی تو اس کے سہرے بال تن کر کھڑے ہو جاتے تھے : ”تم اسٹیم پر بیٹھ کر یہاں آئے ہو۔۔۔ بھاپ تمہیں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے پر پہنچا سکتی ہے۔ لیکن جب میں کم عمر تھا تو تن تنہا اس دریا پر کشتی رانی کرتا تھا۔ کبھی کشتی کنارے باندھ کر چٹانوں پر بھاگتے ہوئے کہیں جانا ہوتا تھا۔ صبح سے شام تک پتوار میرے ہاتھ میں ہوتی تھی اور سورج میرے سر پر ایسی آگ برساتا تھا کہ بھیجا اندر ہی اندر کھولنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے تین تین مصیبتیں برداشت کرنی ہوتی تھیں . . . . . بند بند میں درد ہوتا تھا اور رستہ نہیں سوچتا تھا پھر بھی کسی نہ کسی طرح سفر طے کرنا ہی ہوتا تھا۔ وہ اولیٰ ! اُس زمانے کا ذکر میں تجھ سے کیا کروں . . . . .

کھیتے کھیتے پتوار میرے ہاتھ سے پھسل پڑتی تھی اور میں منہ کے بل گر پڑتا تھا۔ پھر میں تازہ دم ہو کر اُٹھتا تھا۔ اگر میں تھوڑی دیر آرام

نہ کھولوں تو یقیناً مرجاؤں۔

خدا اور حضرت عیسیٰ گواہ ہیں کہ میں نے ایسی ہی زندگی بسر کی ہے۔ اس طرح دریائے وولگا کو میں نے اس کے مہانے سے دہانے تک تین تین مرتبہ چھان مارا اور ہزاروں میل کا دھادا مار آیا۔ چار سال میں میں نے اپنے مالک کو بتایا کہ میں کس مٹی کا بنا ہوں۔ وہ بھی مان گیا اور مجھے آزاد ملاح بنا دیا۔

یہ بیان سُنتے سُنتے مجھے محسوس ہوا کہ وہ بادل کی طرح وسیع ہو گیا ہے۔ اور کوئی نحیف و نزار بڑھا نہیں بلکہ عظیم الشان جن ہے۔ کیا وہ بڑا سا بجرا لے ہوئے اکیلا ندی پار نہیں کیا کرتا تھا؟

جوش میں آکر وہ پلنگ سے اُچھل پڑتا تھا اور بتاتا تھا کہ برگی کس طرح بجرا کھینچتے تھے اور پانی کس طرح نکالا کرتے تھے۔ اونچی آواز میں وہ ان کے گیت کے چند بند سنانے لگتا تھا۔ میری حیرت کو دو چند کر کے وہ بڑی پھرتی سے پھر پلنگ پر اُچک آیا اور اپنے قصے کو خستہ مگر اثر آفرین آواز میں یوں جاری رکھا: ”اولینا، کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ گرمی کی کسی شام کو ہم پہاڑیوں کے دامن کے قریب لنگر ڈال دیتے تھے۔ بے نگرہی سے کنارے بیٹھ کر ہم کھانا بچاتے تھے اور پہاڑی ملاح آہن میں مل کر گانے لگتے تھے۔ تان چھڑتے ہی سب لوگ اپنے لگتے تھے۔ ان کی آواز جسم میں تھر تھری ڈال دیتی تھی اور گمان ہوتا تھا کہ دریا گھوڑے کی طرح بھاگا جا رہا ہے اور بادلوں کی طرح اوپر اُڑ رہا ہے۔ اس موقع پر چھوٹی موٹی تکلیفیں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ گانے میں ایسے گن ہو جاتے تھے کہ ہنڈیا اُبل جاتی تھی

پھر تو پکانے والے پر سب ایک بارگی بگڑ پڑتے تھے؟ اپنا فرض نہ بھولا،  
پھر چاہتے تھے ناچو۔“

کئی مرتبہ کاری گر نانا کو بلانے آئے لیکن میں التجا کرتا رہا کہ وہ  
نہ جائے اور وہ بھی ہنس کر ان سے کہہ دیتا تھا: ”ذرا دیر میں آیا۔“  
وہ مجھے اُس وقت تک قصے سُنا تا رہا جب تک شام کا دُھند لگا نہ  
پھیل گیا۔ پھر وہ مجھے بڑی محبت سے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اب میری  
سمجھ میں آیا کہ نہ وہ بد طبیعت ہی نہ سنگ دل۔ یہ سوچ کر مجھے رونا آنے  
لگا کہ اسی شخص نے میری کُندی کی تھی۔ اس حادثہ کو میں کسی طرح  
نہ بھول سکا۔

نانا کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی میری مزاج پُرسی کو آنے لگے اور  
صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی پلنگ پر بیٹھا مجھے بہلانے کی کوشش کرتا  
رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سے میں بسا اوقات بیزار بھی ہو جاتا تھا۔  
یوں زیادہ آنا جانا تو نانی کا رہتا تھا، جو اسی پلنگ پر سوتی  
تھی۔ لیکن اس زمانے میں مجھے سب سے زیادہ سگنوک نے متاثر کیا  
اس کا جسم گھٹیللا، سینہ چوڑا، بال چکنے اور گھنگھرا لے تھے۔ گھنی بھووں  
کے نیچے اس کی آنکھیں مسکراتی رہتی تھیں اور موچھوں کے نیچے سفید  
دانت چمکتے تھے۔ وہ شام کو اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس ہو کر میرے  
پاس آتا تھا۔ اس کے جوتے باجا سا بجاتے تھے۔ سنہری دھاری کی  
قمیص سے روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں پھوٹ نکلتی تھیں۔

اپنی آستین کہنی تک اُلٹ کر اس نے کہا: ”یہ دیکھو“ اس کے ہاتھ  
پر لال لال اول اُبھر آئے تھے۔ ”دیکھو، یہ حصّہ کتنا سوج گیا ہے۔ کل تو



اس میں ہلاکا درد تھا۔ جب بڑے میاں کو غصہ آیا اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ تمہیں نہ چھوڑیں گے تو میں نے یہ سوچ کر ہاتھ بیچ میں ڈال دیا کہ بید ٹوٹ جائے گی اور قبل اس کے کہ وہ دوسری اٹھ لائیں تمہاری نانی یا اماں بیچ بچاؤ کر دیں گی۔ . . . . ایسے کھیل میں نے بہت کھیلے ہیں۔“

وہ جی کھول کر ہنسا اور پھر اپنی سوچی ہوئی کلائی دیکھ کر بولا: ”مجھے تم پر بہت رحم آیا۔ کیسے شرم کی بات تھی۔ لیکن وہ تمہاری مرمت پر تن ہی گئے تھے“ گھوڑے کی طرح ہنہاتے اور سر ہلاتے ہوئے وہ اُس معرکہ کی داستان سنانے لگا اور اس کی طغیانہ سادگی نے مجھے مسحور کر لیا۔ میں نے کہا کہ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ اس کے جواب میں اس نے ایسے خلوص سے جو ہنوز میرے دل پر نقش ہے، کہا: ”تم بھی مجھے بہت پسند ہو، اگر میں تمہیں چاہتا ہوتا تو یہ چوٹ کیوں کھاتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ہر ایرے غیرے کے لیے ہاتھ تڑواتا پھروں گا؟ میں احمق نہیں ہوں۔“

بعد ازاں اس نے دروازے پر نظر رکھتے ہوئے کان میں مجھے یہ ہدایت کی: ”آئندہ وہ جب کبھی تمہیں پیٹے تو نہ بھاگنے کی کوشش کرو نہ اسے روکنے کی۔ روکو تو چوٹ کا بار دوگنا ہو جاتا ہے۔ اگر تم محبت و تکرار نہ کرو گے تو سستے چھوٹ جاؤ گے۔ جسم کو چکانو اور تیر نہ چڑھاؤ۔ میری نصیحت حرف بہ حرف یاد رکھنا لاکھ روپے کی سیکنہ دے رہا ہوں۔“

”لیکن اب وہ مجھے ہرگز نہ پٹیں گے“ میں کہ اٹھا۔

مدکیوں نہیں۔ وہ تمہیں ایک دو نہیں بلکہ درجنوں مرتبہ پیٹیں گے، سگنوک نے نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔  
”اور اس کی وجہ؟“

”وہ وجہ یہ کہ بڑے میاں تمہاری گھات میں رہتے ہیں۔“  
سگنوک نے ایک اور نصیحت کی: ”بید کا ہاتھ سیدھا آتا ہے۔ اگر تم چپ چاپ پڑے رہو گے تو وہ بید اوپر نہ اٹھائے گا کہ کہیں تمہاری کھال نہ اُدھڑ جائے۔ اب سمجھ میں آیا؟ اپنا جسم بید اور ہاتھ کی طرف اُچکا دو گے تو چوٹ ہلکی آئے گی، کن انکھوں سے دیکھتے ہوئے جاتے جاتے وہ یہ بھی سُنا گیا: ”اس معاملے میں میں پولیس والوں کا بھی چچا ہوں۔ لڑکے، ننگی پیٹھ پر میں نے اتنے کوڑے کھائے ہیں کہ کھال تک کھنچ آئی ہے۔“

## باب ۳

اچھا ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر میں سگنوک کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ نانا اپنے بیٹوں سے زیادہ اس کا لحاظ کرتے تھے اور اس کی پیٹھ پیچھے اپنی آنکھیں بند کر کے اور سر ہلا کر کہتے تھے ”سگنوک ہوشیار کاری کر رہی۔ میری بات یاد رکھو کہ وہ ترقی کرے گا اور ایک روز بڑا آدمی ہوگا۔“

میرے ماموں بھی سگنوک سے رکھ رکھاؤ برتتے تھے اور اس سے ویسے مذاق نہ کرتے تھے جن کا تختہ مشق گری گوری بنا کرتا تھا۔ اس بیچارے سے ہر روز کوئی نہ کوئی ادبھا اور گند مذاق کیا جاتا تھا۔ کبھی تو وہ لوگ اس کی قبیحی کا دستہ گرم کر دیتے تھے کبھی اس کی کرسی کی گدسی میں سوتی جھپو دیتے تھے اور کبھی ایک ہی رنگ کے کپڑے اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ نیم بنائی کی وجہ سے وہ انھیں ایک ساتھ سینا چلا جاتا تھا اور انجام کار نانا کی گالیاں کھاتا تھا۔ ایک روز اسے کھانا کھاتے ہی گرسی پڑ پڑی آگئی، تو لوگوں نے اس کا چہرہ نیل سے رنگ دیا اور وہ دیر تک اسی مضحکہ خیز اور دہشت انگیز ہیئت میں باہر گھومتا رہا۔ اس کی رنگین ناک بھوری داڑھی میں چونچ کی طرح ٹنک رہی تھی اور تارِ نظر بینک سے ہو کر اپنی راہ ٹوٹل رہا تھا۔

ان کے پاس اس قسم کے مذاقوں کا لاتناہی ذخیرہ تھا۔ مگر گری گوری خاموشی سے ان سب کو برداشت کر لیتا تھا۔ وہ جی ہی جی میں ادبٹ کر رہ جاتا تھا اور کسی چیز کو چھونے سے پہلے اپنی انگلیوں کو تھوک سے گیلا کر لیتا تھا۔ اسے اس کی ایسی عادت پڑ گئی کہ کھاتے وقت انگلی پر تھوک لگاٹے بغیر چھری کانٹے تک کو نہ چھوتا تھا اور بچے یہ دیکھ کر لوٹ پوٹ جاتے تھے۔ جب اُسے کوئی دکھ ہوتا تو اس کے چوڑے سے چہرے پر جھڑیوں کی ایک لہر اٹھتی جو اس کی بھوؤں پر سُکڑن اور ماتھے پر شکن ڈال کر گنجی کھوپڑی میں خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی تھی۔

یہ یاد نہیں کہ اپنے بیٹوں کے اس کھیل کو نانا کس نظر سے دیکھتے تھے لیکن نانی انھیں مٹکا دکھا کر اکثر چیخا کرتی تھی :

”بے جیا، بے رحم جانور“

لیکن میرے ماموں سگنوک کی غیر حاضری میں اس کی بُرائی کیا کرتے تھے وہ اس پر بھیتی کستے، اس کے کام پر نکتہ چینی کرتے اور اسے چور ڈاکو کہا کرتے تھے۔

میں نے نانی سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ اس نے حسبِ عادت ایسا سُلیھا ہوا جواب دیا کہ سارا معاملہ صاف ہو گیا : ”ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ جب وہ اپنا کارخانہ کھولے تو سگنوک کو ساتھ لے جائے۔ اسی لیے وہ ایک دوسرے سے اس کی بُرائی کرتے ہیں۔ زبان سے تو وہ اسے اناڑی کاری گر کہتے ہیں لیکن دل میں ایسا نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی مکاری ہے۔ وہ دُرتے

ہیں کہ سگنوک کسی کے ساتھ نہ جائے گا۔ نانا کے ساتھ کام کرتا رہے گا اور نانا اسے لے کر کہیں نیا کارخانہ نہ قائم کر دیں جس سے اُن سب کی بدھیا بیٹھ جائے گی۔ اب تم سمجھو؟“ اس نے ہنس کر کہا: ”یہ سب بڑے سیاہ قلب ہیں اور خدا کا بھی خوف نہیں کھاتے۔ نانا ان کی چالاکی کو خوب جانتے ہیں اور انہیں یہ کہہ کر جلایا کرتے ہیں کہ میں سگنوک کو فوجی خدمت سے استثناء دلا دوں گا کیوں کہ اس کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا۔ یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتے کیوں کہ فوجی خدمت سے بریت حاصل کرنے کے لیے خاصی رقم خرچ کرنی ہوتی ہے۔ اب میں برابر نانی کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ سونے سے پہلے وہ مجھے پریوں کی کہانی یا اپنی زندگی کے احوال سنایا کرتی۔ یہ بھی کچھ کم دل چسپ نہ تھے۔ لیکن خانگی معاملات مثلاً جائیداد کی تقسیم یا کسی نے گھر کی خرید — کا ذکر وہ کسی اجنبی یا پڑوسی کی طرح کرتی تھی، گھر کی مالکن کی حیثیت سے نہیں۔

اسی نے مجھے بتایا کہ سگنوک بچپن سے یتیم ہے۔ موسم بہار میں اوس سے بھگی ہوئی ایک رات کو وہ ہر ساتی میں پڑا ہوا پایا گیا نانی نے چڑا سر اور اداس آواز میں سنایا: ”وہ سردی سے ایسا اکڑا ہوا تھا کہ روتک نہ سکتا تھا“

”نانی، لوگ اپنے بچوں کو پھینک کیوں دیتے ہیں؟“  
 ”ماں یا تو اسے دھوہ نہیں پلا سکتی یا اسے کھلانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ جب وہ سنتی ہے کہ بستی میں کسی کا بچہ مر گیا ہے تو وہ مچکے سے اپنا بچہ اس کی دہلیز پر چھوڑ آتی ہے“

سر کھجاتے ہوئے لبنی سانس لے کر، در و دیوار کو گھورتے ہوئے وہ کہنے لگی: ”اولیٰشا، اصل وجہ غربت ہو اور یہ غربت ایسی کہ اس کا ذکر بھی بُرا سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بن بیابھی لڑکی کے اگر بچہ ہو جائے تو لوگ اس پر تھڑی تھڑی کرنے لگیں۔ تیرے نانا اسے تنہا لے جانا چاہتے تھے، مگر میں نے کہا کہ ہماری جو اولاد اللہ کو پیاری ہوئی یہ اس کا بدل ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں اٹھارہ بچوں کی ماں تھی۔ اگر سب جیتے ہوتے تو پورا محلہ بس جاتا — اٹھارہ نئے گھر آباد ہوتے! — اٹھارہ سال کی عمر میں میری شادی ہوئی اور اُس وقت تک میرے بندرہ بچے ہو چکے تھے۔ لیکن اللہ کو میرے جگر پارے ایسے پیارے تھے کہ ایک ایک کر کے سب کو بُلا لیا — میرے سب دودھ پیتے بچے رضوان بن گئے۔ مجھے اس صدمے سے دُکھ بھی ہوا اور سُکھ بھی“

پلنگ کی پانسی رات کے لباس میں بال کھولے ہوئے وہ اُس بھالو کی طرح معلوم ہوتی تھی جسے ایک مداری ہمارے آنگن میں لایا تھا۔ اپنے سفید و شفاف سینے پر صلیب کا نشان بنا کر وہ ہنسنے لگی، کیوں کہ اپنی کسی مصیبت کو بھی وہ زیادہ اہمیت نہ دیتی تھی: ”اچھا ہوا کہ وہ سب سدھارے۔ لیکن میرے لیے ان کی جدائی جان لیوا تھی۔ اس لیے سگنوک کو پا کر میں بہت خوش ہوئی تھی۔ . . . . تاہم اپنے بچوں کی یاد اب بھی میرے زخموں کو کہہ بد دیتی ہے۔ خیر ہم نے اس کی پرورش کی پتسمہ دیا اور اب تک وہ ہمارا شریکِ حال ہے۔ پہلے میں اسے ”جھینگڑ“ کہہ کر

پجارتی تھی، کیوں کہ دراصل کبھی کبھی وہ جھنکار اٹھتا تھا اور کمروں میں جھینگر کی طرح منمناتا پھرتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ بڑا شریف ہی، تم اسے چاہا کرو۔“

میں سگنوک کو چاہتا تھا اور دل سے پسند کرتا تھا۔ سینچر کو جب نانا بچوں کو ہفتے بھر کے گناہوں کی سزا دے کر کلیسا چلے جاتے تو ہم لوگ باورچی خانے میں بڑے مزے سے وقت گزارتے تھے۔ سگنوک تندور سے کئی تیل چٹے پکڑ کر اُن کے دھاگے کی لگام لگاتا تھا۔ پھر وہ پیٹھے کی گاڑی میں ان سیاہ گھوڑوں کی دولہنی قطاروں کو جوتا تھا۔ چکنی چکنی پیلی میر پر یہ گھوڑے بڑی شان سے چلتے تھے۔ سگنوک لکڑی کے تنکے سے کوڑے کا کام لیتا اور انھیں کو پختے ہوئے کہتا: ”دیکھو، بڑے پادری کی گجھی جا رہی ہے“ ایک تیل چٹے کی پیٹھ پر کاغذ چپکا کر وہ اسے گاڑی کے پیچھے چلاتا: ”ہم تھکلا تو بھول ہی آئے تھے۔ بیچارا جھوٹا پادری اسے لاد کر لے جا رہا ہے۔ چل، بے چل۔“

دوسرے تیل چٹے کی ٹانگ میں وہ روٹی کا پھاہا باندھ دیتا اور جب وہ لنگڑا کر اور سر جھکا کر چلتا تو سگنوک تالی بجا کر چلاتا: ”یہ دیکھو منجھلے پادری کو جو شراب کو جو شراب کی بھٹی سے مکھل کر گر جا گھر جا رہا ہے“

آخر میں وہ ہمیں جیب سے نکال کر ایک چوہا دکھاتا تھا جو اس کے حکم پر دو ٹانگوں کے بل چلنے لگتا تھا۔ اپنی لمبی دم سے جھاڑو دیتے ہوئے اور شیشے کی سی آنکھوں کو چمپکاتے ہوئے وہ

ہنایت مضحکہ خیز لگتا تھا۔

سگنوک بڑی سنجیدگی سے کہتا تھا: ”چوہے بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ اس گھر کا ہم زاد ان کا جگری دوست ہے۔ جو چوہوں کی خاطر کرے گا، ہم زاد ان کی مراد پر لائے گا۔“

اسے تماش اور سگنوک کی شعبہ بازی میں بھی دخل تھا۔ وہ بچوں سے بھی زیادہ چھپتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم میں اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک مرتبہ تماش کے کھیل میں سب نے اُسے چور بنانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہ پُر در پُر ہارتا گیا اور سخت برہم ہوا۔ ناک بھوں چڑھا کر اس نے کھیلنے سے انکار کر دیا اور بعد میں مجھ سے شکایت کرنے لگا: ”پہلے کی لگی بدی تھی۔ وہ سب اشارے کر رہے تھے اور میرے نیچے سے ایک دوسرے کو پتے بانٹ رہے تھے۔ یہ بھی کوئی کھیل میں کھیل ہے۔ اگر وہ دھاندلی پر آمادہ ہیں تو میں بھی کوئی ایسا انیلا نہیں ہوں۔“ یاد رکھیے کہ اس کی عمر ۱۹ سال کی ہو چکی تھی اور وہ اکیلا ہم چاروں سے بڑا تھا۔

میں تو ہاروں کی شام ی ان صحبتوں کو کبھی نہ بھولوں گا۔ نانا اور مائیکل ماموں اپنے دوستوں سے ملنے چلے جاتے تھے۔ ادھر میل کھیلا جا کوف اپنا ستاریے داخل ہوتا تھا ادھر نانی چاتے کے ساتھ بھانت بھانت کے پکوانوں کی تیاری میں مصروف ہو جاتی تھی اور ایک چوڑی سی بوتل میں، جس کے نچلے حصے پر بڑی خوبصورتی سے سُرخ پھول ڈھلے ہوئے تھے، ووڈ کا بھر کر میز پر



رکھ دیتی تھی۔ ان موقعوں پر سگنوک زرق برق لباس میں نظر آتا تھا اپنی رنگین عینک چمکاتے ہوئے گری گوری پنچوں کے بل کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ ٹماٹر کی طرح گول مٹول اور سُرخ فام یوجنیا اپنی پیننی آواز اور چور آنکھیں لیے ہوئے اس کے پیچھے ہوتی تھی اور بھی کئی رنگ برنگے جانور آتے تھے جن میں سے کوئی کڈال سے ملتا تھا تو کوئی پھاؤڑے سے۔ وہ سب کھانے پر یوں ٹوٹ پڑتے تھے کہ ان کے منہ سے آواز بھی نکلتی تھی۔ رفتہ رفتہ دہاں مسرت اور گرم چوخی کی ایک عجیب سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔

جاکوف ستار پر کسی عشقیہ گیت کا سرگم جما کر بار بار یہ جملہ دہراتا جاتا تھا: ”اب شروع کریں؟“

اپنے کاسہ سر کو ہلا کر اور بطخ کی سی گردن ہلا کر وہ ستار پر تھک پڑتا تھا۔ اس کے لاپرواہ چہرے پر ایک خواب آگس کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی جذبہ پوش اور حیا پرور آنکھوں کے آگے کہری چادر سی پڑ جاتی تھی۔ تاروں کو بڑی نزاکت سے چھیڑ کر پہلے وہ کوئی بے ربط سی راگنی شروع کرتا تھا۔ بجاتے بجاتے مست ہو کر وہ بلا ارادہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی موسیقی کا اشارہ تھا کہ ہر طرف خاموشی ہو۔ دُور سے آتی ہوئی پہاڑی ندی کی طرح وہ جھپٹتی تھی اور دل کی ہر رگ سے ٹکرا کر اس میں اُداسی اور بے چینی کا جھرناسا بہا دیتی تھی یہ موسیقی ہم سب کو غم آشنا بنا دیتی اور ایک لمحہ کے لیے ہر بوڑھا بچپن کی یاد میں کھو جاتا تھا۔ ہم سب بے حرکت بیٹھے ہوتے تھے اور خواب کے سکوت میں محو ہو جاتے تھے۔ خصوصاً ساشا کا ہر بنِ مگوکوش

برآواز ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے چچا کے پاس تن کر بیٹھا ہوا منہ کھولے ستار کو تاکتا رہتا تھا اور خوشی کے مارے سُبکیاں سی بھرنے لگتا تھا۔ باقی سب یوں دم مارے بیٹھے رہتے تھے گویا وہ شل ہو گئے ہیں یا مسکور ہو گئے ہیں۔ صرف سہاور کی مسلسل سرسراہٹ کی آواز سنائی پڑتی تھی لیکن وہ ستار کی فریاد میں خلل انداز نہ ہوتی تھی۔

خزاں کی شب کی سیاہی کو دو چھوٹے چھوٹے جھروکوں سے جھنک آتی ہوئی روشنی کسی قدر اُجال دیتی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ان جھروکوں کے پٹ پر بھاپ مار دیتا تھا۔ دو موم بتیوں کی بلی لو بھال کی نوک کی طرح، میسر پر ٹٹمٹا رہی تھی۔

جاکوف کا جسم یوں اکڑ گیا اور دانت یوں بند ہو گئے گویا وہ گہری نیند میں ہی۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی اس کے داہنے ہاتھ کی مڑی ہوئی انگلیاں ایک سرے پر مجروح پرندوں کی مانند تڑپ رہی تھیں اور بایاں پنجا بلا کی تیزی سے یہاں وہاں ناچ رہا تھا۔

جب وہ نشتے میں متوالا ہو جاتا۔ تو نہایت کرخت آواز میں یہ بے سرسیر کا گیت اُلا بکرتا تھا:

|                         |                         |
|-------------------------|-------------------------|
| تو صبح و مسابس روتا     | ای کاش میں گشتا ہوتا    |
| اور دنیا ہی ایک جھنجھٹ! | ہو! تھک کر ہوں میں چورا |
| گھر کو بیٹھے گائیں      | سڑکوں پر جو گن جائیں    |
| کونے کونے میں ڈولے      | تندور پہ جھینگر بولے    |
| یہ دنیا ہی ایک جھنجھٹ   | اوپر اتل چٹے یہ نٹ کھٹ  |



فرش پر تال دینے لگتی تھیں، برتن ہر طرف جھن جھناتے تھے اور اسٹن میں سگنوک بجلی کی طرح جھپٹتا تھا، پتنگ کی طرح پیچ کھاتا تھا، اپنے بازوؤں کو بادبان کی طرح ہلاتا تھا۔ اس کے پاؤ اس تیزی سے گردش کرتے تھے کہ بے حرکت سے معلوم ہونے لگتے تھے پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس تیزی سے چکر کھاتا تھا گویا کوئی زریں ابابیل گردش کناں ہو کیوں کہ اس کی ریشمی قیص اپنی لچک اور پھیلاؤ کے ساتھ ہر سو نور کا ہالہ سا بنا دیتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آتش بہ کف ابھی ہوا میں اڑ جائے گا۔ خود فراموشی کے عالم میں وہ انتھک ناچتا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ دروازہ کھلا ہو تو یہ ناچتے ناچتے باہر نکل جائے گا۔ اور سڑک سے ہو کر شہر میں پھر شہر سے پرے کہیں اور — حدِ نظر سے دُور کہیں غائب ہو جائے گا۔

”پٹک دو، پٹک دو!“ جاکوف نے پیر پٹک کر لکرا اور زور سے سیٹی بجائی۔ پھر اپنی پھٹی ہوئی آواز میں اس نے ایک پُرانی کہاوت الاپنا شروع کی۔

خدا گواہ نہ گر کھیت کی لگی ہو لگام

تو بیوی بچوں کو ہر دُور سے ہزار سلام

سب لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پر تالی پیٹتے اور بیج بیج میں یوں چیخ اُٹتے گویا کوئی ان کا کچھ مر نکال رہا ہو۔ ڈوڈھیل گری گوری آپ اپنی چاند پر چپٹ لگا کر اس ہنگامے میں شامل ہو گیا۔ میرے شانے پر اپنی نرم نرم ڈاڑھی ڈال کر اس نے بُری

سنجیدگی سے کہا: ”الکسی، تیرا باب مسکیم اگر یہاں ہوتا تو لطف دو بلا ہو جاتا۔ وہ کس قدر مہنس کُھ اور رُغّین مزاج تھا۔ تجھے یاد تو ہوگا؟“  
 ”بالکل نہیں!“

”دہ نہیں!۔ ایک بار وہ اور تیری نانی — اچھا ٹھہرو“ بانس کی طرح لٹریٹنگ وہ کھڑا ہوا اور نانی کے آگے سر جھکا کر بیٹھے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں بولا: ”اماں، کیا آپ ہماری خاطر ایک بار وہی ناپچ ناچیں گی جو آپ نے اپنے داماد کے ساتھ ناچا تھا۔ محفل میں جان پڑ جائے گی!“

نانی نے مہنس کمر اور شرماکر کہا: ”گری گوری، تو باگل تو نہیں ہو گیا؟۔ میرے سفید چونڈے پر ناپچ کود پھبتا ہو؟ میری مہنسی کرانا چاہتا ہو؟“

لیکن یک بیک وہ لڑکیوں کی طرح اُچھلی، اپنے لینگے کو کھولنا اور اکڑ کر باورچی خانے میں یہاں سے وہاں دوڑ گئی۔ پھر بولی: ”مہنسا ہو تو مہنسو۔ میری جوتی سے!۔ جاکوٹ، تال نہ بگڑنے پائے!“  
 ماموں صاحب سے کہنے کی دیر تھی۔ آنکھیں بند کر کے وہ بڑی نزاکت سے ستار بجانے لگے۔ سگنوک پل بھر چپ کھڑا رہا پھر نانی کے پاس جا کر اُکڑوں بیٹھ گیا اور اس کا احاطہ کر لیا۔ ادھر نانی بازو پھیلائے ایرو پر بل ڈالے اور خلا میں ٹکٹکی لگائے اُس خاموشی سے زرت کرنے لگی گویا ہوا میں اڑ رہی ہو۔ مجھے وہ حد درجہ مضحکہ خیز معلوم ہوئی اور میں زور سے مہنس پڑا۔ لیکن گری گوری نے مجھے گھونسا دکھایا اور سب بڑھے غصّے سے میری طرف دیکھنے لگے۔

گرمی گوری نے کہا، ”سگنوک، آواز نہ ہونے پائے یہ اس کی  
 تعمیل میں وہ فوراً الگ ہٹ کر دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ ادھر  
 یوجنیا نے اپنی تھوٹھنی نکال کر سُرلی آواز میں یہ گیت شروع کیا:  
 صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے      پر وہ دکھیا کبھی نہ سوتی ہے  
 ہر گھڑی کپڑے بیٹھے سیتی ہے      پیٹ کے صدقے آنکھ کھوتی ہے  
 یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ نانی نابج رہی ہے۔ گمان ہوتا تھا کہ  
 کوئی کہانی کہ رہی ہے۔ وہ بڑی نزاکت سے جنبش کرتی تھی گویا نیند  
 میں کروٹ بدل رہی ہے۔ ہونے ہوئے مشکلی تھی تو اس کا بھاری  
 بدن ہل جاتا تھا اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی کبھی ٹھٹک  
 کریوں رُک جاتی جیسے کسی چیز سے ڈر گئی ہے اور اس کا چہرہ سہم  
 جاتا تھا۔ . . . . لیکن دفعتاً ایک دل کش تبسم اسے جگلا دیتا  
 تھا۔ وہ یوں داہنے دبک جاتی تھی جیسے کسی کو راستہ دے رہی  
 ہو یا کسی سے دامن چھڑا رہی ہو۔ پھر اس کا سریوں نڈھال  
 ہو جاتا تھا گویا اب وہ مہربانے گی اور پھر یہ محسوس ہوتا کہ وہ  
 کسی کی باتیں کان لگا کر سُن رہی ہے اور خوشی سے کھلی جا رہی ہے  
 . . . . . اچانک وہ کوندے کی طرح لپک کر اس تیزی سے  
 چکر کھانے لگتی کہ محسوس ہوتا کہ اس کا جسم حسین اور قد دراز ہو گیا  
 ہے۔ اس حیرت انگیز تجدیدِ شباب کے موقع پر وہ کیسی سن موہنی  
 ہو جاتی تھی! ————— ادھر یوجنیا کی چپیں چپیں جاری رہتی تھیں:

مگر اتوار کا ہے یہ بانا

ناچنا، گانا اور پیے جانا

ناچ ختم کر کے نانی ساور کے پاس بیٹھ گئی۔ سب نے اس کی تعریف کی اور وہ اپنا جوڑا باندھتی ہوئی بولی: ”اجی بس بھی کر دیا تم نے ناچ دیکھا کہاں ہے۔ میرے گائو میں ایک لڑکی تھی — بھلا سا نام تھا۔ جب وہ ناچتی تھی تو لوگ خوشی کے مارے رو دیتے تھے۔ اسے ناچتے دیکھنا، ہزار نظاروں کا ایک نظارہ تھا۔ اس کے بعد انسان کوئی ہوس نہ کرتا۔ میں نصیب جلی اس سے کتنا رشک کیا کرتی تھی“

یوحنیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”گو پیے اور نرت کار دنیا کے سب سے بڑے آدمی ہیں“ اور اس نے جھٹ سے حضرت داؤد کا جنگ نامہ شروع کر دیا۔ ادھر جاکوف ماموں نے سگنوف کو گلے لگا کر کہا: ”اگر تم شراب خانوں میں ناچو تو لوگوں کے ہوش اڑ جائیں“ مگر سگنوف کا گلہ باقی رہا: ”کاش میری آواز ابھی ہوتی تو میں بچپن میں ہی گانا شروع کر دیتا، چاہے اس کے لیے مجھے راہب ہی کیوں نہ بننا پڑتا“

وہ سب شراب پینے لگے۔ گرمی گرمی کا نمبر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ نانی اس کا پیالہ پیہم بھر کر ٹوکیتی جاتی: ”گرمی گرمی، زیادتی کی تو اندھا پٹ ہو جائے گا“ مگر وہ یہی کہے جاتا کہ ”مجھے ان آنکھوں سے کیا لینا ہے۔ جانا ہی تو جائیں، مجھے کوئی پروا نہیں“ گلاس پر گلاس چڑھانے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ ہر گھونٹ کے ساتھ وہ زیادہ باتونی ہوتا جاتا تھا اور مجھ سے متواتر میرے مرحوم باپ کا ذکر کر رہا تھا: ”میرا دوست میکسم بڑا

دیا دل تھا — ”نانی نے آہ بھر کر اس کی تائید کی، ”خدا بخنہ  
ہیرا تھا ہیرا“

یہ سارا نظارہ اس قدر دل چسپ تھا کہ میں مبہوت بیٹھا رہا  
اور میرے دل پر ایک نازک اور لطیف سی مایوسی چھا گئی کیوں کہ  
ہم میں خوشی اور غم کے جذبے ایک ساتھ رہتے ہیں اور کسی طرح  
جدا نہیں کیے جاسکتے۔ وہ کب اور کیسے ایک دوسرے کی جگہ لے  
لیتے ہیں، اس کی خبر ہمیں کبھی نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ جاکوف ماموں پر نشہ چڑھ گیا۔ وہ اپنی قمیص پھاڑنے  
لگا اور اپنے گھنگھرا لے بالوں، ترشی ہوئی مچھوں اور موٹے  
ہونٹوں کو نوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ رو رو کر وہ پچھنے لگا: ”میں  
کون ہوں؟ میں یہاں کیوں آیا؟“ پھر اپنا سر اور سینہ پیٹ کر  
وہ ہچکی لیتے ہوئے چلا یا، ”سیاہ قلب، گنہگار، جہنمی!“

”اوہو، یہ تم نے ٹھیک کہا۔“ گرمی گوری نے جواب دیا۔ لیکن  
نانی نے جو خود بھی کچھ کچھ بہک چلی تھی، اپنے بیٹے کا ماتھے پکڑ کر کہا:  
”جاکوف بس کرو، اللہ اپنے بندوں کو نیک راہ دکھاتا ہے۔“

شراب نوشی کے وقت اس کی موہنی بڑھ جاتی تھی۔ اس کی  
آنکھوں کی مسکراہٹ اور سیاہی زیادہ شگفتہ ہو جاتی اور سب  
پر اس کے دل کی گرمی عیاں کر دیتی تھی۔ گرمی سے بوکھلا کر وہ  
سر سے رومال اتار دیتی اور بہکی ہوئی آدانہ میں گنگنایا کرتی: ”  
”اللہ اللہ زندگی کس قدر پیاری ہے!۔ ارے لوگو، دیکھو تو سہی کہ  
دنیا کیسی سہانی ہے۔“



یہ اس کے دل کی صدا تھی — اور دراصل یہ اس کی زندگی کا فلسفہ تھا۔

اپنے آوارہ مزاج ماموں کے ماتم نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے نانی سے پوچھا کہ وہ اپنا سرکیوں پیٹ رہا ہے، سینہ کیوں کوٹ رہا ہے۔

نانی نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا: ”جتنے تو ہر چیز کی ٹوہ رہتی ہو!۔ ذرا صبر کرو تو جتنے خود یہ بھید معلوم ہو جائے گا“

میرا تجسس بڑھتا گیا اور میں سگنوک سے پوچھنے کے لیے کارخانے پہنچا مگر وہ بھی کچھ بتانے کو تیار نہ تھا۔ ”گری گوری کو آنکھ مار کر وہ زیرِ لب ہنسا اور یہ کہہ کر ٹال دیا: ”بھاگتا ہے یا نہیں۔ زیادہ محبت کی تو ناند میں ڈال کر رنگ میں نہلا دوں گا“

تندور میں کئی بڑی بڑی ناندیں جُنی گئی تھیں اور گری گوری ایک لنبی سی لکڑی سے انھیں چلاتا جاتا اور بیج بیج میں اسے نکال کر پانی کی رنگت دیکھتا جاتا تھا۔ اس کا رنگ بزرنگ پیش بند پادری کی قبا سے ملتا جلتا تھا اور تیز آہنچ اس پر دھوپ چھانے کا تماشہ کر رہی تھی۔ ناند میں رنگ بدبوا رہا تھا اور ہر طرف بھاپ کے بادل اُڑ رہے تھے۔ گری گوری نے اپنی دھندلی اور سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے کے بعد سگنوک سے کہا: ”کوئی تمہیں بلا رہا ہے سنتے نہیں۔“ اور جب وہ چلا گیا تو گری گوری توتیا کی بوری پر بیٹھ گیا اور مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنے پر مجھے بٹھا کر اور ڈاڑھی پر گال سے بھڑا کر اس نے آہستہ سے کہا: ”تمہارا ماموں اپنی بیوی کا

قاتل ہی اور اب ضمیر اس پر ملامت کرتا ہی۔ تم ہر چیز کو سمجھنا چاہتے ہو اور اسی لیے گڑ بڑا جاتے ہو۔“

گرمی گوری نانی کی طرح صاف گو تھا، لیکن اس کی باتیں اضطراب کن ہوا کرتی تھیں اور وہ ہر معاملے کی تہ تک پہنچتا تھا جہاں جہاں کہ وہ پڑتا گیا: ”کس طرح قتل کیا؟۔ سُنو۔ دونوں پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے پلنگ پوش سے اس کا منہ بند کر دیا اور اسے مارنا شروع کیا۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔“

اس دوران میں سگنوک اپنے دامن میں آنگن سے کوئی چیز بھرا لیا تھا اور آگ کے آگے بیٹھا ہاتھ سینک رہا تھا۔ لیکن اس کی موجودگی میں مطلق پروانہ کر کے مستری کہتا گیا۔ ”شاید وجہ یہ تھی کہ وہ ان ذاتِ شریف سے زیادہ نیک تھی اور یہ دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتا تھا۔ لڑکے، تیرے نانا کا قبیلہ بھلے مانسوں کے حق میں بڑا بُرا ہی۔ ان سے یہ لوگ جلتے ہیں۔ اپنی نانی سے پوچھ کہ انھوں نے تیرے باپ کی کیسی دُرگت کی تھی۔ وہ سچ سچ کہہ دے گی۔ اسے دھوکا دھڑی سے کہہ ہی کیوں کہ وہ اینٹچ اینٹچ نہیں سمجھ سکتی۔ شراب پینے اور ناس سو نگھنے سے کیا ہوتا ہی دراصل اس کا شمار ولیوں میں ہونا چاہیے۔ عجیب و غریب عورت ہی۔“

اس کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا، اسی میں تیرا بھلا ہی۔“

اس کے اشارے پر میں باہر چلا آیا۔ میرے دل پر غم اور خوف کا بار تھا۔ سگنوک گھر کی ڈیوڑھی پر مجھے ملا اور اس نے نرمی سے

میرے کان میں کہا: ”اس سے ڈرانہ کرو۔ وہ بھلا آدمی ہے۔ لگی لپٹی نہ رکھو تو وہ خوش رہتا ہے۔“

یہ فضا میرے لیے حیرت افزا بھی تھی اور تکلیف دہ بھی مجھے کسی دوسرے ماحول کا تجربہ تو نہ تھا لیکن یہ یاد پڑتا تھا کہ میرے ماں باپ اس طرح نہ رہتے تھے۔ ان کا طرز طریقہ ہی اور تھا۔ ان کا مسرت کا تحیل بھی مختلف تھا۔ گھر اور باہر کہیں ان کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔ شام کو جب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھتے تھے تو دیر تک ہتھکے لگاتے اور گلا پھاڑ کر گاتے تھے۔ راہ چلتے لوگ رُک کر یہ تماشا دیکھنے لگتے تھے اور ان کی شکلیں ایسی مضحکہ خیز ہوتی تھیں کہ مجھے جھوٹی ہکا بویوں کا خیال آتا تھا۔ لیکن اس گھر میں شاید ہی کوئی ہنستا ہو اور کبھی کوئی پھوٹے منہ ہنسا بھی تو یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اکثر وہ ایک دوسرے پر ہر گزرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے تھے۔ بچوں پر مُردنی چھائی رہتی تھی اور کوئی ان کی بات نہ پوچھتا تھا۔ جس طرح بارش کا پانی مٹی کو دبا دے، اسی طرح یہ بھی پا مال ہو گئے تھے میں یہاں ایک اجنبی تھا۔ آئے دن کوئی نئی چوٹ لگتی تھی جو مجھے زیادہ مشتبہ بنا دیتی اور مجبور کر دیتی تھی کہ میں واقعات کا مطالعہ زیادہ دور سے کروں۔

سگنوک سے میری دوستی گہری ہوتی گئی۔ نانی تو گھر بار کے دھندے میں صبح سے شام تک بھینسی رہتی تھیں اور میں سارا وقت سگنوک کے ساتھ گزارتا تھا۔ جب کبھی نانا میری مرست

کرتے تو وہ اپنا ہاتھ ضرور بید کے نیچے رکھ دیتا اور دوسرے دن اپنی نگار انگلیاں دکھا کر کہتا تھا: ”یہ حماقت نہیں تو کیا ہے؟ اس سے تمہارا بھلا بھی نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ میری کمندی ہوتی ہے۔ اب میں اس جھگڑے میں نہ بھنوں گا، یہ کہے دیتا ہوں“

لیکن دوسری مرتبہ پھر وہ پھٹے میں ٹانگ ڈال کر مار کھا جاتا تھا اور میں پوچھتا تھا: ”مگر تم نے تو ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟“

”سمجھ میں نہیں آتا۔ بے سوچے میں پھر یہ حرکت کر گیا۔“

اسی زمانے میں مجھے سگنوک کے متعلق ایک نئی بات معلوم ہوئی جس نے اس سے میری دل چسپی اور محبت کو دوبالا کر دیا۔ ہر جمعہ کو وہ نانی کی ڈلاری گھوڑی ”سنارپا“ کو اگے میں جوتا تھا۔ یہ گھوڑی بلا کی بد مزاج اور تند خو تھی۔ اپنا بھاری بھر کم اوور کوٹ اور ٹوپ پی پہنے، ہرے فیتے سے کمر کس کر وہ سامان خریدنے کے لیے بازار کی راہ لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی دیر سے آتا تھا اور سارا گھر فکر مند ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی ہڑن کھڑکی تک جا کر منہ کی بھاپ سے نیشے کی برف صاف کر کے ٹکڑے کے دونوں سروں کو دیکھا کرتا تھا۔

”اس کا کوئی پتہ نہیں؟“

”نہیں۔“

سب سے زیادہ تردد نانی کو ہوتا تھا: ”خدا کی ماریا تم نے گھوڑی اور لڑکے دونوں کو ختم کر دیا۔ ارے بے ایمانوں! تم میں انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی؟۔ تھوہی تم پر احمقوارہ شرابی“

خدا تمہیں اس کی سزا دے گا! نانا ناک بھوں چڑھا کر غراتا تھا، بس بھی کرو! آئندہ ایسا نہ ہوگا۔

کبھی سنگنک دوپہر تک نہ لڑتا تھا۔ نانا اور ماموں اس کے آتے ہی آنکھن کی طرف بھاگتے تھے۔ نانی بھی بھالو کی طرح لپکتی تھی اور زور سے ناس سڑکتی جاتی تھی کیوں کہ یہ اس کا مقررہ وقت تھا۔ رٹکے بھی دوڑ پڑتے تھے اور اگے سے سامان اُترنے لگتا تھا۔ گوشت مچھلی اور مُردہ پرندوں کا انبار لگ جاتا تھا۔

نانا اپنی تیز آنکھوں سے سارے سامان کا جائزہ لے کر پوچھتا تھا: ”سب چیزیں آگئیں؟ کچھ بھول تو نہیں آئے؟“ سنگنوک آنکھن میں اُچھلتے ہوئے ہنس کر جواب دیتا، ”ٹھیک ہے، سب کچھ آگیا“ اور دستانے میں بند ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے زور سے مٹنے لگتا تھا۔

نانا ڈپٹ کر کہتا تھا: ”دستانوں کو یرباد کرنے کا ارادہ ہے؟ ان میں دام نہیں لگے؟ بدسنے کو کپڑے ہیں یا نہیں؟“

نانا سامان کی ڈھیری کا چکر لگاتے ہوئے زیر لب کڑکڑانے لگتا تھا: ”پھر اس قدر سامان آگیا۔ کیا روپی بیڑ میں پھلتے ہیں۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔“ اس طرح جھلاتے ہوئے وہ چلا جاتا تھا۔ میرے ماموں خوشی خوشی سامان اُتارتے تھے اور سیٹی بجاتے ہوئے مچھلی، مرغ اور گوشت کے بڑے بڑے قتلے ہاتھوں پر تولنے لگتے تھے: ”لو بھئی سامان تو اُتر گیا۔“ وہ اطمینان سے پکار اُٹھتے تھے۔

مائل ماموں خاص طور پر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ کبھی سامان کے ارد گرد پھرتے تھے، کبھی پرندوں کی بوزور سے سونگھتے تھے اور جٹھارہ بھر کر اپنی بے چین آنکھوں کو بند کر لیتے تھے۔ ان کی صورت شکل اپنے باپ سے ملتی تھی۔ وہی روکھا پھیکا انداز تھا۔ قد البتہ کچھ اونچا اور بالوں کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔

اپنے سرد ہاتھوں کو آستینوں میں چھپا کر اس نے سنگوک سے

پوچھا:

”ابا نے تمہیں کتنے روپے دیے تھے؟“

”پانچ روپے“

”یہ سامان بندرہ روپل سے کم کا نہیں! تم نے کتنا خرچ کیا؟“

”چار روپے دس کوپک“

”تو گویا نوے کوپک آپ کی جیب میں ہیں!۔ سنا بھائی جاگون

یہاں چاندی کس طرح گلتی ہے؟“

یہ حضرت ایک نیم آستین پہنے برف میں کھڑے، نیل گوں روٹنی

میں ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے دانت نکوس رہے تھے۔

اس نے الکساہٹ سے پوچھا: ”سنگوک، ہمارے بے تھوڑی

سی برانڈی ہو یا نہیں؟“

ادھر نانی گھوڑی کی لگام کھول رہی تھی: ”اچھا، میری بیٹیا!

نزدوں کی پالی! اللہ میاں کی گردیا!“

گھوڑی ایال ہلانے لگی اور اپنے سفید دانت اس کے کاڈھے

پر رکھ دیے۔ اپنی منلی ناک اس کے بالوں میں گھسیر کر اس کے

چہرے کو مطمئن نگاہوں سے تگنے لگی اور اپنے پوٹوں کی برف جھاڑ کر دھیرے دھیرے ہنہانے لگی۔

”اوہو! اب تجھے روٹی چاہیے۔“

نانی نے نمکین روٹی کا بڑا سا ٹکڑا اس کے مُنہ میں ڈال دیا۔ اور اس کے منہ کے نیچے اپنا اسپرن (میش بند) پھیلا کر غور سے دیکھنے لگی۔ سگنوک جو کسی بھیڑے سے کم کھلنڈ را نہ تھا، اُجھل کر اس کے پاس آکھڑا ہوا، ”نانی یہ گھوڑی بلا کی تیر ہی!“

”چل مُنہ کالا کر!“ نانی نے پیرٹیک کر کہا: ”آیا ہی بڑی باتیں ملانے والا! آج میں تجھ سے سخت خفا ہوں۔“

پھر اس نے مجھے بتایا کہ سگنوک نے جتنے کا مال نہیں خریدا اتنے کی چوری کی تھی۔ ”اگر تیرے نانا اسے پانچ روپل دیتے ہیں تو وہ تین کا مال خریدتا ہی اور تین مار لے جاتا ہی۔ اسے تو چوری میں مزا ملتا ہی عادت بگڑ گئی ہی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ یہ حرکت کی تو صاف بچ گیا سب نے اس کی چالاکی کی تعریف کی اور پھر تو اس کا ہاتھ صاف ہو گیا۔ تیرے نانا کی جوانی ایسی غربت میں کٹی کہ اب وہ ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑنے میں اور اپنے بیٹوں کے خون سے زیادہ نہیں رد پڑ غریب ہیں۔ کوئی بھیک بھی دے تو یہ خوشی سے لے لیں اور ٹھیک اور جاکوٹ . . . . . نفرت سے مُنہ بنا کر وہ دم بھر چپ رہی پھر ناس دانی کو تاکتے ہوئے کہنے لگی: ”مگر چاند کی بڑھیا کی کرامات دیکھو . . . . . ان کا نام ہی بی قسمت . . . . . اور یہ چاند میں بیٹھی ہمارے نصیب کا تانا بانا تیار کرتی ہی اور ہمیں اس کے کام

میں دخل دینے کا حق بھی نہیں.....! جو بھی ہو، اگر ان لوگوں کو سگنوک کی چوری کا حال معلوم ہوا تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑیں گے!“ دوبارہ ایک منٹ خاموش رہ کر وہ کہنے لگی: ”دنیا میں اصولوں کی نہیں بلکہ عمل کی کمی ہے۔“

دوسرے دن میں نے سگنوک سے التجا کی کہ آئندہ چوری نہ کرے! ”ورنہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔“

”مجال ہی! میں ایک آن میں انہیں بتا دے جاؤں گا۔ میں پھرتی میں کسی سرکس کے گھوڑے سے کم ہوں۔“ مہنس کہ وہ بولا۔ لیکن پھر اُس کا چہرہ اُتر گیا: ”میں خوب جانتا ہوں کہ چوری میں خطرہ بھی ہے۔ اور گناہ بھی۔ لیکن میں اتنا اُکتا جاتا ہوں کہ دل بہلانے کے لیے یہ کر گزرتا ہوں۔ مگر میرے پاس ایک دمڑی بھی نہیں بچتی۔ ہفتے بھر میں تمہارے ماموں سب لے اُڑتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا! میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے۔“

ایک بیک مجھے گود میں اُٹھا کر جھولا سا جھلاتے ہوئے وہ بولا: ”بڑے ہو کر تم طاقت ور ہو گے۔ ابھی تم ہلکے پھلکے ہو اور تمہاری ہڈیاں مضبوط ہیں۔ تم ستار بجانا کیوں نہیں سیکھتے؟ اپنے ماموں جاکوف سے کہو۔ مگر افسوس کہ ابھی تم بہت کم عمر ہو۔ اس کے باوجود تمہاری نظر میں آزادی ہے۔ تمہیں اپنے نانا سے محبت تو نہیں ہے؟“

”معلوم نہیں“

”مجھے یہ کثرن گھانا بالکل نا پسند ہے۔ سوا تمہاری نانی کے سب

شیطان ہیں۔“





جا چکے تھے۔ کسی جرم کی پاداش میں میں گھر میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میرے ماموں سیاہ لبادوں میں ملبوس تھے۔ صلیب ان کے شانوں پر رکھی ہوئی تھی۔ گرمی گوری نے کچھ پڑوسیوں کی مدد سے مشکل شہتیروں کو جنبش دی اور صلیب سنگنوک کے کشادہ کاندھوں پر لاد دی۔ اس بار کے نیچے وہ لڑکھڑانے لگا اور اس کے پانوں کا پھینکے۔ گرمی گوری نے پوچھا: ”کیا تم اکیلے اسے لے جاسکو گے؟“

”معلوم نہیں۔ یہ بہت دہرنی ہی“

مائیکل ماموں نے غصے سے کہا: ”ابے اندھے، دروازہ کیوں نہیں کھولتا؟“ اور جاکوف ماموں بولے: ”سنگنوک تجھے شرم آنی جا رہی ہے۔ تو اکیلا ہم دونوں پر بھاری ہو۔“

گرمی گوری دروازہ کھول کر بار بار سنگنوک سے کہتے لگا: ”اللہ شافی! بھیا، ہاتھ پاؤں بجائے رکھنا!“

مائیکل نے سڑک سے پیچ کر کہا: ”گنجا بے وقوف کہیں کا!“ ادھر آنگن کے سب لوگ اس طرح ہنسنے لگے گویا انہیں اس صلیب سے پیچھا چھڑا کر خوشی ہوئی ہو۔

گرمی گوری میرے ہاتھ میں انگلی دے کر کارخانے میں گیا اور بولا: ”اس موقع پر شاید نانا تمہیں معاف کر دیں“

اس نے مجھے ادنی چادرول کی ایک گٹھری پر بٹھادیا جواب رنگی جانے والی ٹھیں اور ان سے مجھے سرتاپا ڈھنک دیا۔ پھر دیگیوں سے نکلی ہوئی بھاپ کو سونگھ کر سنجیدگی سے کہا:

”میاں، تمہارے نانا کو میں سینتیس سال سے جانتا ہوں۔ ان کے

کار و بار کا آغاز بھی دیکھا اور انجام بھی میرے سامنے ہی۔ اس وقت ہم دونوں میں دانت کاٹی تھی۔ بلکہ کار و بار کا سارا خاکہ دونوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ تمھارا نانا بڑا کامیاب ہی۔ مجھے کانوں کان پتہ نہ چلا کہ وہ کار خانے پر قبضہ کرنا چاہتا ہی۔ بہر حال خدا ہم سے زیادہ ہوشیار ہی۔ اس کی ایک ذرا سی سہنی پر بڑے بڑے دانا اُتو بن جاتے ہیں۔ ابھی تم ہر معاملے کو نہیں سمجھ سکتے لیکن تمھیں اس کی کوشش کرنا چاہیے۔ یتیم کی زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ تمھارا باپ آوارہ گرد تھا تو کیا وہ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اسی لیے تمھارے نانا سے اس کی نہ بنتی تھی اور یہ اسے ناپسند کرتا تھا۔“

اس شیفن کی باتیں فرحت بخش تھیں۔ تندور کے سُرخ وزریں شعلے اور بھاپ کی وہ اُجلی اُجلی لہر جو جھٹ کے خم دار تختوں پر نیلی نیلی لکیر بنا دیتی تھی اور درازوں سے آسمان کے ٹکڑوں کا نظارہ جو نیلی گوٹ جیسے معلوم ہوتے تھے — میرے لیے یہ سب فردوسِ نظر تھا۔ ہوا تھم گئی تھی۔ آہنگن پر گویا کاپنج کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے۔ گاڑیاں سڑک سے گزرتی تھیں تو کڑا کے کی آوازیں آتی تھیں۔ مکان کی چیمبوں پر دُھنوں کے بادل اُمنڈ رہے تھے۔ برف پر دُھندلی پرچھائیاں، کوئی کہانی سی سُناقتی ہوئی، چل پھر رہی تھیں، دُبل پتلا گری گوری اپنی لہنی ڈاڑھی، گنجی کھوپری اور بڑے بڑے کانوں کے ساتھ دیگ چلاتے ہوئے کوئی نیک دل جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نصیحت کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا: ”دُنیا میں کسی سے نہ دبو۔ اگر کُتا بھی تم پر حملہ کرے تو غُرانے سے نہ چوکو۔“

وہ ضرور دم دبا کر بھاگ جائے گا۔

ایک بیک چوکتا ہو کر وہ مہکار اٹھا: ”یہ آواز کیسی؟“۔ تندور کا دروازہ اپنے پیر سے بند کر کے وہ آگن کی طرف لپکا اور میں بھی اس کے پیچھے ہوا۔ بادرچی خانے کے فرش پر سگنوک جپٹ پڑا ہوا تھا کھڑکی سے روشنی کی کرنیں اس کے سارے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی پیشانی میں عجیب سی چمک آگئی تھی، ابرو چڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں سیاہ چھت پر ٹکی کی ٹکی رہ گئی تھیں۔ اس کے بے رنگ ہونٹوں سے گلابی جھاگ نکل رہے تھے اور دہانے کے کونوں سے خون کی دھار نکل کر اس کی گردن اور فرش پر پھیل گئی تھی۔ بیٹھ سے خون کا فوارہ سانکل رہا تھا۔ اس کے پیر مڑ گئے تھے اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ پتلون پیشاب سے بھیگ گئی ہے۔ وہ فرش کے تختوں سے چپک گئی تھی، جو پالش کی وجہ سے جگر جگر کر رہے تھے۔ خون کی نالیاں روشنی کی کرنوں میں گندھ کر چو کھٹ کے پاس جمع ہو گئی تھیں۔

سگنوک بے حرکت پڑا تھا۔ فقط اس کی انگلیاں فرش کو کرید رہی تھیں اور ان کے رنگین ناخن چمک رہے تھے۔

یوہینا گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی اور ایک پتلی سی موم بتی اس کے ہاتھ میں دینے لگی۔ لیکن وہ اسے نہ تھام سکا اور وہ نیچے گر کر لہو لہان ہو گئی۔ بادرچی خانے میں ہوا گانا سا گنا رہی تھی۔ اگر میں کواڑ کا سہارا نہ لیتا تو ضرور اڑ جاتا۔

جاکوف، سر ہلا بلا کر کابنتی ہوئی آواز میں سارا ماجرا سنا رہا

تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی اور وہ تیزی سے جھپک رہی تھیں؛ ”وہ لڑکھڑا کر گرا اور شہتیر اس پر آ گیا۔ . . . . اس کی پیٹھ پر گر پڑا۔ اگر ہم اسی دقت صلیب کو نیچے نہ ڈال دیتے تو ضرور چوٹ کھا جاتے۔“

گرمی گوری نے دانت کٹکٹا کر کہا: ”یہ تمہاری کر تو ت ہی!“

”کیسے . . . .؟“

”یہ تمہارا فعل ہی!“

خون برابر بہ رہا تھا اور دروازے کے پاس اس کا کندھا سا بن گیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ زیادہ وسیع اور سیاہ تر ہوتا جاتا تھا۔ خونیں جھاگ کے ایک نئے فورے کے ساتھ سگنوک رُور سے چنچا، تڑپا اور مر گیا۔ وہ یوں بے دم ہو گیا گویا زمین سے چپک گیا ہو اور اس کے اندر دھنس رہا ہو۔

جاکوف نے زیر لب کہا: ”مائیکل گھوڑا لے کر ابا کو خبر کرنے قبرستان کیا اور میں اسے گاڑی پر لاد کر فوراً یہاں لے آیا۔ خیریت ہوتی کہ میں شہتیر کے نیچے نہ تھا ورنہ میرا بھی یہی انجام ہوتا“

یو صبیانے دوبارہ موم بتی سگنوک کے ہاتھ میں دی اور اس کی مہتلی پر موم اور آئسو بہانے لگی۔

”دھٹیک ہی! لیکن اس کا سر زمین پر کیوں نہیں رکھتی ری چڑیل!“

”کیا بک رہے ہو جی“

”اری اس کی ٹوپی سر سے اتار دے“

یوحینا نے سگنوک کے سر سے ٹوپی کھینچ لی اور وہ بھد سے ایک طرف لڑھک گیا۔ اب خون منہ کے صرف ایک کونے سے بہنے لگا۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پہلے تو مجھے پوری اُمید تھی کہ سگنوک گہرا سانس کھینچ کر اُٹھ بیٹھے گا اور خوابیدہ آواز میں کہے گا ”اوہ اوہ! کس بلا کی گرمی ہو“ اتوار کے کھانے کے بعد وہ یہی کہا کرتا تھا۔

لیکن اُٹھنا تو درکنار، وہ گویا زمین کے اندر دھنسا جا رہا تھا سورج آگے بڑھ گیا تھا، اُس کی کرنیں چھوٹی پڑ گئی تھیں اور صرف کھڑکی کو اُجال رہی تھیں۔ سگنوک کا سارا جسم سیاہ پڑ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی جنبش بند ہو گئی تھی، ہونٹوں کے جھاگ خشک پڑ گئے تھے۔ اس کے سر کے ارد گرد تین موم بتیاں اندھیرے میں سر نکالے کھڑی تھیں، اپنی سنہری شعاعوں کو ہلا ہلا کر وہ اس کے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کو تک رہی تھیں اور کبھی اپنی کانپتی ہوئی زرد لہروں کو اس کے سانوے گالوں پر پھیلانے لگا، اس کی کھڑی ناک اور خون آلودہ دانتوں کو اُجال دیتی تھیں۔

یوحینا اس کے پاس بیٹھی رو رہی کہ ”ارے میرا سگا! ارے میرا ہم درد!“

غضب کی سردی تھی۔ میں میر کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نانا جان گرتے پڑتے باد بچی خانے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے نانی، مائیکل ماموں اور کئی پڑوسی بھی تھے۔ اپنا کوٹ فریج پر پھینک کر نانا نے کہا: ”ہائے ہائے! تم لوگوں کی لا پردائی نے

کیا غضب ڈھایا! قسم ہو کہ پانچ سال میں وہ سونے کی ترازو میں  
”تلتا“

فرش پر اتنے کوٹوں کا انبار لگ گیا تھا کہ میں سگنوک کا چہرہ  
نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے میں میز کے نیچے سے نکلنے لگا اور نانا کی  
ٹانگوں سے ٹکرا گیا۔ اُنہوں نے مجھے ایک لات رسید کی اور اپنے  
بیٹوں کو گھونسا دکھا کر چلا اُٹھے۔ ”ارے بھیڑیو!“ بیچ پر کہنی ٹیک  
کر وہ بیٹھ گئے اور زار و قطار روتے ہوئے تیز آواز میں بولے ”ہیں  
سب سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ تمہاری آنکھوں میں کھٹکتا تھا! ساری  
بات یہ ہے! بد بخت سگنوک اُنہوں نے تیرے ساتھ کیا کیا۔ بچہ ہے  
کہ پردیسی کے گھوڑے میں ٹوٹی ہوئی لگام لگاؤ۔ کیوں جی اس  
سال خدا ہم سے ناراض ہو یا نہیں؟“

نانا فرش پر گر کر کبھی سگنوک کی نبض چھوتی تھی، کبھی ماتھے پر  
ہاتھ پیرنی تھی اور اس کے ہاتھوں کو بھینچتی تھی۔ پھر تمام موسم  
بیتوں کو پھینک کر وہ بہ مشکل کھڑی ہوئی۔ اپنے چمک دار کپڑوں  
میں وہ زیادہ شان دار معلوم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں گویا  
بھٹی پڑتی تھیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا: ”بد بختو، یہاں سے  
ہٹ جاؤ۔“

نانا کے سوا بہت لوگ باہر چلے گئے۔

سگنوک خاموشی سے دفن دیا گیا اور بہت جلد سب اُسے بھول

گئے۔“

## باب ۴

ایک موٹا سا کبل چوہر کر کے مجھ پر ڈال دیا گیا تھا اور میں پلنگ پر لیٹے لیٹے نانی کی دعائیں سن رہا تھا۔ وہ دوزانو بیٹھ گئی تھی بیچ بیچ میں وہ نہایت احترام سے اپنے جسم پر صلیب کا نشان بنا دیتی تھی۔ آنگن میں غصب کا پالا پڑ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کے برقانی کاف سے ہو کر ہری ہری سی چاندنی کمرے میں آ رہی تھی اور اس کے مہر پہ در چہرے اور بڑی سی ناک کو اُجالتی ہوئی، اس کی سیاہ آنکھوں میں جوت جگا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی گھنیری ریشمی زلفوں میں مشعل سی جل رہی ہے۔ اس کا کالا لہا وہ شانوں پر سے اُھراتا ہوا فرش پر اس کے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

دغا ختم کر کے نانی نے چپ چاپ کپڑے بدلے اور احتیاط سے تہ کر کے انھیں صندوق پر رکھ دیا۔ پھر وہ پلنگ کے پاس آئی میں جھوٹ موٹ خراٹے بھرنے لگا۔

”ارے بچے، تو سویا کب ہی! مٹیا کر پڑ گیا ہی! آجا میرے گڈے، چادر لگوائے“

مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا اور اس خیال سے میں مسکرا پڑا یہ دیکھ کر وہ چلائی: ”ارے تو اپنی بوڑھی نانی سے ایسی شرارت



کہتا ہے۔“ اور اس نے اس ہوشیاری اور پھرتی سے کبیل اپنی طرف کھینچا کہ میں ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا پردوں کے نرم نرم بستر پر دھم سے گر پڑا۔ وہ ہتھکھٹہ لگا کر بولی: ”کیوں میاں تمکو کیا مجھڑنے کا ٹاٹا؟“

لیکن بعض اوقات اس کی دعاؤں کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا تھا کہ مجھے دراصل نیند آ جاتی تھی۔

دعا طوالت اس صورت میں پکڑتی تھی جب دن جنگ و جدل یا پریشانیوں میں گزرتا تھا۔ اس موقع پر میں دعاؤں کو بڑی دلچسپی سے سُنتا تھا۔ نانی اللہ میاں کو گھر کا پورا روزنامہ سُنا جاتی تھی۔ جب وہ جھککتی تھی تو مٹی کا تو وہ معلوم ہوتی تھی۔ روزانہ ہو کر پہلے دل ہی دل میں بد بداتی ہوئی وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگتی تھی: ”خدا تجھے معلوم ہی کہ ہم سب اپنے کو سدھارنا چاہتے ہیں۔ بڑے لڑکے کو شہر میں رہنا چاہیے، ندی کا کنارہ اس کے لیے مضرت دیاں ہر دانہ علم کیا ہونے والا ہے! پھر بڑے میاں کو بھی دیکھ۔ وہ جاکوٹ پر دم دیتے ہیں۔ کیا ایک بچے کو دوسرے سے زیادہ چاہنا اچھا ہے؟ لیکن بڑے میاں کب کسی کی سُنتے ہیں۔ الہی، انھیں کان دے۔“ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خدا کے سیاہ بت کو تاکتی ہوئی وہ اسے یہ مشورہ دیتی تھی: ”اللہ، خواب میں انھیں ایسا درس دے کہ وہ اپنی اولاد سے اچھا برتاؤ کرنے لگیں۔“

سجدے میں گر کر اور اپنی پیشانی فرش پر رگڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خوشامد کے لہجے میں بولی: ”اور میری بیٹی کو راحت دے

تو اس سے ناراض کیوں ہو؟ کیا وہ دوسروں سے زیادہ گناہ گار ہو؟۔ ایک جوان عورت کو ان مصائب میں مبتلا نہ کر۔ ہاں اور میرے خدا، گری گوری کو نہ بھول۔ اس کی آنکھیں زیادہ خراب ہو رہی ہیں۔ اگر وہ اندھا ہو گیا تو در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا اس نے اپنی ساری قوت بڑے میاں کے لیے صرف کر دی، لیکن کیا تو سمجھتا ہو کہ وہ اس کی مدد کریں گے! اللہ میرے اللہ!“

سر جھکائے ہاتھ لٹکائے وہ دیر تک خاموش کھڑی رہتی تھی اور گمان ہوتا تھا کہ یا تو وہ سو گئی یا ایک بیک اکر گئی۔

پھر ماتھے پر بل ڈال کر وہ خود بخود کہ اُٹھتی تھی: ”اب باقی کیا رہا۔“

”میرے مالک ایمان والوں کی مدد کر! میں نا سمجھ سہی — لیکن معاف کر دے۔ تو جانتا ہو کہ میں دانت نہیں بلکہ نادانتہ گناہ کرجاتی ہوں؟ اور ایک گہری سانس لے کر وہ اطمینان و مسرت سے کہ اُٹھتی تھی: ”خدا کے بیٹے، تجھ سے کیا پھپھا ہو۔ تو تو سب کچھ جانتا ہو؟“

مجھے نانی کا خدا بہت بھانا تھا کیوں کہ وہ اس سے اتنا قریب تھا اور میں اکثر اصرار کرتا تھا: ”مجھے خدا کا حال سناؤ۔“ ایک خاص انداز میں وہ اس کا ذکر کرتی تھی — آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر کے اور ایک ایک لفظ تول کر۔ وہ قصداً اپنے سر کا جمال ٹھیک کر کے نیچے بیٹھ جاتی تھی اور پھر ذکر شروع کرتی تھی: ”جنت کی دایلوں میں پہاڑیوں کی چوٹی پر خدا کا محل ہو۔ فردوس میں نہ خزاں ہو نہ زمستان، کیوں کہ بہار وہاں کا ابدی تحفہ ہو اور ہر پھول سدا

بہار ہے۔ وہاں طوبی کے درختوں کے نیچے زمرّد کی قربان گاہ ہے اور یہی اُس مالک کا مقام ہے۔ خدا کے ارد گرد فرشتے برن کے گاہوں کی طرح اڑا کرتے ہیں اور ہر طرف بھونرے گنگناتے ہیں۔ اور زمین و آسمان کے بیچ میں راج ہشوں کی ڈاک جاہی رہتی ہے جو خدا کو ہمارا پیام سنا تی ہے اور دنیا میں ہم سب کو ایک ایک فرشتہ دیا گیا ہے خدا ہم سب سے برابر کا سلوک کرتا ہے۔ مثلاً تمھارا فرشتہ جب اس سے شکایت کرے گا کہ الکسی نے اپنے نانا کے منہ چڑھایا تو وہ حکم دے گا: اس کے بدلے نانا کو اسے بیٹنا چاہیے۔ ہم سب کا یہی حال ہے۔ جو جس لایق ہے اس دربار سے اسے وہی ملتا ہے۔ کسی کو سچ کسی کو راحت۔ اس کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں اور فرشتے پر پھڑ پھڑا کر شب و روز حمد گاتے ہیں: تیری رحمت کے قربان تیری رحمت کے قربان! یہ سن کر وہ مسکراتا ہے اور فرشتے باغ باغ ہو جاتے ہیں! یہ کہتے کہتے وہ مسکراتی ہوئی جھومنے لگتی تھی۔

”تم نے یہ سب دیکھا ہے؟“

”دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یہ سب معلوم ہے۔“

خدا، جنت یا فرشتوں کا ذکر کرتے وقت وہ سمٹ سی جاتی تھی۔ اس کے چہرے میں جوانی اور آب دیدہ آنکھوں میں عجب سی گرمی اور روشنی آ جاتی تھی۔ اس کی دراز و گداز چوٹی ہاتھ میں لے کر میں اپنے گلے میں لپیٹ لیتا تھا اور خاموش بیٹھا یہ لانتا ہی مگر دل چپ دستاں سنا کرتا تھا۔

”انسان کی بے نور آنکھیں خدا کے دیدار کی تاب کب لاسکتی ہے؟“

صرف اولیا کو ہی یہ مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دیکھا ہے۔ جب روح عبادت میں محو ہو تو وہ اپنا جلوہ دکھا جاتے ہیں میں کلیسا میں صبح صبح کلام اللہ سننے گئی تھی تو دو فرشتے بادل کے ٹکڑوں کی طرح قربان گاہ کے گرد پھر رہے تھے۔ ان کے پرے ہر چیز منور ہوتی جاتی تھی اور ان کے ڈینے فرش تک لٹکے ہوئے تھے۔ جب بوڑھا پادری دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو وہ اسے سہارا دیتے تھے۔ وہ بالکل بوڑھا تھا اور نابینا ہونے کی وجہ سے انک انک جاتا تھا۔ لیکن اس روز اس نے فرزند نماز ختم کر دی۔ فرشتوں کو دیکھ کر میری حالت شادی مرگ کی سی ہو گئی۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور آنکھیں نہا رہی تھیں۔ وہ نظارہ بھی کیا حسین تھا ! میرے بیٹے، خدا زمین پر ہو یا آسمان پر، وہاں خوشی ہی خوشی ہے !

”لیکن ہمارے گھر میں خوشی کہاں ہے ؟“

فوراً صلیب کا نشان بنا کر وہ جواب دیتی تھی :

”صلوٰۃ بر مریم ! یہاں بھی خوشی ہے“

یہ سن کر مجھے غصہ آ جاتا تھا۔ میں کبھی نہ مان سکتا تھا کہ اس گھر میں عافیت ہی عافیت ہے۔ میری رائے میں تو گھر کی حالت زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی جاتی تھی۔

ایک روز ماموں مائیکل کے دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے مامی نتالیا کو دیکھا جو ہاتھ سینہ پر باندھے بڑی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھیں اور دردناک لہجے میں کراہ رہی تھیں ”اچھے خدا اپنے پاس بلا لے۔ یہاں سے مجھے ہٹا لے۔“

میں اس کی دعا سے اتنی ہی ہم دردی کر سکتا تھا جتنی گرگوری کی اس شکایت سے؛ ”جب میں اندھا پٹ ہو جاؤں گا تو وہ مجھے بھیک نکالے گا۔ لیکن اس زندگی سے بھیک بھی بہتر ہے۔“

اور میری یہ تمنا تھی کہ وہ جلدی سے اندھا ہو جائے، تاکہ میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں اور دونوں مل کر بھیک مانگنے لگیں میں نے اپنی خواہش اس پر ظاہر کر دی تھی اور گرگوری نے ہنس کر کہا تھا: ”ہاتھ ملاؤ! ہم دونوں ساتھ ساتھ نکل پڑیں گے۔ لیکن پہلے میں شہر جاؤں گا۔ وہاں اسی خاندان کا ایک آدمی میرا ملاقاتی ہو شاید وہ مجھے کچھ کام دے دے۔“

کئی مرتبہ میں نے مانی نتالیا کی آنکھوں کے نیچے سو جن یا اس کے زرد چہرے پر کٹے ہوئے ہونٹ کا نشان دیکھا۔ میں نے نانی سے پوچھا: ”کیا ماموں انہیں مارتے ہیں؟“ اس نے آہ بھر کر جواب دیا: ”ہاں وہ شیطان اس پر بھی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے، گو زیادہ نہیں۔ مار پٹائی مات کو ہوتی ہے تو تیرے نانا بھی کچھ نہیں کہتے۔ وہ بڑا بد مزاج ہے اور یہ بیچاری نری اللہ میاں کی گائے ہے۔“

ذرا اطمینان کے لہجے میں وہ کہتی گئی: ”لیکن اب اس نے مار پٹ کم کر دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھونسا پیٹھ پر یا ایک چپٹ منہ پر۔ بہت ہوا تو ایک دو منٹ بال پکڑ کر ادھر ادھر کر دیا۔ لیکن پہلے تو وہ گھنٹوں اس پر ستم توڑتا تھا اور تو اور تیرے نانا نے ایک توہار کی رات کو میری ایسی ٹھکائی کی کہ کھانے کے وقت سے لے کر

سونے کی گھڑی تک دم نہ لیا۔ دے مار دے مار، پانی پانی پی کر،  
سانس لے لے کر — اور وہ بھی کوڑے سے!

”اور اس کا سبب؟“

”اب میں بھول گئی۔ دوسری بار اس نے مجھے اس زور سے پٹکا  
کہ میں ادھ مری ہو گئی اور پانچ گھنٹے کھانا پانی نہ دیا۔ میں بالکل ادھ  
مری ہو گئی تھی۔“

میں بھوچکا رہ گیا۔ نانی نانا سے دو گنی تھی اور یہ ممکن ہی نہ تھا  
کہ وہ اسے زیر کر سکے۔ اس لیے میں نے پوچھا: ”کیا وہ تم سے زیادہ  
قوی ہیں؟“

”قوی تو نہیں مگر عمر میں زیادہ ہیں۔ یہی نہیں، وہ میرے  
شوہر ہیں اور انھیں میرے ایک ایک فعل کا جواب خدا کو دینا ہی  
میل فرض ہے کہ صبر سے ہر تکلیف برداشت کروں۔“

وہ تماشہ بھی دل چپ ہوتا تھا جب نانی شہ نین کی گرد جھاڑتی  
اور اس کے آرائشی کام کو صاف کرتی تھی۔ اس کے تاج میں چاندی  
ہوتی اور کئی رنگ برنگے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور جب وہ  
اسے ہاتھ میں اٹھاتی تو اس کے لبوں پر تبسم آ جاتا اور اس کے دل  
سے یہ صدا آتی: ”اس کا مکڑا کتنا پیارا ہے!“ اور صلیب کا نشان بنا کر  
اسے چوم کر وہ کہتی جاتی تھی: ”مریم، عیسائیوں کی نگہبان پرہیزگاروں  
کی دست گیر، تو خاک و گرد میں اٹی ہوئی ہے! بیٹے الکسی، دیکھ یہ لکھاؤ  
کتنی باریک ہے اور حرف کیسے ننھے مٹتے ہیں، پھر بھی سب پڑھ لیا  
جاتا ہے۔ اس کا نام ہے۔“ بارہ مہرک دن“ اور بیچ میں عیسیٰ کی

کنواری ماں جلوہ گر ہے۔ اور یہاں لکھا ہے: ”ماں، میرا ماتم نہ کر کیوں کہ میں جلد قبر میں سو جاؤں گا“

کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ شہ نشین سے اتنے ہی شوق و انہماک سے کھیلا کرتی ہے جتنا کہ میری ماموں زاد بہن اپنی گڑیا سے۔ اسے اکثر بھوت نظر آتے تھے، کبھی اکتے ڈکٹے، کبھی بہترے۔ ”ایک چاندنی رات کو میں روڈولفون کے گھر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سر اٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ چھت پر ایک بھوت چینی سے لگا بیٹھا ہے۔ یہ تند و توانا جانور کبھی غراتا، کبھی ناک مڑکتا اور دُم پھیلائے ہوئے برابر اپنے پنجے جھاڑتا جاتا تھا۔ میں نے اس کی طرف صلیب کا نشان بنا کر کہا: ”عیسیٰ کو نئی زندگی عطا ہوئی ہے اور اس کے دشمن تین تیرہ ہو گئے ہیں! یہ سننا تھا کہ وہ چیخ کر چھت سے گرا اور فرش پر آ رہا — اسے بھاگتے ہی بنی اس روز روڈولفون کے گھر گوشت پک رہا ہوگا اور بھوت اس کی خوشبو سونگھ رہا تھا“

بھاگتے بھوت کے تصور سے میں ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گیا اور نانی بھی ہنس کر کہنے لگی: ”بھوت بچوں کی طرح شریر ہوتا ہے۔ ایک روز کپڑے دھونے میں مجھے بڑی دیر ہو گئی۔ اتنے میں کہ ٹھہری کا دروازہ کھلا اور سُرخ سبز و سیاہ جانوروں کا ایک ریلا اندر گھس آیا۔ یہ تل چٹوں سے بڑے نہ ہوں گے۔ میں نے باہر بھاگنے کی کوشش کی مگر یہ جھٹنے مجھے کب جانے دیتے تھے وہ جم غفیر تھا کہ پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھ میرے پیروں پر رینگ رہے تھے

کچھ میرا دامن کھینچ رہے تھے اور میں ان کے نرغے میں اس بڑی طرح پھنس گئی تھی کہ صلیب کا نشان بنانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ نرمی اور گرمی میں وہ بتلی جیسے تھے۔ پھپھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر وہ میرے چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے، ہر چیز کا معائنہ کرتے، چوہوں کے سے دانت دکھا کر اپنی ہری آنکھوں کو جھپکاتے اور مجھے اپنے سینگوں سے کو پختے تھے اور اپنی ذرا ذرا سی دُم کو ہلاتے تھے۔ ارے بھیا، میں تو دیوانی سی ہو گئی تھی اور مجھے اُنھوں نے چسرنی کی طرح گھٹا مارا۔ قذیل بچھ گئی، ناند کا پانی ٹھنڈا ہو گیا اور سارے کپڑے زمین پر بکھر گئے۔ ارے، یہ کہو کہ جان بچ گئی۔“

آنکھیں بند کر کے میں اس کو ٹھری کا تصور کر سکتا تھا جس میں رنگ ہر رنگے بھوت بھرے ہوئے تھے۔ میں انہیں قذیل بجاتے اور منہ چڑھاتے دیکھ سکتا تھا۔ یہ تماشہ کتنا مضحکہ خیز اور خوفناک ہو گا۔

دم بھر چپ رہ کر اور سر ہلا کر نانی نے پھر اپنی طوطا کہانی شروع کر دی۔ ”میں نے دیو بھی دیکھے ہیں۔ جاڑوں کی رات تھی اور برف پڑ رہی تھی۔ تمہیں وہ جگہ یاد ہی جہاں تمہارے ماموں بڑے میاں کو باؤلی میں ڈبونا چاہتے تھے؟ بس میں ادھر سے ہو کر جھوٹی سڑک کی طرف مڑی ہی تھی کہ بینا، پکڑنا، کی آوازیں آئیں اور تین سیاہ گھوڑے مجھ پر بھٹ پڑے۔ کو چبان کی جگہ ایک اڈنچا پورا بھوت، سُرخ ٹوپی پہنے بڑے بڑے دانت نکالے کھڑا



تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آہنی زنجیروں کی بنی ہوئی لگام تھی۔ اور تو کوئی جگہ تھی نہیں، اس لیے گھوڑے برف پوش تالاب میں کود پڑے اور برف کے بادل میں غایب ہو گئے۔ گاڑی میں اور بھی کئی دیو بیٹھے ہوئے ہامو کر رہے تھے اور ٹوپیاں اُچھال رہے تھے۔ ایسی ایسی سات گاڑیاں تھیں جیسے پوری آگ گارو ہو۔ سب میں کالے گھوڑے جتے ہوئے اور دیو بھرے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ وہ اپنی برادری والوں سے ملنے جاتے ہیں اور تیوہار تقریب میں رات کو سفر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس رات کو کسی دیو کی شادی ہوگی۔“

نانی کی بات کو جھٹلا کون سکتا تھا کیوں کہ وہ اس سادگی اور وثوق سے باتیں کرتی تھیں۔

لیکن سب سے مزید ار قصہ حضرت مریم کا ہوتا تھا جو اس مظلوم دنیا کا گشت کرتی تھیں اور ایک عورت ڈاکو ”انگل چیف“ کو حکم دیتی تھیں کہ روسیوں کو ہرگز دق نہ کرے۔ اس سلسلے میں رہنروں، ولیوں اور پادریوں کا بھی ذکر خیر آ جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے بے شمار پہیلیاں اور پوریاں بھی یاد تھیں۔

دنیا میں وہ کسی سے نہ ڈرتی تھی — نہ نانا سے نہ بہت پریت سے۔ مگر کالے تل چٹوں سے اس کا دم نکلتا تھا۔ دس گز کی دُوری سے وہ ان کی بوسونگھ لیتی تھی۔ کبھی آدھی رات کو مجھے جگا کر وہ کان میں کہتی تھی: ”اچھے بیٹے، کوئی تل چٹا گھس آیا ہے اللہ اس مُردار کو دفن کر!“

نیند سے جھومتے ہوئے، قندیل جلا کر میں پلنگ کے نیچے اس  
 بیری کو ڈھونڈنے لگتا تھا۔ مگر یہ تلاش بسا اوقات ناکام رہ جاتی تھی  
 ”تل چٹے کا نام بھی تو نہیں ہے“ میں جھلا کر کہتا تھا۔ لیکن اپنے  
 سر کو چادر میں لپیٹ کر وہ بھڑائی ہوئی آواز میں خوشامد کرتی تھی  
 ”ہی کیوں نہیں! بیٹے اچھی طرح دیکھ کسی کونے میں دبک گیا ہوگا“  
 اس کا خدشہ ہمیشہ ٹھیک نکلتا تھا۔ بالآخر پلنگ کے آس پاس  
 مجھے تل چٹا مل ہی جاتا تھا۔ چادر ہٹا کر اور اطمینان کی سانس لے کر  
 وہ مسکراتی تھی ”مار دیا مردود کو! شکر اللہ! بڑی عمر ہو بیٹے!“  
 اگر کبھی مجھے تل چٹا نہ ملا تو وہ کسی طرح سو نہ سکتی تھی اور مجھے  
 رات کی خاموشی میں اس کی کنپ کنپی کا احساس ہو جاتا تھا ہانپتی  
 ہوئی وہ کہتی تھی ”وہ دروازے کے پاس ہے۔۔۔۔ اب صندوق کے  
 نیچے چھپ گیا“

”لیکن تل چٹوں سے تم ڈرتی کیوں ہو؟“

”میں خود نہیں جانتی“ وہ جواب میں کہتی — اور یہ سچ بھی  
 تھا ”یہ مکروہ کالے کوڑے رنگتے کس طرح ہیں! اور ہر کوڑے  
 کے ساتھ تو خدا کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ دیکھ کو دیکھ کر معلوم  
 ہوتا ہے کہ گھرسیل گیا ہے۔ کھٹل خبر دیتے ہیں کہ دیوار گندمی ہے۔ جوتیاں  
 ایک بیماری کی اطلاع لاتی ہیں۔ لیکن تل چٹے! — یہ کس طرح  
 جیتے ہیں اور کیا بتلاتے ہیں، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا“

x x x x x x x x x x

ایک روز دوزانو بیٹھی وہ خدا سے راز و نیاز کی باتیں کر رہی

تھی کہ نانا دروازہ کھول کر چلا اُٹھے: ”بڑی بی خدا نے پھر ہم پر ایک  
نیا ستم توڑا! گھر میں آگ لگ گئی ہے!“  
نانی فرش سے اُچھل پڑی: ”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ دونوں  
برآمدے کی طرف پکے: ”یو جنبا، شہ نشین اُتارے، نتالیا، بچے کو  
کپڑے پہنا۔“

نانی للکار کر یہ احکام دے رہی تھی لیکن نانا آہستہ آہستہ  
”اوٹ اوٹ“ کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

میں باورچی خانے کی طرف دوڑا۔ جو کھڑکی آئین کی طرف  
کھلتی تھی، سونے کے پڑے کی مانند جگمگا رہی تھی اور فرش پر زرد  
شعلے لہلہا رہے تھے۔ جاکوٹ کپڑے پہنتے پہنتے ان پر ننگے پاؤں  
رکھ کر، پھر یوں اُچھل پڑتا تھا جیسے جل گیا ہو اور پکارتا جاتا تھا  
”یہ مائیکل کی حرکت ہے! آگ لگا کر وہ بھاگ گیا۔“

”چپ رہ کُتے!“ یہ کہہ کر نانی نے اس دروازہ کی طرف اس  
زور سے دھکیلا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔

کھڑکی کے شیشوں پر جمی ہوئی برف سے کارخانے کی جلتی ہوئی  
چھت نظر آ رہی تھی اور نکھلے ہوئے دروازے سے آگ کی لپٹیں  
دھدھاک رہی تھیں۔ رات سنان تھی اور شعلوں کی رنگت میں  
دھنویں کی ملاوٹ نہ ہوئی تھی۔ دھنویں کی سیاہ چادر ان سے  
الگ اپنا حلقہ بنا رہی تھی لیکن وہ سڑک کی روپہلی پوشش کو نہ  
چھپا سکتی تھی۔ برف ایک سُرمئی روشنی میں جھل جھلا رہی تھی۔  
مکان کی دیواریں چُر مڑا تی ہوئی یوں کانپ رہی تھیں گویا ابھی

آنگن کے اس حصہ میں سر کے بل گر پڑیں گی جہاں کارخانے کی لال لال دراروں سے ہو کر شعلے تران دکھا رہے تھے۔ ٹیڑھی ٹیڑھی کیلیں گل گل کر نیچے ٹپک رہی تھیں۔ چھت کی سیاہ شہتروں میں سُرخ و زرد فیتے سے لپٹ گئے تھے اور ان کے بیچ میں مہنی کی نلی دھنوں کی ہنسی بہا رہی تھی۔ کھڑکیوں پر ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہو رہی تھی گویا رستی دوپٹا لہرا رہا ہو۔ آگ کی ندی امنڈتی آتی تھی اور کارخانے کے در و دیوار کلیسا کے طاقوں کی طرح زنگار معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا نظارہ میرے لیے نہایت نظر فریب تھا۔

اپنے سر پر ایک بھاری سا کوٹ ڈال کر اور جس جوتے میں میرے پیراٹ گئے اسے لے کر میں نے برساتی کی راہ لی اور سیڑھیوں پر فق حیران کھڑا ہو گیا۔ آگ کے اس کھیل نے اور گھر بھر کی چیخ پکار نے مجھے باؤ لا بنا دیا تھا۔ سب سے زیادہ دہشت مجھے نانی کو دیکھ کر ہوئی جو سر پر ایک ٹاٹ ڈالے اور پیٹھ کو ایک زین سے ڈھنکے، آگ کے اندر دھنسی پڑتی تھی۔ وہ یہ کہتی ہوئی آگ کے الاؤ میں کود پڑی: ”عقل کے اندھو، توتیا کی بوتس بھٹ پڑے گی!“ نانا چلا آیا: ”گرمی گوری، اسے پکڑے آہ! وہ بھی گئی۔“

لیکن اسی آن نانی توتیا کی بوتل کے بار سے جھکی ہوئی دھنوی

میں سیاہ بھوت بنی، نیم بے ہوشی کی حالت میں برآمد ہوئی۔ کھانستی اور کھکھارتی ہوئی وہ چیخ اُٹھی: ”بڑے میاں گھوڑی کو باہر

نکالو۔ اور اس چیز کو میرے کاندھے سے اُتارو۔ دیکھتے نہیں کہ اس میں آگ لگ چکی ہے۔“

گرمی گوری نے اس کے کاندھوں سے جلتی ہوئی زین اُتاری اور پھر تیزی سے کارخانے کے دروازے پر بھاؤڑے میں بھر بھر کر برف پھینکنے لگا۔ ہاتھ میں کدال لیے میرا ماموں اس کے پاس دو لٹی جھاڑ رہا تھا اور اُدھر نانا نانی پر برف کی بارش کر رہے تھے۔ نانی نے وہ پتل تو برف کی ایک نالی میں پھینکی اور پھاٹک کی طرف جھپٹی جہاں تماشائیوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ انھیں سلام کر کے وہ بولی: ”پڑوسیو! اللہ کارخانے کو بچالو، اگر آگ پھیل گئی تو ہم اس میں جل مریں گے اور تم بھی نہ بچو گے۔ چھت کو گرا دو اور سوکھی گھاس باغ میں پھینک دو! ارے گرمی گوری تو ساری برف نیچے ہی ڈالے جاتا ہے کچھ اوپر بھی تو ڈال۔ جاکوف، اس ناچ سے کیا حاصل؟۔ پڑوسیوں کو کدال اور بھاؤڑے کیوں نہیں دیتا؟ بھائیو اس وقت ہماری مدد کرو، خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

میرے لیے وہ آگ سے کم دل چسپ نہ تھی۔ اُن شعلوں میں دھکتی ہوئی جن کے منہ سے وہ ابھی ابھی نکلی تھی، وہ آنگن میں بجلی کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اس کا تن بدن سیاہ ہو گیا تھا اور وہ ہر موقع پر موجود، سب کی نگرانی میں مستعد تھی اور کوئی چیز اس کی نظر سے دُور نہ تھی۔

گھوڑی یوں بوکھلا کر پتیرے بدلنے لگی کہ نانا گرتے گرتے رہ گئے۔ گھوڑی کی بڑی بڑی آنکھیں روشنی میں ایک خاص اندازے

چمک رہی تھیں۔ اپنے اگلے پاؤں ہوا میں ہلاتے ہوئے وہ ہانپ رہی تھی۔ نانا لگام پھینک کر ایک طرف ہٹ گیا اور زور سے پکارا:

”بڑی بی، تمہیں اس کا جتن کرو“

نانی گھوڑی کے پیروں تلے آتی آتی بچی اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ گھوڑی دردناک لہجے میں ہنہانے لگی اور آگ کی طرف پیٹھ کر کے اس کے قریب آ گئی۔

نانی اس کی گردن تھپ تھپا کر اور لگام سنبھال کر دھیرے سے بولی: ”اری کوئی یوں بھی ڈرتا ہی؟ کیا تجھے میں یوں ہی چھوڑ دیتی؟“

واہ رمی میری چوہیا!“

اور یہ چوہیا، جو نانی سے دو گنی ہوگی، اس کے سُرخ چہرے کو سونگھتی اور تکتی ہوئی چپ چاپ دروازے کی طرف چلی گئی۔

نوکرائی کچھ کبل پوش بچوں کو یہے ہوئے گھر سے نکلی۔ یہ بچے بڑی طرح بسور رہے تھے۔

”بڑے میاں، الکسی کا کہیں پتہ نہیں“

نانا نے ہاتھ ہلا کر کہا: ”اری نکل یہاں سے، ہٹ!“ میں ٹھہری کے نیچے دبک گیا تاکہ یوحنا مجھے پکڑ نہ لے جائے۔

کارخانے کی چھت گر پڑی تھی اور آتش زبان، دودکش شہتیریں آسمان کی طرف مُنہ اُٹھائے نیچے پڑی تھیں۔ یک بیک ایک دھاڑ کے ساتھ عمارت کے اندر ایک سبز و سُرخ طوفان سا آیا اور شعلے نئی اُسنگ کے ساتھ آنگن اور ان آدمیوں کی طرف لپک پڑے جو اس آتش بازی میں برن کے تودے پھینک رہے تھے۔

گرمی کے مارے دلیلیں کھد بدانے لگیں۔ بھاپ اور دھنڈ کی آندھی سی آگئی اور ایک عجیب قسم کی بو کے مارے ہم سب کی آنکھوں سے پانی گرنے لگا۔ میں سیڑھی سے نکل کر نانی کے پانو کے پاس آگیا وہ چیخ پڑی، ”ارے بھاگ، ورنہ کچل کر مر جائے گا۔“

اسی گھڑی ایک گھڑ سہار تانبے کا خود پہنے ہوئے آنگن میں گھس آیا۔ اس کا گھوڑا بھاگ میں نہا سا گیا تھا اور کوڑا اوپر اٹھا کر وہ ڈبٹ کر پولا، ”رستہ خالی کرو!“

گھنٹیاں خوشی کے مارے جلد جلد بجنے لگیں۔ یہ سارا سماں تیرہ وار کا سا تھا۔

نانی نے مجھے سیڑھی پر دھکیل کر کہا، ”میری بات نہیں مانتا؟ ہٹ یہاں سے۔“

اس موقع پر مجھے حکم عدولی کی تاب نہ تھی۔ باورچی خانے میں جا کر میں کھڑکی سے چپک کر بیٹھ گیا۔ لیکن اتنی بھیڑ تھی کہ آگ نظر بھی نہ آتی تھی۔ صرف بال دار ٹوپوں کے بیچ میں خودوں کی جھلک دکھائی پڑ جاتی تھی۔

دم بھر میں آگ بالکل بجھ گئی اور عمارت بھی معدوم ہو گئی۔ پولیس نے متاثرینوں کو کھدیڑ دیا۔

نانی باورچی خانے میں داخل ہوئی، ”یہ کون ہے؟ ارے تو ہے۔ اب تک سویا کیوں نہیں۔ ڈر گیا۔ آئیں؟ آگ بجھ گئی، ڈرنے کی بات نہیں۔“

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی لرزش کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

رات کی تاریکی اور خاموشی سے قدرے اطمینان سا ہونے لگا۔ اتنے میں  
نانا بھی آئے اور چوکھٹ پر کھڑے کھڑے پوچھا: ”بڑی بی؟“  
”کیا ہو جی؟“

”تم ملیں تو نہیں“

”ذرا سا چرکا لگ گیا، کوئی بات نہیں“

نانا نے چٹاق کی آگ سے قندیل سلگائی اور اس کا دھیمسا  
چرا جھک اٹھا۔ پھر وہ نانی کے قریب بیٹھ گیا۔  
”ہنا نا ہی پڑے گا“ نانی نے رائے دی۔ کیوں کہ وہ بھی دھنوں  
میں لتھڑی ہوئی تھی اور اس سے جلانے کی بو آ رہی تھی۔

نانا نے لنبی سانس لے کر کہا: ”کبھی خدا تمہیں بھی سمجھ دیتا ہے؟“ ہمیں  
چیر کر اُس کے کہنی ماری: ”لیکن صرف ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔“

نانی نے ہنس کر کچھ کہنا شروع کیا تھا کہ نانا نے بات کاٹ  
کر غصے سے کہا: ”گرمی گوری کو جواب دینا ہی پڑے گا۔ اس کی لاپرواہی  
سے یہ نقصان ہوا۔ اب نہ وہ کام کا رہا اور نہ اس میں دم رہا اور  
وہ اُٹو جاکوٹ باہر بیٹھا رو رہا ہے، اُسے جا کر سمجھاؤ“

نانی اپنی انگلیوں پر پھونک مارتی ہوئی باہر چلی گئی اور نانا نے  
دوسری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے مجھ سے پوچھا: ”تم نے شروع  
سے یہ ماجرا دیکھا؟ یہ بھی دیکھا کہ تمہاری نانی کیسی بہادر ہے؟ یہ نہ بھولو  
کہ اب وہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ خستہ و خراب، تھکی ہاری —

تاہم، دیکھا تم نے؟ . . . ہشت دھت!“

دیر تک وہ ہاتھ پاؤں سمیٹے چپ بیٹھا رہا۔ پھر بتی بجھا کر پوچھا:



”تم ڈر گئے تھے“

”نہیں تو“

”شاپاش! ڈرنے کی کیا بات تھی“

جھلاہٹ سے قیص اُتارتے ہوئے، وہ کونے میں رکھی ہوئی

سلفی کے پاس گیا۔ اندھیرے میں پیر ٹپک کر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا: ”آگ سے بڑی مصیبت کیا ہو سکتی ہے۔ آتش زن کے سرِ بار کوڑے لگنے جاہنیں یا تو وہ بد معاش ہوگا یا امین۔ ایسی سزا دی جائے تو کسی کا ہیا د نہ ہو۔ اچھا، تم بیٹھے کیوں ہو، چلو سو رہو۔“

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن نیند آنکھوں سے کالے کوسوں دُور تھی۔ ابھی میں نے پانو پھیلاتے ہی تھے کہ ایک وحشت ناک چیخ نے میرے حواس باختہ کر دیے۔ میں باورچی خانے کو بھاگا۔ بچوں بیچ نانا ننگے بدن ایک قذیل تھامے کھڑے تھے جس کی لُو اُچھل رہی تھی۔ پانو ٹپک کر وہ پکار رہے تھے:

”بڑی بی! ہاکوف! ارے کیا ہوا؟“

میں تندور کے کونے میں دبک گیا اور از سر نو مکان میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ در و دیوار کو دھلاتی ہوئی ایک کراہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی پھر وہی تماشہ ہوا جو آتش زنی کے وقت دیکھا تھا۔ نانا اور ماموں بے وجہ اُچھلنے کودنے لگے۔ نانی انھیں ہٹا کر اللہ تو بہ کرنے لگی۔ تندور میں لکڑی کے کندے ڈالنے اور کیتلی میں پانی بھرنے میں گرگیزی نے سارا گھر سر پر اُٹھالیا۔ اونٹ کی طرح ڈمکگاتے ہوئے وہ باورچی خانے میں پھدکنے لگا۔

نانی نے ڈانٹ کر کہا: ”تندور میں آگ تو دھکنے دے“ وہ یہ کرنے چلا تو میری ٹانگ سے ٹکرا کر گر پڑا اور گھبرا کر پکارا یہ کون ہے؟ اون ادہ! تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی! جس بروج میں دیکھو چاند شاہ ولی“

”آخر ہوا کیا“

نیچے اترتے ہوئے اُس نے اطمینان سے کہا: ”ہوتا کیا۔ بی تابیہ نے ایک بچہ جن دیا۔“

مجھے یاد آیا کہ میری ماں میرے مرحوم بھائی کی پیدائش کے وقت اتنا نہ جچی چلائی تھی۔

کینٹی آگ پر رکھ کر گری گوری ایک بائپ لیے ہوئے میرے پاس آ بیٹھا اور اسے دکھا کر بولا: ”اس سے میری آنکھوں کو فائدہ ہوگا۔ نانی تو ناس سو ننگنے کو کہتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تنبا کو نوشی سے بنیاتی بڑھتی ہے۔“

پالٹی مار کر وہ تندور کے کنارے بیٹھ گیا اور قندیل کی ٹٹائی ہوئی شعاع کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ دھنویں سے کالا ہو گیا تھا، قیص کی ایک کور بھٹ گئی تھی اور اس سے اس کی چوڑی چوڑی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور اس خلا سے ایک سُرخ اور آب دیدہ آنکھ جھلکنے لگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی زخم کا نشان ہے۔

بائپ میں تنبا کو بھرتے ہوئے وہ کان لگا کر حاملہ عورت کی مدد کا چینیں سننے لگا اور پھر کسی متوالے کی طرح اُکھڑی اُکھڑی آواز

میں بولا: ”متھاری نانی آگ میں ایسی جل بھن گئی ہے کہ اس بپتا کی ماری کو شاید ہی مدد پہنچا سکے۔ سنو تو سہی کہ متھاری ممانی کس طرح کراہ رہی ہے۔ کسی کو اس غریب کی سمدھ ہی نہ رہی تھی۔ آگ لگنے کی دیر تھی کہ وہ درد زہ میں مبتلا ہو گئی۔ خوف کے مارے اس کی یہ حالت ہوئی۔ بچہ پیدا کرنا اپنی جان پر کھیلنا ہے، تاہم عورتوں کی کون پرداہ کرتا ہے! لیکن میرا کہا یاد رکھنا — عورتوں کا خیال پہلے کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ہماری مائیں ہیں۔“

یہ سنتے سنتے میری آنکھ لگ گئی۔ مگر دم بھر میں میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے اور مائیکل ماموں شراب کے نشے میں چورانا پ شناپ بک رہے تھے۔ کوئی یہ بے نیکی الفاظ دوسرا رہا تھا:

”صدر بھانگ کھول دو۔۔۔!“

وہ اسے آدھے گلاس تیل میں اتنی ہی شراب ملا کر دو، اوپر چمچ

بھر کا جل بھی جل کر دو۔“

ادھر مائیکل کسی بیہودہ بچے کی طرح لگاتار کہے جاتا تھا:

”اُسے میں بھی تو ایک نظر دیکھ لوں۔“

زمین پر وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا اور ہاتھ پٹک کر سج میں رہیں

تھوک دیتا تھا۔

تندور خاصا جہنم بن گیا تھا۔ میں بچے کو درکار ماحول کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ دی اور میں منہ کے بل گر پڑا۔

”الو کا پٹھا!“ میں بے اختیار ہچکار اٹھا۔

اس نے اُچھل کر مجھے پکڑ لیا: ”وہ پُختی دوں گا کہ —“  
میں پر آمدے میں شہ نشین کے نیچے چھتے چھتے نانا کے پاؤں تلے  
آ گیا۔ وہ مجھے الگ ہٹا کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا: ”ہم سب پر  
خدا کی مار!“

مورت کا دیا اس کے سر کے اوپر جگمگا رہا تھا، بیچ کمرے  
میں میز پر ایک قندیل سر دھن رہی تھی اور کھر آلود صبح زمناں  
کا اُجالا کھڑکی پر ہویدا ہونے لگا تھا۔

نانا نے مجھ پر جھک کر پوچھا: ”آخر تجھے کیا ہوا ہے؟“

مجھے کیا نہیں ہوا تھا؟ سر بھاری بھاری، جسم تھکان سے چور  
لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا کیوں کہ مکان میں عجیب اذرا تغری ہو گئی تھی۔  
کمرے کی تمام کرسیوں پر اجنبی لدے ہوئے تھے۔ سُرخ لبادے میں  
ملبوس پادری اور فوجی وردی ڈانٹے ہوئے ایک عنیک باز بڑھا  
کئی آدمیوں کے ساتھ یوں دم سادھے بیٹھے تھے گویا یہ ٹوٹے ہوئے  
بُت یا پتھر کی مورتیں ہیں جو کسی کے انتظار میں محو ہیں۔ کہیں پاس  
ہی پانی کے چھڑکاؤ کی آواز پر ان کے کان لگے ہوئے تھے۔ دروازے  
پر جاکوف ہاتھ باندھے تباہ ہوا کھڑا تھا۔ نانا نے اس سے کہا: ”دیکھو  
اس رٹ کے کو سلا آئی!“

ماموں نے مجھے اشارہ کیا اور پنچوں کے بل نانی کے کمرے میں  
داخل ہو گیا۔ جب میں لیٹ چکا تو اس نے کان میں کہا:  
”تیری مانی نتایا مر گئی۔“

مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ عرصے سے اس کی شکل نہ دیکھی تھی۔  
نہ وہ ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ نہ باورچی خانے میں آتی تھی۔  
”نانی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں“ یہ کہتے ہوئے وہ پانو دبائے باہر چلا گیا۔  
لیٹے لیٹے میں دروازے کو تاکنے لگا۔ ایسا لگا کہ کھڑکی سے  
کئی سفید سر اپنی بے بصر آنکھوں سے ادھر دیکھ رہے ہیں۔ گو  
میں جانتا تھا کہ کونے کے صندوق پر نانی کے کپڑے رکھے ہیں لیکن  
اس وقت یہ محسوس ہوا کہ وہاں کوئی زندہ جانور چُپ چاپ کھڑا  
ہوا ہے۔ تکیہ کے نیچے میں نے منہ چھپالیا۔ صرف ایک آنکھ کھلی رہنے  
دی تاکہ دروازے پر نظر رہے۔ بہت جی چاہا کہ کود کر باہر  
بھاگ جاؤں۔ سخت گرمی تھی اور ایک مکروہ بدبو دم گھونٹ رہی  
تھی جو مجھے اس رات کی یاد دلانے لگی جب سنگوک مرا تھا اور  
اس کا خون دروازے پر جم گیا تھا۔

میرے دل یا دماغ میں کوئی چیز بچ و تاب کھانے لگی۔ اس  
مکان کے سارے تاثرات گاڑیوں کی ایک لمبی قطار کی طرح میرے  
آگے آگئے اور گویا میں ان کے نیچے کُچل گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اسے کانڈھے سے بند کر کے نانی  
قریب آئی۔ چراغ کے آگے ہاتھ پھیلا کر وہ بچوں کی طرح ہلکا ہٹھی۔  
”ارے میرا ہاتھ! اس میں کتنا سخت درد ہے!“

## باب ۵

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک تازہ مصیبت کا سامنا ہوا۔ شام کو چائے ختم کر کے میں نانا کے ساتھ کتابِ زبور کا ورد کر رہا تھا اور نانی برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اتنے میں جاکوٹ حیران و پریشان کمرے میں گھس پڑا۔ اس کے بال تو ہمیشہ بکھرے رہتے تھے لیکن اس وقت اس کی شکل اور جھاڑو میں کوئی فرق نہ تھا دعا سلام کے بغیر ٹوپی کونے میں پھینک کر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں تیزی سے بولنے لگا:

”مائیکل نے خواہم خواہ کا ہنگامہ مچا رکھا ہے! میرے ساتھ کھانا کھانے کے بعد وہ اتنی شراب پی گیا کہ اب اپنے آپے میں نہیں ہے۔ برتن بھانڈے تو ڈیسے، کھڑکی چور چور کر دی اور کچھ مال کا ستیاناس کر کے اس نے مجھے اور گری گوری کو خوب گالیاں دیں۔ اب وہ آپ کی خبر لینے کے ارادے سے یہاں آ رہا ہے۔ وہ ہکا بھکا کر کہہ رہا ہے: ”میں آبا کی ڈاڑھی نوچ کر رہوں گا۔ آج ان کی جان نہ چھوڑوں گا۔ اب آپ اپنی خیر منائیے۔“

نانا بے مشکل اُمٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ منیر پر تھے ماتھے پر چھت پڑ گئی تھی، چہرہ سوکھ کر لہبا ہو گیا تھا اور اس میں رحم کا نام

بھی نہ رہا تھا۔

نانا نے گلا پھاڑ کر کہا: ”بڑی بی کچھ سنا؟ اب کیا کہتی ہو؟  
بیٹا باپ کو قتل کرنے آ رہا ہے! پیسے ہی، مجھے اب مرجانا چاہیے“  
وہ تن کر کواڑ تک گیا اور اس سے لوہے کی ارگل اُتار لی  
اور جاکوف کو مڑ کر دیکھا: ”یہ تماشا اس لیے رچایا گیا ہے کہ اپنی بہن  
کے جہیز پر قبضہ کر لو۔ کیوں؟“

اور وہ جاکوف کے مُنہ پر حقارت سے ہنسنے لگا۔ یہ جھلا کر  
بولاً: ”مجھے اس سے کیا کرنا ہے؟“

”ارے تو؟ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں“

برتنوں کو جلد جلد ہٹاتے ہوئے نانی خاموش رہی۔

نانا نے تلخی سے قہقہہ لگایا: ”بیٹا، شکریہ تمہارا! بہت خوب؛  
بڑی بی، اس بھیڑیے کو لوہے کی ایک چھڑ تو دینا۔ جاکوف، میں  
چاہتا ہوں کہ جب تیرا بھائی یہاں آئے تو تو اُسے قتل کر دے!“  
ماموں جیب میں ہاتھ ڈال کر کوٹنے میں لپٹنے لگا:

”اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو خیر۔“

نانا نے پیر پٹک کر کہا: ”تجھ پر اور اعتبار! — نہیں،

میں کسی کُتے یا سانپ پر یقین کر لوں گا لیکن تجھ پر ہرگز نہیں!  
میں تجھے پہچانتا ہوں۔ تو نے اسے شراب پلا کر یہ سب گڑ سکھائے  
ہیں۔ اچھا اب تو چاہتا کیا ہے؟ مار ڈال — اسے یا مجھے، دونوں

میں سے ایک کو!“

نانی نے میرے کان میں کہا: ”ادھر جا کر کھڑکی سے دیکھنا۔“

جیسے ہی مائیکل سٹرک پر نظر آئے دوڑ کر خبر کر دینا چل بھاگ! اپنے بد معاش ماموں کے حملے کے خوف سے میں ڈرا ہوا تو تھا لیکن اپنے فرض کی اہمیت کا فخر بھی تھا۔ کھڑکی سے میں سٹرک کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پر گرد کی ایسی موٹی تہ چڑھ گئی تھی کہ کچھ دیکھنا آسان نہ تھا۔ باتیں جانب سٹرک دور تک چلی گئی تھی۔ پلہا سے ہو کر وہ بڑے چوک تک نکل گئی تھی اور وہاں ایک پرانی عمارت اپنے چار میناروں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ دراصل یہ پڑانا قید خانہ تھا اور اس میں اب تک غم آشنا سن کی شان باقی تھی۔ داہنی سمت، صرف تین مکانوں کے بعد چھوٹا چوک نظر آتا تھا۔ یہ جیل کے افسروں کی بارک کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے بیچ میں ایک آتش مینار تھا جس کے جھروکے سے سنتری بندھے ہوئے کتوں کی طرح تাকা کرتے تھے۔ پلہا اور اس چوک کے بیچ میں ایک طرف چھوٹی سی جھاڑی اور دوسری طرف اُس اندھی باؤلی نے فصل پیدا کر دیا تھا جس میں سیری نانی کی روایت کے مطابق دونوں ماموں نانا کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ ہماری کھڑکیوں کے سامنے ایک چھوٹی سی گلی تھی جو ”تین چاری“ نامی تنگ و تاریک کلیا تک جاتی تھی۔ سیدھے دیکھو تو اس کی چھت پر اوندھی کشتی کا گمان ہوتا تھا جو باغ کی سبز موج نما روش پر پڑی ہوئی ہو۔ جاڑے کے برفانی طوفانوں اور برسات کی بھرپوں نے ہمارے محلے کے بیرنگ مکانات کو مت میلا بنا دیا تھا۔ کلیا کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے بھکاریوں کی طرح وہ ادھ لھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور



معلوم ہوتا تھا کہ میری طرح وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی کھڑکیوں تک سے شک و شبہ کی بو آتی تھی۔

سڑک پر چند سیلانی یوں سڑگشت کر رہے تھے گویا متفکر تل چڑے  
تندور پر چل رہے ہوں۔ اتنے میں گرمی کا ایسا بھسکا آ یا کہ دم گھٹنے  
لگا۔ دراصل یہ پیاز اور گاجر کی بو تھی جو پتیلی سے نکل کر مجھ تک آ گئی  
تھی۔ اس بو سے ہمیشہ میری طبیعت متلا جاتی تھی۔

ایسی وحشت ہونے لگی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یہ معلوم ہوا کہ سینہ  
گرم گرم سیسے سے بھرا ہوا ہے اور یہ سبلی توڑ کر باہر نکل رہا ہے۔ ایسا  
لگا کہ میں پھول کر غبارہ ہو گیا ہوں۔ مگر دیکھا تو میں صحیح سلامت اس  
تابوت نما کوٹھری میں چوں کا توں دھرا ہوا تھا۔

آنکھ اٹھائی تو ماموں مائیکل نظر آئے۔ یہ حضرت مکانوں کی  
آڑ میں چھپ کر کھڑکی کی موڑ سے جھانک رہے تھے۔ اپنی ٹوپی سے  
کان چھپانے کا لاکھ جتن کرتے لیکن وہ پھر اُبھر آتی تھی۔ وہ ایک  
بھوری صدری اور ایک گرد آلودہ بوٹ ڈانٹے ہوئے تھے۔ ایک  
ہاتھ پتلون میں تھا اور دوسرا ڈاڑھی کی بلائیں لے رہا تھا۔ ان کا  
چہرہ تو نظر نہ آتا تھا لیکن تیور کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی نانا کے مکان  
کو اپنی سٹھی میں واپس گئے۔ مجھے نیچے دوڑ کر اس کی آمد کی اطلاع  
دے دینا تھا لیکن میں ہکا بکا کھڑکی کے پاس کھڑا رہا، اس وقت  
تک جب کہ مائیکل نے بوٹ کی گرد جھاڑنے کے لیے پانوں نہ ٹپک لیے  
اور سڑک کے اس پار نہ آگیا۔ اس نے سینانے کا دروازہ اس زور  
سے کھولا کہ وہ چوں بول گیا اور شیشے ٹکرا گئے۔ میں فوراً دوڑا اور

نانا کی کوٹھری کھٹ کھٹائی۔

اس نے ڈانٹ کر پوچھا: ”کون ہے؟“ اچھا تو ہو، کیا خبر ہے؟

”وہ کھار کی دوکان میں داخل ہوئے ہیں“

”ہوں . . . خیر، تو اپنی جگہ پر مستعد رہ“

”لیکن مجھے وہاں ڈر لگتا ہے“

”تو کیا کیا جائے“

میں پھر اپنے پہرے پر ڈٹ گیا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ سڑک  
دھول سے پٹ کر بالکل کالی ہو گئی تھی۔ آس پاس کی کھڑکیوں سے  
روشنی کی کرنیں نکلا آئی تھیں۔ اور سامنے کے گھر سے کسی باجے کی  
درد انگیز مگر دل کش آواز آ رہی تھی۔ موکلے میں بھی گانا ہو رہا تھا  
دروازہ کھلتا تھا تو ایک نحیف و نزار صدا تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ میں  
سمجھ گیا کہ یہ اُس لنگڑے فقیر کی آواز ہے۔ اس ڈھیل بڈھے کی ایک  
آنکھ مصنوعی تھی اور دوسری کو وہ ہمیشہ بند رکھتا تھا۔ دروازہ بند  
ہوتا تو یہ گمان ہوتا کہ کسی نے کھٹائی سے اس کے گیٹ کے دو  
ٹکڑے کر دیے۔

نانی کو اس فقیر سے ایک قسم کا رشک تھا۔ اس کے گیت سن کر  
وہ سانس بھر کر کہا کرتی: ”اے کہتے ہیں کمال! اے کتنے گیت بربان  
ہیں۔ خدا داد بات ہے۔“

کبھی کبھی وہ اسے آنگن میں بلالاتی۔ سیڑھی پر بیٹھ کر یا تو وہ  
کاتا یا کوئی داستان پھیڑ دیتا۔ نانی پاس بیٹھی بڑے غور سے سنتی  
اور بیچ بیچ میں اسے ٹوک دیتی:

”پھر کیا ہوا . . . . تو کیا حضرت مریم رؤس بھی آتی تھیں؟“  
 اور وہ بڑے یقین سے جواب دیتا: ”ان سے زمین کا کوئی کونا چھوٹا ہوا“  
 ایک نامعلوم خواب آور تکان کی سی کیفیت مجھے نڈھال کر دیتی  
 تھی اور اس کا بوجھ دل و نظر کو جھکانے لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس  
 کاش نانی نہیں تو نانا ہی میرے پاس آجائیں۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ  
 میرے آبا میں ایسی کون سی بات تھی کہ میرے ماموں اور نانا اسے  
 ناپسند کرتے ہیں لیکن نانی اور گری گوری اس کی تعریف کرتے ہیں  
 اور میری ماں کہاں ہو؟ اب میں روز اسے یاد کرتا تھا اور نانی  
 نے جتنی کہانیاں سنائی تھیں وہ ان کا مرکز بن گئی تھی۔ اس وجہ سے  
 اس کی عزت میرے دل میں دوبالا ہو گئی کہ اس نے اپنے کہنے میں  
 رہنما گوارا نہیں کیا۔ میرے تخیل میں وہ رہنروں کے ساتھ کسی سرانے  
 میں رہتی تھی اور یہ سب امیر راہ گیروں کا مال چھین کر غریبوں میں  
 بانٹ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جنگل میں شریف ڈاکوؤں  
 کے ساتھ رہتی ہو اور ان کا گھر بار دیکھنے کے علاوہ مال اسباب کی  
 حفاظت کرتی ہو۔ یہ بھی عجب نہیں کہ وہ زمین دوز خزانوں کی چھان  
 بین میں دنیا کا سفر کر رہی ہو۔ ڈاکوؤں کی سردار انگلی چیپ  
 کی طرح جو مریم کے ساتھ پھرا کرتی تھی اور بہت ممکن ہو کہ مریم اسے  
 بھی یہی نصیحت کرے:

”ارمی او مت ماری بد ذات، ذرا کچھ میری بات بھی مان!

لوٹ لوٹ کر جوڑ جولی سونے روپے کی کان!

تھوڑے دن کے عیش کی خاطر یہ سب کیا جنجال!

تیری ہوس کو دیکھ دیکھ کر دُنیا ہی بد حال !  
 اس کے جواب میں اسی ڈاکنی کے الفاظ میں میری ماں کہے گی :  
 ” حضرت مریم معاف کرو میری بھی کچھ عرصہ سنو  
 ایک ہی بچہ چھوٹا سا ننھا سا اور مٹا سا  
 اس کی خاطر چور ہوں میں ماں ہی ہوں — مجبور ہوں کیا“  
 اور مریم جو نانی کی مانند نیک دل تھی اسے معاف کر کے یہ نصیحت  
 کرے گی :

”بخشش کے لیے تیری سولی پہ چڑھا عیسیٰ  
 کچھ دھیان رہے اس کا اوسنگِ دل انگلی شا  
 مغلوں کو اگر لوٹو تو پوری ہی آزاد می  
 کافر کی موت — واللہ یہ ہی نوید شادی  
 روسی کا مگر ہرگز ہووے نہ بال بیکا !“

اس قصے کی یاد میں میں ایسا ڈوب گیا گویا یہ کوئی سُپنا ہو  
 میں یہ خیالی پلاؤ پکا ہی رہا تھا کہ نیچے آنگن کی طرف سے مار پیٹ  
 اور چیخ پکار کی آواز آئی۔ کھڑکی سے بھانک کر دیکھا کہ نانا، ماموں  
 جاکوٹ اور شراب خانے کا نوکر میان، سب مل کر مائیکل کو باہر نکال  
 رہے ہیں۔ وہ دار کرنے سے نہ چوکتا تھا لیکن ان تینوں نے مار مار کر  
 اس کا پچھر نکال دیا تھا۔ بالآخر وہ دروازے سے نکل کر منہ کے بل  
 سڑک پر جا گرا۔ دروازہ بند ہو گیا اور اس میں اندر سے زنجیر چڑھ گئی  
 اس ہنگامے کی یاد دلانے کے لیے ایک پھٹی پرانی ٹوپی سڑک پر پڑی  
 رہ گئی۔ پھر چار سوسٹاٹا چھا گیا۔

کچھ دیر بے حرکت پڑے رہنے کے بعد میرا ماموں اُٹھ کھڑا ہوا اس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے اور جسم لہلہاں تھا۔ ایک بھڑاٹھا کر اس نے زور سے دروازے پر دے مارا۔ اس کے جواب میں نثار بچا کا گروہ گالی بکتا اور آستین چڑھاتا ہوا سڑک پر جھپٹ پڑا۔ اس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں پر سرسری سرنودار ہو گئے۔ سڑک پر ہنسنے بولنے آدمیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ یہ سب کسی قصے سے کم و بیش نہ تھا اور ساتھ ساتھ عبرتناک بھی تھا۔ ایک بیک سارا تماشہ ختم ہو گیا۔ آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ اور ہر چیز آکھ اوجھل ہو گئی۔

x x x x x x x x x

کواڑ کے پاس ایک صندوق پر نانی دم سا دمے ٹھکی ہوئی مٹی قریب جا کر میں اس کے گرم و گداز گالوں کو پھلنے لگا۔ لیکن اسے اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں لگاتار بدبانے لگی: ”خدا! کیا میں اور میرے بچے تیری رحمت سے محروم ہی رہیں گے؟ رحم کو رحم!“

اس مکان میں نانا کو آٹے سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن اسی عرصے میں اس کی ہنگامہ پروری کا چرچا پھیل گیا تھا۔ ہر اتوار کو ہمارے گھر کے آگے محلے کے لونڈے یہ چلاتے ہوتے جمع ہو جاتے تھے: ”مکشرن کے گھر میں پھر مار پٹائی ہو رہی ہو!“

مائیکل اکثر شام کو آتا تھا اور رات بھر مکان کا محاصرہ کیے رہتا تھا۔ ہم سب کی جان ضیق میں پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ دو تین ذلیل غنڈوں کو اپنی کمک پر لے آتا تھا۔ یہ چپ چاپ باغ میں

گھس آتے تھے اور شراب کے نشے میں ساری کیاریوں کو نوچ ڈالتے تھے۔ کبھی وہ دھوبی گھر پر دھاوا بول دیتے اور جو چیز سامنے آتی اسے توڑ ڈالتے تھے۔ کیتلی، تندور، فرش، دروازے کی چوکھٹ۔ غرض کہ ہر چیز ان کے لیے برابر تھی۔

نانا بے زبان ویسے حرکت کھڑکی کے پاس کھڑے ان غارت گردوں کی حرکت کو دیکھا کرتے تھے۔ لیکن نانی اندھیرے کونے سے نکل کر آنکھ میں جاتی اور گرد گڑا کر کہتی: ”مائیکل تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

اس کے جواب میں وہ درندہ پا محل کُتے کی طرح بوکھلا کر نہایت فحش گالیاں دینے لگتا تھا۔ اسے اپنے کہے کرے کا ذرا بھی ہوش نہ تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس موقع پر نانی کا بیچا نہ پکڑنا چاہیے لیکن تنہائی سے گھبرا کر میں نانا کے کمرے میں دبک جاتا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ پڑتا، ”صورت حرام! بھاگ یہاں سے!“

دوڑ کر میں اوپر کی کوٹھری میں چڑھ جاتا تھا اور روشن دان سے جھانک کر باغ میں نانی کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس خوف سے کہ یہ بچے اسے کہیں مار نہ ڈالیں، میں رد رو کر اسے بلاتا تھا مگر وہ نہ آتی تھی۔ البتہ میرا شرابی ماموں میری آواز پہچانتے ہی میری ماں کو گندی گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے۔ نانا کی طبیعت ناساز تھی اس کا سر بھیٹے ہوئے تویے میں پٹا ہوا تکیے پر بے چینی سے ہل رہا تھا اور

وہ آہ بھر کر یہ کہتا جاتا تھا:

”اسی دن کے لیے میں نے گناہوں اور روپیوں کا انبار لگایا تھا! جگ ہنسائی کا خیال نہ ہوتا تو میں پولیس میں ریپٹ کر کے کل اسے ہندھوا دیتا۔ لیکن دُنیا کیا کہے گی! یہی ناکہ باب بیٹے پر مقدمہ چلا رہا ہے، خون سفید ہو گیا ہے۔ ارے بھائی، خون کا گھونٹ پی اور یہ سب سہہ جا!“

لیکن اچانک وہ پلنگ سے کود کر لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس گیا: ”ارے مائیکل! ڈاکو! پاگل کتے!“

یہ کہنے کی دیر تھی کہ کھڑکی کا اوپری شیشا تراخ سے چکنا چور ہو گیا اور پتھر تانی کے پاس کی میر بڑبڑ سے گر پڑا۔ نانا گلا پھاڑ کر چلا یا: ”ارے میرا سر کس دن کے لیے باقی رکھا؟“

نانی نے بچے کی طرح اسے گود میں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بار بار یہ دوہرانے لگی:

”تمہارے دل میں کیا سمائی ہے؟ خدا تم پر رحم کرے! جانتی ہوں کہ اس کی قسمت میں کالا پانی لکھا ہے۔ کمبخت کو اس کا ہوش بھی نہیں کہ کالا پانی کیا چیز ہے۔“

غصے کے مارے پانوٹنگ کر اور سُبکیاں بھر کر، رُندھی ہوئی آواز میں نانا نے کہا: ”میرا خون اس کی گردن پر —“

باہر دیوار پیٹنے اور چیخنے چلانے کا شور ہو رہا تھا۔ میر سے وہ

پتھر اٹھا کر میں کھڑکی کی طرف پکڑا ہی تھا کہ نانی نے مجھے پکڑ کر کونے کی طرف دھکیل دیا: ”شیطان کہیں کا“

ایک مرتبہ مائیکل ایک لائٹھی لیے ہوتے غلام گردش میں گھس آیا اور سیڑھی پر چڑھ کر دروازہ توڑنے لگا۔ لیکن ادھر نانا پہلے سے ڈنڈا لیے اس کی خاطر کو مستعد تھے اور اس کی کمک پر دو سونے باز کرائے دار بھی موجود تھے۔ کلہار کی بیوی بھی سبلن لیے تیار کھڑی تھی نانی پنچے دبائے نانا کے پاس کھڑی خوشامد کر رہی تھی: ”مجھے تو اس کے پاس جانے دو! میں اسے سمجھا لوں گی۔“

نانا ایک پانچو بڑھائے اس پیرے سے کھڑے تھے کہ بھالو کا شکار نامی تصویر کا خیال آتا تھا، جس میں ایک شکاری اسی انداز سے بھالو تانے کھڑا تھا۔ نانا نے بنا کچھ کہے کہنی سے اسے پیچھے دھکیل دیا چاروں کمرے کھڑے ہوئے تھے۔ طاق پر ایک چراغ ٹٹا رہا تھا اور اس کی دھندلی جوت ان کے چہروں پر ایک بلکی روشنی ڈال رہی تھی۔ سب سے اوپر کی سیڑھی سے میں یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں منا رہا تھا کہ نانی یہاں آجائے۔

ماموں نے دروازہ توڑنے میں تو بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک پٹ چوکت سے الگ ہو گیا تھا اور دوسرا بھی چرمرانے لگا تھا۔

نانا اپنے مددگاروں سے یہی کہے جاتے تھے: ”بھیا ہاتھ پائو کی جا ہے جو گت ہو لیکن اس پائل کی کھوپڑی پر ہاتھ نہ پڑے۔“ اس دروازے کے قریب ایک چھوٹا سا جھروکا تھا جس سے بہ مشکل سر باہر جاسکتا تھا۔ مائیکل نے اس کے شیشے توڑ دیے تھے اور وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی شکل میں کسی کی سوچی ہوئی آنکھ سے ہلتا جلتا تھا۔ نانی نے بے سوچے سمجھے اس میں سے سر نکال کر چیخ کر کہا:





”جو وہ مانگتے ہیں دے دو“

”اور لڑکی کا کیا ہو گا؟“

دیر تک وہ اس معاملے پر بحث کرتے رہے۔ تانی عاجزی اور ملال سے تانا غصہ سے اور طیش سے۔

اتنے میں ایک پتہ قد بڑی بڑھیا اندر آئی۔ اس کا دہانا ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلا ہوا تھا، منہ مچھلی کی طرح کھلا تھا۔ نچلا جبر کا نپ رہا تھا اور ہونٹ پر ایک نیکیلی ناک دھری ہوئی تھی۔ آنکھوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کی برساتی نو جنبش کرتی تھی لیکن پاؤں کی حرکت کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بچہ تھا جو کھڑکھڑاتا جاتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ نانی کی جان لینے آئی ہے۔ میں اس پر ٹوٹ پڑا اور گلا پھاڑ کر چلایا ”نکل جا یہاں سے!“  
نانا نے بے ہری سے مجھے پکڑ لیا اور نیکی چتونوں سے گھورتے ہوئے اوپر لے جا کر بند کر دیا۔

## باب ۶

آند بہار کے ساتھ دونوں ماموہوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ جاکون شہر میں رہا اور مائیکل نے ندی کنارے ڈیرا ڈالا۔ ادھر نانا نے ایک کشادہ اور آرام دہ مکان خرید لیا۔ پہلی منزل میں ایک شرب خانہ تھا۔ اوپر کئی چھوٹے چھوٹے آسائش بخشنے والے باغ بھی تھے جو پلایا تک پھیلا ہوا تھا اور بید مجنوں کی بے برگ شاخوں سے لہلہا رہتا تھا۔ باغ میں ہٹل کر جب میں نانا کے ساتھ صاف و سادہ سڑک پر آیا تو اس نے اپنی شریہ اور مبسم آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا: ”تیرے بے بیدوں کی کمی نہیں ہے! اب میں خود تجھے سبق دوں گا اور یہ بیدیں خوب کام آئیں گی۔“

ہمارا گھر کرایہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ صرف اوپر کی منزل میں ایک کمر نانا کی خواب گاہ اور میٹھک کے کام آتا تھا اور دوسری کو کھڑی میں میں نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ شام کو یا چھٹی کے دن اس سے جھانک کر دیکھو تو متالے جھومتے جھومتے، گاتے بجاتے ہوئے سے باہر نکلنے نظر آتے تھے کبھی وہ سامان کی بوری کی طرح سڑک پر پھینک دیے جاتے تھے اور اُٹھ کر پھر اندر جانے کی کوشش کرتے تھے۔ دروازہ ان کی چوٹوں سے

کراہتے لگتا تھا اور دھینگا مٹتی شروع ہو جاتی تھی۔ یہ سارا تماشا  
پُر لطف تھا۔

نور کے تڑکے نانا اپنے بیٹوں کے کارخانوں کا راستہ پکڑتے تھے  
اور دن بھر انھیں کاروبار کے گڑ سکھاتے تھے۔ شام کو وہ لوٹتے  
تو تمکان سے چور اور غصے سے بھرے ہوتے ہوتے تھے۔  
نانی کی کھڑ پٹر دن بھر جاری رہتی تھی۔ کھانا، سینا، کبھی  
باورچی خانے میں تو کبھی باغ میں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کولہو کا میل  
ہر جو کسی کوڑے کے ڈر سے چکڑ لگا رہا ہے۔ چہرے سے ہینہ پونچھ کر  
وہ ہر دفعہ کہا کرتی: ”جو دن بیت گئے ان کو ہزار سلام! اولیسا  
بیٹے اب ہماری زندگی کس خوشی اور اطمینان سے گزر رہی ہے؟  
خدا کی لاڈلی، یہ سب تیرے دم کا ظہور ہے!“

لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس قسم کا اطمینان ہے کیوں  
کہ صبح سے شام تک کرائے دار شور مچاتے اوپر نیچے اندر باہر آیا  
جایا کرتے تھے اور اس طرح پڑوس کا حق ادا کرتے تھے۔ بظاہر  
تو وہ بڑی جلدی میں ہوتے تھے لیکن واقعتاً ہمیشہ پھٹی رہتے تھے  
ان کی شکایت کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا تھا اور وہ رہ رہ کر نانی  
کو ہچکا کرتے تھے، ”اجی بڑی بی! اکولنا اوانووا!“

اور بڑی بی جگت نانی بنی ہوئی تھیں۔ وہ سب کی مشیر کار  
تھیں۔ جواب دینے سے پہلے وہ ناس سونگھ کر اپنی ناک اور انگلیوں  
کو احتیاط سے سُرخی رومال میں پونچھ لیتیں: ”بھبھا، پتو سے پھٹکارا  
جاہتے ہو تو روز نہاؤ اور اگر پتو جسم سے چپک گئے ہیں تو چچ بھر

گندھک میں اتنی ہی چربی ملاؤ اور تین رتی پارے میں مل کر کے ان تینوں چیزوں کو لہسن کے عرق میں ڈالو اور کوری ہنڈیا میں سات مرتبہ جوش دو پھر اسے مرہم کی طرح استعمال کرو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ لکڑی یا ہڈی کا چمچ لگایا تو بارہ ضایع جائے گا اور پتیل یا چاندی کے چمچ سے چھوا تو نقصان دے گا۔

کبھی بڑے غور و فکر کے بعد وہ یہ جواب دیتی تھی: ”بھئی مجھے اس معاملے میں دخل نہیں۔ تم چوک والے حکیم جی سے پوچھ آؤ۔“

وہ دائمی کام بھی انجام دیتی تھی اور گھریلو جھگڑوں میں پہنچ بن جاتی تھی۔ بچوں کے امراض میں اسے بڑا دخل تھا۔ اور جب وہ حضرت مریم کا درود سنایا کرتی تو عورتیں اسے فوراً بر زبان کر لیتیں گرہستی کے معاملات میں مشورہ دینے کو وہ ہمیشہ مستعد رہتی تھی: ”کدو خود خبر کر دیتا ہے کہ کب اسے توڑنا ہے۔ جب وہ زمین پر گر کر ایک خاص قسم کی بو دینے لگے تو سمجھ جاؤ کہ اسے توڑنا ہے۔ . . . . نہ ہی جمانے کے مختلف طریقے ہیں۔ . . .“

دن بھر میں اس کا دم چھللا بنا کبھی باغ یا آنگن میں اور کبھی پڑوسیوں کے یہاں پھرا کرتا تھا۔ وہاں وہ گھنٹوں بیٹھی چائے پیتی اور بھانت بھانت کے نفعے سنایا کرتی تھی۔ میں گویا اس کے جسم کا ایک حصہ بن گیا تھا اور زندگی کے اس دور میں اس بہادر بوڑھیا کی یاد سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہ کبھی دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے نہ چوکتی تھی۔

اس زمانے میں کسی نامعلوم مقام سے میری ماں چند گھڑیوں



لیکن جیسے ہی جبرائیل عصا ہلا کر سردیوں کو بھگا دیتا اور دنیا کو بہار پوش کر دیتا، ہم دونوں پھر اپنی نا معلوم منزل کو روانہ ہوتیں اور جڈمیر سینک سماتا چل کھڑی ہوتیں۔ ہم نے کئی شہروں کی خاک چھانی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ بہار اور گرمیوں میں سفر کا لطف ہے، جب زمین مسکراتی ہے اور گھاس مغل بن جاتی ہے، خدا کی ماں کھیتوں کو مین چین کر دیتی ہے۔ ہر برگ و شجر شادی کا پیامی ہوتا ہے اور دل سے دو بدو ہم کلام ہوتا ہے۔ جب ہم کسی پہاڑی پر چڑھتیں تو ماں گانے لگتی۔ اس کی آواز میں زور تو نہ تھا لیکن وہ گھنٹی کی طرح صاف تھی اس کے گیت سنو تو یہ لگتا کہ ہر ذرہ گہری نیند سو گیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ زندگی کتنی سہانی تھی۔

”ابھی میں نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ اماں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اگر لڑکی بھیک مانگتی پھری تو دنیا اسے دشنام دے گی اُسے اس زندگی پر شرم آنے لگی۔ وہ بالا خانے میں رہ پڑی اور گھر گھر جا کر بھیک مانگنے لگی۔ اتوار کو اور کسی تیوہار کے دن وہ گرجا گھر کے آگے کھڑی ہو جاتی اور خیرات مانگتی۔ میں گھر میں زردوزی کا کام سیکھتی۔ مجھے اپنی ماں کی بدد کا بڑا خیال تھا، اسی لیے یہ کام میں نے جلد سیکھ لیا۔ مگر کبھی کبھی کوئی نقشہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا اور میں رونے لگتی تھی۔ لیکن اس کم عمری کے باوجود دو سال میں میرا ہاتھ ایسا جم گیا کہ سارے شہر میں میری ہنرمندی کا چرچا ہونے لگا۔ جب کسی کو واقعی سچے کام کی ضرورت ہوتی تو وہ ہمارے گھر آتا اور کہتا: اکو لینا، دکھاؤ تو اپنا کمال! میری مسرت کی انتہا نہ رہتی تھی۔“

وہ دن بھی کیسے اچھے تھے۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ اماں کا کام تھا۔ کیوں کہ ایک ہاتھ نہ ہونے سے کیا ہوا وہی میری اُستاد تھیں اور ایک ہوشیار اُستاد دس کاری گروں پر بھاری ہے۔

”میں نے اتر کر کہا: اچھی اُمی اب آپ بھیک پر لات مارے میں اتنا کما سکتی ہوں کہ دونوں مزے سے رہ سکیں۔ لیکن اس نے جواب دیا: یہ نہ ہو گا۔ تمھاری کمائی تمھارے جہیز کے لیے جمع رہے گی۔“

”تھوڑے عرصے بعد تمھارے نانا سے ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی ہائیس سال کی ہی عمر میں وہ آزاد کشتی راں ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ کی مجھ پر خاص شفقت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہنرمند ہونے کے علاوہ میں بھکاری کی بیٹی ہوں اور اس کی دھولس سہ لوں گی — وہ بڑی پدمراج اور بد نیت تھی، لیکن گڑے مُردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ — بُرے لوگوں کا ذکر ہم کیوں کریں۔ خدا انہیں دیکھتا اور پکھتا ہو اور صرت شیطان ان سے محبت کرتا ہے۔“

اور وہ کھل کھلا کر یوں ہنستی تھی کہ اس کی ناک سُکڑ جاتی تھی اور اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی مُسکراتی ہوئی آنکھیں مجھ پر مہر و محبت کی بارش کرنے لگتی تھیں۔

x x x x x x x

مجھے ایک خاموش شام کا خیال آتا ہے جب میں نانا کے کمرے میں نانی کے ساتھ جائے بی رہا تھا۔ نانا کی طبیعت خراب تھی اور وہ لباسِ شب میں کاندھے پر ایک چوڑا سا تولیہ پیٹے پینے میں غرق رہا تھا۔ اس کی سبز آنکھیں دُھندلی ہو گئی تھیں، چہرہ اسفید اور



سو جا ہوا تھا۔ چھوٹے اور نیکیلے کان سُرخ پڑ گئے تھے اور اس نے چائے کی پیالی کے لیے جو ہاتھ پھیلا دیا وہ کانپ رہا تھا۔ اس کا انداز اتنا نرم پڑ گیا تھا کہ وہ کوئی دوسرا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چڑچڑے بچوں کی طرح چل کر وہ بولا: ”میری چائے میں شکر کیوں نہیں ہے؟“ نانی نے ملائت سے کہا: ”شہد ڈال دیا ہے، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔“ سانس روک کر اس نے ایک گھونٹ میں گرما گرم چائے غٹاٹ

پی لی اور کہا: ”اگر اس بار میں مر نہ جاؤں تو نام بدل دینا۔“  
 ”کیسی باتیں کرتے ہو؟“ دیکھو میں تمہیں ابھی چنگا کیے دیتی ہوں۔  
 ”باتیں بنانے سے کیا حاصل؟ لیکن اگر میں اس موقع پر مرا تو زندگی کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“  
 ”اچھا باتیں نہ کر، چپ رہو۔“

آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گیا، اپنے بے رنگ ہونٹوں کو چاٹنے لگا اور انگلی سے دائرہ میں کنگھی کرنے لگا۔ لیکن اچانک وہ یوں بدک پڑا گویا کسی نے کانٹا چبھا دیا ہو اور زور زور سے اپنے دل کا راز بیان کرنے لگا: ”مائیکل اور جاکوف کو جلد از جلد شادی کر لینا چاہیے۔ خاندان کا بار ذمہ داری کا احساس پیدا کر دینا ہے۔ کیوں جی تمہاری کیا رائے ہے؟“ پھر وہ شہر بھر کی کوناری ٹرکیوں کے نام گنانے لگا۔

لیکن پو در پو چائے کی پیالیاں خالی کرتے ہوئے نانی چپ رہی۔ میں کھڑکی سے شفقِ شام کا نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان سُرخ سے سُرخ تر ہونا گیا اور سامنے کے مکانات کے جھروکوں پر اس کا

خونیں پرتو نظر آنے لگا۔ کسی گناہ کی پاداش میں نانا نے مجھے باغ  
یا دالان میں قدم رکھنے کی مانعت کر دی تھی۔ جن کے پیروں پر  
بھونٹے پر بھاڑ رہے تھے، بازو کے آگن میں ایک مزدور کام کر رہا  
تھا اور کہیں قریب ہی کوئی چھری تیز کر رہا تھا۔ پیروں کے جھرمٹ کی  
آڑ سے اور پلپا کی اوٹ سے بچوں کا شور آ رہا تھا۔ یہ سب آوازیں  
مجھے پاس بٹا رہی تھیں اور جھٹپٹے کا سماں میرے دل میں غم گھول رہا تھا۔  
یکایک نانا نے کسی کونے سے ایک نئی کتاب نکال کر زور  
سے ہاتھ پر ماری اور کڑک کر مجھے پکارا۔

”جل بے بد معاش اور آلا۔ یہ ہی پہلی کتاب۔ یہ ہی الف ،  
میرے ساتھ دوہراتا جا۔۔۔ الف ب پ

”یہ کیا ہے؟“

”ب“

”ٹھیک اور یہ؟“

”ب“

”غلط، یہ ہی ت۔ اچھا آگے چلو۔ ج پ ح“

”یہ کیا ہے؟“

”ج“

”شاباش ! اور یہ؟“

”ج“

”ٹھیک اور یہ؟“

”ب“

نانی نے بات کاٹ کر کہا: ”بڑے میاں تمہیں آرام کرنا چاہیے“  
 ”آخر اس سے میل کیا بگڑتا ہے۔ جی بھلتا ہے اور خیال بٹتا ہے۔  
 چل الکی آگے پڑو“

اپنا گرم اور گھٹلا ہاتھ اس نے میری گردن میں ڈال دیا اور  
 حروف کو گویا میرے شانوں میں کو پختہ لگا۔ اس کے منہ سے سر کے  
 کی بو آ رہی تھی اور اس پر طرفہ کچھ پیاز کی بدبو تھی۔ میل تو دم گھٹنے  
 لگا۔ ادھر اس کا غصہ بھرک پڑا اور وہ میرے کان میں چیخنے لگا:  
 ”سش! ان آوازوں سے تو میں آشنا تھا لیکن ان کی شکلیں میرے  
 لیے انوکھی تھیں۔ کوئی حرف مکرڑی سے ملتا تھا تو کوئی گری گوری  
 کے کاندھے سے اور ایک پر تو یہ گمان ہوتا تھا کہ میں نانی کے ہاتھ  
 میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ نانا جان تمام حروف  
 میں مشترک ہیں۔“

اس نے بیسیوں بار مجھے سبق رٹایا، کبھی تو سلسلے وار اور کبھی  
 بے سلسلہ۔ اس کی گرم مزاجی یقیناً متعدی ہوگی کیوں کہ میں بھی بچپن  
 میں ہٹا گیا اور گلا بھاڑ کر جواب دینے لگا۔ اس سے اُسے بڑا لطف  
 آیا۔ کھانستے کھانستے اس نے کتاب پھینک دی اور منمنانے لگا:  
 ”بڑی بی، لونڈے کی غراہٹ سن رہی ہو، ابے استراخان دیوانے  
 تو شور کیوں مچا رہا ہے؟ اکیں؟“

”لیکن شور تو آپ مچا رہے تھے“

مجھے اس آن نانا اور نانی کو دیکھ کر بڑا مزا آیا۔ وہ میز پر کھینی  
 ٹیکے ہم دونوں کی حرکتیں دیکھتی ہوئی زیر لب ہنس کر بولی: ”تم دونوں

کی یہی حالت رہی تھی تو ہنسی کے مارے باؤ لے ہو جاؤ گے۔  
 نانا نے دوستانہ لہجے میں کہا: ”بیاری کی وجہ سے میں چڑچڑا  
 ہو گیا ہوں۔ لیکن تجھے کیا ہوا ہے؟ امیں؟“ پھر اپنا گیلہ سر ہلا کر  
 وہ نانی سے بولا، ”خدا بخٹے تالیا کو غلط فہمی ہوئی تھی جو وہ کہتی تھی  
 کہ اس کا حافظہ خراب ہے۔ خدا جانتا ہے کہ یہ ہلا کا ذہن ہے۔ اچھا جل  
 بے بھوندو!“

آخر اس نے ہنس کر مجھے پلنگ سے کھڑ دیا۔  
 ”اتنا کافی ہے۔ کتاب لے جا اور اگر کل تو نے سارا اسجد صبح صبح  
 سنا دیا تو میں تجھے انعام میں اکتی دوں گا۔  
 میں نے کتاب کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے مجھے لٹا لیا اور  
 کہا: ”بیٹا، تیری ماں کو تیری فکر نہیں ہے۔“  
 نانی چونک پڑی: ”بڑے میاں کیا تمہیں بچے سے ایسی بات  
 کہنی چاہیے؟“

”بیشک مجھے یہ نہ کہنا تھا — مگر اپنے جذبات کو کیسے ضبط  
 کروں۔ ارے ایسی اچھی لڑکی کو یوں ستیا ناس ہونا تھا!“  
 اس نے مجھے دھکا دے کر کہا: ”جل بھاگ یہاں سے! جی چاہے  
 تو باہر ہو آ لیکن سڑک پر قدم رکھا تو ٹانگ توڑ دوں گا۔ آنگن یا  
 باغ میں ہی رہنا!“

میرا جی خاص طور پر باغ میں لگتا تھا۔ میں اس کے ٹیلے پر چڑھا  
 ہی تھا کہ پلپا پر سے لوندوں نے مجھ پر سنگ باری شروع کر دی۔  
 میں نے بھی بدلا چوکا نے میں کسر نہ رکھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب جھولی

میں پتھر بھر کر شور مچانے لگتے تھے: ”چُند آگیا، چُند آگیا، اس کے پر کتر لو“

مجھے چُند کا مطلب نہ معلوم تھا، اس لیے یہ لفظ کچھ معیوب نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس خیال سے مجھے قلبی اطمینان ہوتا تھا کہ میں اکیلا دم پوری فوج سے لڑ رہا ہوں، خصوصاً اس وقت جب میرا نشانہ ان سب کو پہاں دیاں چھپ جانے کے لیے مجبور کر دیتا تھا۔ اس جنگ میں دشمنی کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا اور عموماً اس میں کسی کو چوٹ نہ آتی تھی۔

میں آسانی سے پڑھنا لکھنا سیکھ گیا۔ نانی مجھ پر زیادہ توجہ کرنے لگی اور اب مار پیٹ کا سلسلہ بھی بہت کم ہو گیا۔ حالاں کہ میری رائے میں میں اب زیادہ سزاوار تھا کیوں کہ عمر اور طاقت کے ساتھ میں نانا کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتا جاتا تھا اور اس کی حکم عدولی کرتا تھا۔ لیکن اب وہ مُگّا دکھانے یا گھر کی دینے کے سوا زیادہ کچھ نہ کرتا تھا۔ اس سے میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ پہلے وہ مجھے بے وجہ پیٹا کرتا تھا اور میں نے یہ شبہ اس پر ظاہر بھی کر دیا۔

اس نے میرا منہ اوپر اٹھا کر، الفاظ کو چبا چبا کر کہا:

”کیا . . . آ . . . کہا؟“

اور پھر مُسکراتے لگا: ”اے کافر، تجھے کیا خبر کہ تیری کتنی پٹائی

ہونا چاہیے؟ میرے سوا کسے یہ معلوم ہو سکتا ہے؟ اچھا چل بھاگ جا“

مگر یہ کہتے ہی اس نے میرا نشانہ ہلا کر پوچھا:

”مجھے حیرت ہوتی ہے کہ دراصل تو مگر ہی یا سیدھا“

”مجھے کیا معلوم“

”نہیں معلوم! اچھا تو میری نصیحت کان لگا کر سن — مگر

بنا ہی کامیابی کا راز ہے۔ سیدھے بن اور بے وقوفی میں کوئی فرق نہیں۔ بھڑ سے سیدھا کوئی نہیں یہ یاد رکھ۔ خیر، بھاگتا ہی یا نہیں“

— x — x — x —

کچھ عرصے میں میں اس قابل ہو گیا کہ ہجے کر کے مناجات پڑھنے لگ گیا۔ شام کی چائے کے بعد مجھے ایک مناجات سنانا ہوتا تھا۔ پنل سے کتاب کے حروف کو گرفت میں لاتے ہوئے میں پڑھنے لگا:

”رحم م ت . . . . . رحمت ہو اُس پر . . . . .“

کس پر کیا جاکوف ماموں پر؟“ کوفت کم کرنے کے لیے میں نے یہ فقرہ جڑ دیا۔

نانا کا غصہ بھڑک اٹھا: ”وہ چپٹ پڑے گی کہ سبق یاد ہو جائے گا“ لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ بن رہا ہے، کیوں کہ اس کا نظریہ تھا کہ ایسے موقع پر یہی مناسب ہے۔

میرا خیال ٹھیک تھا کیوں کہ گھڑی بھر میں وہ مجھے بھول گیا۔ اور خود بخود کہنے لگا: ”ہاں ہاں! ناہج گانا ہو یا کھیل کود، حضرت سلیمان کی کینہ پروردی کہیں نہ جاتی تھی۔ واہ جی حضرت، تم زبان و بیان کے راجا تھے تو ساتھ ساتھ مسخرے بھی تھے“

کتاب چھوڑ کر میں اس کے متحیر اور شکن پرورد چہرے کو دیکھنے لگا

اس کی جھپکی ہوئی آنکھیں گویا میرے آر پار ہوئی جا رہی تھیں اور ان سے ایک اُداس جوت ٹکل رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ دم بھر میں ان میں وہی سرد مہری آجائے گی۔ میز پر وہ اُنگلی سے باجا سا بجانے لگا۔ اس کے داغ دار ناخون چمک رہے تھے اور سنہری بھنویں تلے اُوپر ہو رہی تھیں۔

”نانا جان“

”ایس؟“

”کہانی سنائیے“

اس نے یوں آنکھ مل کر گویا ابھی نیند سے جاگا ہی کہا:  
”اگلے پوستی، پڑھتا ہی یا نہیں!۔ تجھے مناجات سے زیادہ قصوں کا شوق ہے“

مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی کتاب زبور سے زیادہ قصہ کہانیوں کو پسند کرتا ہی۔ گو کہ اس نے یہ نیت باندھی تھی کہ سونے سے پہلے ایک بار اس کا ورد کرے گا اور وہ ہر رات کو اسے منتر کی طرح جپا کرتا تھا گویا کوئی پادری بھجن گا رہا ہو۔

میری منت سماجت کے آگے نانا کو پیچھے ہی بنی اور یہ واقعہ ہو کہ وہ روز بروز زیادہ رحم دل ہوتا جاتا تھا: ”اچھا بھائی! مجھے تو جلد خدا کے دربار میں جانا ہی اور کتاب زبور پڑھنے کو تو تیری عمر بڑی ہے“

آرام کو کسی کی گدھی کا ڈھاسنا لگا کر اور چھت کی طرف تاکتے ہوئے، وہ مجھے آہستہ آہستہ اپنے باپ اور پُرانے زمانے

کے حالات سُنانے لگا۔ ایک مرتبہ بالا خانے کے سیٹھ زینت کے گھر ڈاکہ بڑا نانا کے آبا خطرے کا گھنٹا بجانے کلیہ کے مینار پر چڑھے، مگر ڈاکوؤں نے انہیں تلوار کے گھاٹ اُتار کر نیچے پھینک دیا۔

”اس وقت میں دودھ پیتا بچہ تھا، اس لیے مجھے خود یہ واقعہ

یاد نہیں۔ پہلا آدمی جو مجھے واضح طور پر یاد آتا ہے وہ ایک فرانسیسی تھا۔ اس وقت میری عمر ٹھیک بارہ سال کی تھی۔ شہر میں قیدیوں کے تین گروہ لائے گئے تھے۔ وہ سب لاغر و نحیف تھے اور کئی کے پاس پہننے کو فیروں کی ننگوٹی تک نہ تھی۔ باقی سب جاڑے میں ایسے اکڑ گئے تھے کہ مشکل کھڑے ہو سکتے تھے۔ کسان انہیں قتل کیے بغیر نہ چھوڑتے، لیکن سپاہیوں نے انہیں مار بھگایا۔ یہ فرانسیسی قیدی بڑے دانا اور فرزانہ تھے۔ وہ سب منہں شکھ بھی تھے اور ان سے ہم لوگوں کی نمج گئی۔ . . . . کبھی وہ گانے بھی ساتے تھے۔ شہروں کے رئیس گاڑیوں پر لدر ان قیدیوں کو دیکھنے آتے تھے۔ ان میں سے کچھ انہیں گالی مٹاتے اور مار بیٹھتے تھے، مگر کچھ اُن سے نیک برتاؤ کرتے۔ انہیں کی زبان میں بولتے اور انہیں پیسے دیتے تھے۔ ایک بوڑھا امیر نہ ڈھنگ کر روتے ہوئے بولا کہ کجنت پولین نے فرانس کو تباہ کر دیا ہے۔ . . . . دیکھا تم نے! وہ روسی تھا اور پھر شریف روسی۔ وہ نیک دل تھا اور ان پر دسیوں کا ہم درد تھا۔“

پل بھر وہ جپ رہا اور آکھ بند کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

بعد ازاں وہ بڑی صحت سے پُرانے حالات سُنانے لگا۔

”درد فالان میں برت جی ہوئی تھی۔ یہ فرانسیسی کبھی میری ماں کے



مکان پر آتے اور کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر بڑا شور مچا یا کرتے۔ میری ماں روٹی بیچا کرتی تھی اور یہ گرم روٹیوں کی تلاش میں آتے تھے۔ ماں انہیں جھونپڑی میں آنے کی اجازت نہ دیتی تھی بلکہ کھڑکی سے نیچے روٹی پھینکتی جاتی تھی۔ وہ جلتی ہوئی ہوتی تھی، تاہم یہ لوگ اسے اپنے سینے میں چھپا لیتے تھے، خدا جانے اس کی آپخ اُن سے کیسے سہی جاتی تھی۔ وہ لوگ گرم ملک کے رہنے والے تھے، ہماری سردی برداشت نہ کر سکتے تھے اور کئی اکڑ کر مر بھی گئے۔ ان میں سے دو — ایک فہر دوسرا اس کا اردلی میروں — ہمارے مکان کے دھوبی گھر میں رہا کرتے تھے۔

افسر اونچا پورا تھا اور اتنا ڈبلا کہ اس کی ہڈیاں باہر نکل پڑتی تھیں۔ جب وہ باہر جاتا تو ایک زنانہ لبادہ اوڑھ لیتا جو اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ وہ بڑا خوش مزاج تھا۔ شراب بہت پینا تھا اور میری ماں جھُپ کر ”بیر“ تیار کرتی اور اسے بیچ دیتی تھی۔ شراب پیتے وقت وہ خوب گایا کرتا تھا۔ جب ہماری زبان میں اسے شُد بُد آگئی تو وہ کہنے لگا — ”تمہارا دیس بڑا بے رونق ہے — وہ سیاہ اور بد روہی“ وہ بہت غلط سلط بولتا تھا، تاہم ہم اس کا مفہوم سمجھ جاتے تھے۔ اس کا کہنا سچ بھی تھا۔ دولگا کا شمالی حصہ غیر دل چپ ہے لیکن دکن کی طرف سردی کم ہو جاتی ہے اور کاسپین سمندر کے کنارے تو برف کا نام و نشان بھی نہیں یہ ماننے کی بات ہے کیوں کہ انجیل یا ذکر عیسیٰ میں کہیں برف یا سردی کا ذکر نہیں ہے۔ . . . . اور نہ وہاں جہاں عیسیٰ کا ظہور ہوا تھا۔ . . . . اچھا

سناجات ختم ہوئے تو ہم ذکر عیسیٰ شروع کریں گے۔  
 وہ یوں چپ ہو گیا گویا سو گیا ہو۔ وہ دُور کی بات سوچ  
 رہا تھا اور اس کی آنکھیں تیز اور چھوٹی معلوم ہوتی تھیں۔  
 اپنی موجودگی کی یاد دلانے کے لیے میں نے کہا: ”نانا بھر کیا ہوا؟  
 چونک کر وہ کہنے لگا: ”ہاں — ہم فرانسیسیوں کا ذکر کر رہے  
 تھے۔ وہ بھی ہم جیسے آدمی ہیں، نہ وہ ہم سے بہتر ہیں نہ بدتر۔  
 کبھی وہ میری ماں کو آواز دیتے ”مادام، مادام“ اور وہ ان کی بورلیا  
 میں آٹے کا پنخ سیرل جھونک دیتی۔ اس میں غصب کی قوت تھی۔ بس  
 سال کی عمر تک تو وہ بال پکڑ کر مجھے اُٹھالیا کرتی تھی اور سچ جانو  
 کہ میں کچھ کم وزنی نہ تھا۔ خیر، یہ اردلی میروں گھوڑوں کا عاشق تھا  
 آنگن میں جا کر وہ لوگوں کو اشارہ سے جتاتا کہ وہ کسی گھوڑے کی  
 مالش کرنا چاہتا ہو۔ پہلے تو اس کی وجہ سے تکرار تک کی نوبت  
 آگئی۔ مگر بعد ازاں کسان اسے ارے میروں کہہ کر مبلانے لگے  
 اور میروں خوشی سے ان کے پاس آنے جانے لگا۔ اس کے بال  
 سُرخ، ناک گاجر کی سی اور ہونٹ موٹے تھے۔ وہ گھوڑوں کی ایک  
 ایک رگ سے واقف تھا اور ان کی بیماریوں کے علاج میں مسیحا  
 سے کم نہ تھا۔ وہ شہر میں مویشیوں کا ڈاکٹر بنا دیا گیا۔ لیکن اس کا  
 دماغ چل گیا اور وہ آگ میں جل مرا۔ بہار کے موسم میں افسر کی  
 صحت بھی خراب گئی اور ایک روز وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے  
 چپ چاپ مر گیا۔

یہ اس کا انجام تھا۔ مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ ایک کونے میں جا کر



میں اکثر پوچھا کرتا تھا:

”فرانسیسی اچھے ہیں یا روسی؟“

بھلا کر وہ جواب دیتا تھا: ”مجھے کیا معلوم؟ کیا میں فرانس

گیا ہوں؟ ہر بلا اپنے گھر میں اچھا لگتا ہے۔“

”لیکن کیا روسیوں میں خوبیاں بھی ہیں؟“

”کیوں نہیں، کئی معاملوں میں وہ اچھے ہیں۔ لیکن حب

زمینداروں کی حکومت تھی تو وہ بہتر تھے۔ اب ہم لوگ بڑی مشکل

میں مبتلا ہیں، روٹی کمانا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری

شریفوں پر ہے کیوں کہ ان میں علم ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ ہی نے

اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ باقی کی گت چھو ندر کی سی ہے۔ ان

کے لیے گھوڑے گدھے میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے یہاں خول

کی بہتات اور گودے کی کمی ہے۔ یاد رکھنا!۔ اب تک ہمیں عقل

آجانی تھی لیکن افسوس کہ ہم وہیں کے وہیں ہیں۔“

”کیا روسی دوسرے لوگوں سے زیادہ طاقتور ہیں؟“

”ہم میں سے کچھ طاقتور ہیں جنہوں سے کم نہیں۔ لیکن طاقت

سے زیادہ ذہانت اہم ہے۔ کیا گھوڑا ہم سے زیادہ طاقتور نہیں

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”مگر فرانسیسی ہم سے لڑنے کیوں آتے تھے؟“

”یہ بادشاہ کا معاملہ ہے۔ ہم بھلا اس رمز کو کیسے سمجھ سکتے ہیں

✓ مگر جب میں پوچھتا تھا کہ پولین کیا آدمی تھا؟ تو نانا بہت

عز و خوض کے بعد جواب دیتے تھے: ”بڑا سیاہ قلب تھا۔ وہ

دنیا بھر کو جیت کر تمام آدمیوں کو برابر کر دینا چاہتا تھا ناکہ نہ مالک رہیں نہ نوکر۔ اس کی خواہش تھی کہ انسانوں میں نام کے سوا کوئی تفریق نہ رہے، سب ایک قانون اور ایک مذہب کو مانیں اور نہ ان میں طبقوں کا فرق باقی رہے یہ جنوں نہیں تو کیا تھا۔ ساری خدائی میں کیکڑے کی ایک ایسی جنس ہے کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں — ورنہ پھیلیں تک میں اختلاف ہی۔ رو ہو کو ہیرنگ سے ہیر ہی تو اسے ہلا سے کد ہی اور ہمارے ملک میں کئی پولین ہو چکے ہیں۔ لیکن میں ان کے حالات بھر کبھی سناؤں گا۔

کبھی وہ چپ سادھ کر مجھے یوں گھونرہ نے لگتا گویا پہلے کبھی دیکھا ہی نہ تھا اور یہ بات مجھے ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن وہ اماں ابا کا ذکر بھول کر بھی نہ کرتا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں نانی پنچے دبائے اندر آتی اور کونے میں دم سادھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ سج میں وہ اپنی چکنی چٹری آواز میں بول اُٹھتی: ”بڑے میاں، تمہیں موردوں کا سفر یاد ہی جب ہم زیارت کو گئے تھے۔ کیا لطف آیا تھا بہت سوچ بچار کے بعد نانا جان فرماتے تھے: ”ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں لیکن ہم طاعون کے پیدے گئے تھے۔ اسی سال ہم نے جنگل میں اُن فرار شدہ قیدیوں کو پکڑا تھا۔“

”ہاں، ہاں! اور ہم کس قدر ڈرے ہوئے تھے۔“  
 ”ٹھیک کہا۔“

میں نے پوچھا کہ یہ کس قسم کے قیدی تھے اور جنگل میں کیوں چھپے پھرتے تھے۔ نانا نے بادل ناخواستہ سمجھایا: ”یہ وہ لوگ ہوتے

ہیں جو قید خانے سے بھاگ جاتے ہیں — اپنے مقررہ کام سے بچنے کے لیے“

”آپ نے انہیں پکڑا کیسے؟“

”کیسے؟ ارے یہ تو آنکھ مچونی کا کھیل ہی۔ کچھ بھاگتے ہیں کچھ پکڑتے ہیں۔ گرفتاری کے بعد ان کی اتنی مرمت ہوئی کہ ناک سے لہو بہنے لگا اور ان کی پیشانی داغ دی گئی تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ قیدی ہیں“

”لیکن اس کی وجہ؟“

”یہ ایک پہلی سر جے میں بھی نہیں سلجھا سکتا۔ مجرم کون ہی — بھاگنے والا یا پکڑنے والا — یہ بھی ایک معما ہی!“

بات کاٹ کر نانی نے پوچھا: ”بڑے میاں، تمہیں وہ آگ بھی یاد ہے۔“ نانانے، جسے ہر امر کی صحت کا سب سے زیادہ خیال رہتا تھا، منہ بنا کر دریافت کیا: ”کون سی آگ؟“

ان بڑائی دستانوں کی درق گردانی کے وقت وہ مجھے بالکل بھول جاتے تھے۔ ان کی آوازیں اور الفاظ یوں گھل مل جاتے تھے کہ محسوس ہوتا کہ وہ بیماری یا آتش زدنی، قتل یا موت دیوانوں یا پادریوں کے بارے میں غم ناک ترانے الاپ رہے ہیں نانانے زیر لب کہا: ”ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا! اور ہماری زندگی کیسے کیسے مرحلوں سے گزری ہے“

نانی نے جواب دیا: ”لیکن ہماری زندگی کچھ ایسی بے ٹکف تو نہیں کٹی۔ تمہیں وہ بہار یاد ہے جب ورینکا پیدا ہوئی تھی“

”یہ سچہ کا واقعہ ہے جب ہنگری پر حملہ شروع ہوا تھا۔ لڑکی کے پیسے کے بعد ہی اس کا نانا ”تخن“ گھر سے نکال دیا گیا۔“  
 ”اور پھر اس کا پتہ نہ چلا“ نانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ دن ہے اور آج کا دن کہ خدا کی رحمت ہمارے گھر سے اٹھ گئی۔ لڑکی کو ہی لو۔“

”بڑے میاں، ریشہ بس بھی کرو۔“

نانا نے بگڑ کر کہا: ”بس کرنے کی کیا بات ہے۔ ہماری اولاد پر بادی کی راہ جا رہی ہے۔ ہائے ہماری جوانی کیا ہوئی؟ سوچا تھا کہ اسے اپنی اولاد کے پاس رہن رکھ دیا ہے، جیسے کوئی قیمتی اسباب صندوق میں احتیاط سے رکھ دیا جائے۔ لیکن غومئی قسمت کہ اس کے بجائے قدرت نے ہمیں ایسے منھسے میں ڈال دیا جس سے نکلنا دو بھر ہی۔“

وہ کمرے میں گردش کرتے ہوئے یوں کراہنے لگا جیسے جل گیا ہو اور یوں پلکنے لگا گویا بیمار ہو گیا ہے۔ پھر نانی کی طرف مڑ کر وہ اپنی اولاد کو بد دعائیں دینے لگا اور اپنی پُر شکن مٹھی باندھ کر چیخ پڑا: ”اری چڑیل، تو نے ان کی پشت پناہی کر کے سارے گھر کا ستیا ناس کر دیا۔“

اس کے طیش اور غصے کا آخری مظاہرہ ایک اشک آلود ہچکلی کی صورت میں ہوا۔ وہ شہ نشین کے سامنے فرش پر لوٹنے لگا اور سینہ کاوی کے ساتھ یہ فریاد کرنے لگا:

”خدا، کیا میں نے دوسروں سے زیادہ گناہ کیا ہے؟ کیوں۔“

وہ سرتاپا گھر مقرر کرنے لگا اور اس کی پُر نرم آنکھیں غیظ و غضب سے جھکنے لگیں۔

نانی نے اندھیرے کونے میں چپ چاپ صلیب کا نشان بنایا اور بچتے بچتے اس کے قریب جا کر کہا: ”آخر یوں رونے بسورنے سے کیا فائدہ؟ خدا کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں۔ تم سمجھو کہ دوسروں کے بچے ہمارے بچوں سے اچھے ہیں۔ بڑے میاں میں ننھیں یقین دلاتی ہوں کہ کوئی گھر محبت و تکرار اور دنگے فساد سے خالی نہیں۔ ہر ماں اور ہر باپ اپنے گناہوں کو آنسوؤں سے دھوتا ہی۔ تم ایسے کون سے نرالے ہو!“

اکثر یہ الفاظ م سے تسکین دیتے اور وہ بلبنگ پر لیٹ جاتا۔ تب میں نانی کے ساتھ اپنی کوٹھری میں چلا جاتا تھا۔

لیکن ایک مرتبہ جب وہ نصیحت کی یہ پڑ یا لیے ہوئے نانا کے پاس آئی تو وہ اُس پر جھپٹا اور پوری طاقت سے اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔

نانی چکر لگئی اور گرتے گرتے بچی۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے دھیرے سے کہا: ”اُلو! یہ کہہ کر اس کے پانوں پر نانی نے خون تھوک دیا۔ لیکن وہ پھر بھرا اور دونوں ہاتھ اس کی طرف اُٹھائے۔ درہٹ جا ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔“

کمرے سے جاتے جاتے نانی نے پھر کہا: ”اُلو کہیں کا!“  
نانا اس پر جھپٹا لیکن وہ چوکھٹ سے اُچھلی اور دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔



نانا کا چہرہ سفید ہو گیا اور وہ کواڑ پیٹتے ہوئے سانپ کی طرح  
پھٹکارنے لگا: ”چڑیل، چڑیل!“

میں سوئے پردم بخود بیٹھا تھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا  
پہلی مرتبہ اس نے میرے سامنے نانی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے  
کردار کے اس نئے پہلو کو دیکھ کر مجھے انتہائی کراہت ہوئی۔ یہ گناہ  
میرے نزدیک ناقابل معافی تھا اور محسوس ہوا کہ میرا دم گھٹ رہا  
ہی۔ وہ کواڑ کا سہارا لیے جوں کا توں کھڑا رہا اور اس کے چہرے  
کی یہ حالت ہو گئی گویا اس پر بھبھوت ملی ہوئی ہی۔

پہلے تو وہ بیچ کمرے میں سجدے میں گر پڑا۔ لیکن ایک آن  
میں سر اٹھا کر اور سینہ پیٹ کر بکارنے لگا:  
”اللہ — ارے میرے اللہ —“

میں دبے پاؤں اور ریگتے ہوئے کمرے سے نکلا۔ نانی اوپر  
اپنی کوٹھری میں ہٹل رہی تھی اور بیچ بیچ میں ہونٹ کو پانی سے  
دھوتی جاتی تھی۔

”زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

کونے میں جا کر کُلّی کرتے ہوئے اس نے لا پرواہی سے کہا:  
”کوئی بات نہیں۔ دانتوں کی خیر ہی۔ ہونٹ پر خفیف سی چوٹ  
آگئی“

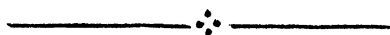
”لیکن انھیں ہو کیا گیا تھا؟“

باہر دیکھتے ہوئے نانی نے جواب دیا: ”وہ چڑچڑے ہو گئے ہیں  
بڑھاپے میں یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ ہر تدبیر الٹی پڑ رہی ہے“

اچھا تو اب دعا پڑھ کر لیٹ جا اور بڑی باتوں کو نہ سوچ۔“  
میں نے اور بھی کچھ پوچھنا چاہا مگر اس نے خلاف معمول کرکڑی کہہ  
کہا: ”میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ یسٹا رہی یا نہیں؟۔ میں نے ایسی  
نافرمان برداری کبھی نہیں دیکھی!“

کھڑکی کے پاس بیٹھے وہ ہونٹوں کو چوستی اور رومال میں تھوکتی  
جاتی تھی۔ کپڑے اتارتے ہوئے میں ٹکٹلی باندھے اُسے دیکھتا رہا  
نبیلی کھڑکی سے اس کے سیاہ سر پر جگگاتے ہوئے ستارے نظر آ  
رہے تھے۔ ٹوکا عالم تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ جب میں لیٹ  
گیا تو وہ میرے قریب آئی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: ”شب  
بخیر میری جان! میں اُن کے پاس ہو آؤں۔ فکر نہ کرنا۔ یہ میرا ہی  
قصور تھا۔ لے اب سو جا۔“

مجھے جوم کر وہ چلی گئی۔ لیکن میرا دماغ رنج و غم میں ڈوب  
گیا۔ نرم و گرم بستر سے اُٹھ کر میں کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور اسی  
لال کے عالم میں سنان سرک کو دیکھنے لگا۔



## باب ۷

مجھے بہت جلد یہ بات معلوم ہو گئی کہ نانا اور نانی کے خدا جڑا جڑا تھے۔ یہ فرق اس قدر بین تھا کہ میں کسی طرح اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ کبھی نانی صبح آنکھ کھولتے ہی بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے گھنیرے بال سلجھانے لگتی تھی۔ اپنا سر اکر اکر وہ ٹوٹی ہوئی کنگھی سے کالی ریشمی چوٹی کا بال بال سنوارتی اور جی ہی جی میں کوستی جاتی: ”توبہ ہو توبہ جو بال چپکے ہیں خدا انہیں لے جائے“

سب آنجھٹوں کو سلجھا چکنے کے بعد موٹی سی ایک لڑی چوٹی وال کر وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھوتی اور اس دوران میں برابر غصے سے سر ہلاتی جاتی۔ اس کے دہانے پر چڑچڑے پن کے آثار باقی رہتے تھے اور ہرے پر اب تک وہ لکیریں باقی تھیں جو نیند نے چُن دی تھیں۔ پھر وہ شہ نشین کے آگے کھڑی ہو جاتی اور دراصل اس کے لیے یہ وہ طہارت تھی جو اس کے ہر مین مو کو شگفتہ و شاداب کر دیتی تھی۔

اپنے کو بڑ کو سیدھا کر کے اور سر اوپر اٹھا کر وہ مریم کے گول مٹول منہ کو تاکنے لگی اور احترام سے صلیب کا نشان بنا کر بیل پڑی: ”اے نور زادی! تو آج ہی مجھے اپنے آغوش میں لے لے!“

بہت جھجک کر سلام کرنے کے بعد اس نے بہ مشکل اپنی پیٹھ سیدھی کی اور پھر رقت آمیز لہجے میں سرگوشی کرنے لگی:

”دل کی راحت! مینوں کا صکھ! اور دنیا کی سرتاج!“

ہر روز وہ نئے نئے القاب ڈھونڈ نکالتی تھی۔ اور اسی لیے میں ان دعاؤں کو بہت غور سے سُنا کرتا تھا۔

”اے جانِ جاں، تجھ سے زیادہ پاک کون ہی! تو میری محافظ اور امین ہی! تو آفتاب ہی! خدا کی ماں ہی! مجھے لالچ سے بچا۔ میرے ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور اگر کوئی غلطی سے مجھے ضرر پہنچائے تو میں اس کا بُرا نہ مانوں“

اس کی سیاہ آنکھیں مسکرانے لگتی تھیں اور اس کے آس پاس جوانی کا نور برسنے لگتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے گویا کوئی بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے وہ از سر نو صلیب کا نشان بناتی تھی: ”عیسیٰ! خدا کے لاڈلے، اپنی ماں کی خاطر اس خطا کار کو بخش دے!“

اس کی دعاؤں میں نفیہانہ مصنوعیت نہیں، بلکہ سادگی اور خلوص کی شان ہوتی تھی۔

صبح اس کی دعا مختصر ہوتی تھی کیوں کہ اسے جھٹ پٹ جائے کا پانی رکھنا ہوتا تھا۔ نانا نے کوئی نوکر نہ رکھا تھا اور جائے میں ایک منٹ کی بھی دیر ہوئی تو وہ جان کو آجاتا تھا۔

کبھی وہ پہلے اُٹھ کر ہماری کوٹھری کا رُخ کرتا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کی دعائیں سنتا رہتا اور اپنے پتلے کالے ہونٹوں کو حقارت سے جبانے لگتا تھا۔ پھر جائے کے وقت وہ غرّا کر کہتا: ”اری

بیوقوف، میں نے مجھے ہزار مرتبہ دعا رٹائی ہوگی۔ لیکن تو ہی کہ اپنی  
بکواس بند نہیں کرتی۔ معلوم نہیں خدا تیرے کفر کو کیوں برداشت  
کرتا ہے؟

نانی ایانِ راسخ سے کہتی: ”وہ پاک پروردگار ہر کہی ان کہی  
سے واقف ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔“

”تیرے دماغ میں گوبر بھرا ہے! ہشت . . . . دھت . . . .“  
نانی کا خدا اس کا ہمدم اور یارِ غار تھا۔ وہ جانوروں تک سے  
اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ یہ خدا اپنی کائنات کے ذرے ذرے کا  
تابعدار تھا اور وہ چرند پرند، پیڑ پودے سب سے قریب تھا۔ وہ  
سب پر کیساں مہربان تھا اور کسی شے سے دُور نہ تھا۔

بھٹیاری نے ایک بتی پال چھوڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سنہری  
اور بالِ سُرمئی تھے۔ بڑی چنچل اور چالاک تھی۔ ایک بار وہ باغ  
سے ایک چڑیا پکڑ لائی۔ نانی نے ادھ موئے پرندے کو آزاد کر کے  
بتی کو ٹھونکا اور کہا: ”اری چھنال، تجھے خدا کا بھی ڈر نہیں؟“

یہ سن کر بھٹیاری بہت ہنسی لیکن نانی نے ڈانٹ کر کہا:  
”کیا تم سمجھتی ہو کہ جانور خدا کی ذات سے نا آشنا ہیں؟ اری سنگ  
دل! ہر جانور انسان سے زیادہ خدا کا راز داں ہے۔“

گھوڑی اب موٹی پڑتی جاتی تھی اور اُداس رہتی تھی۔ اس پر  
چار جامہ کتے ہوئے نانی بڑے اہناک سے بات چیت کیا کرتی تھی:  
”خدا کی مزدور نی! تو غم گین کیوں رہتی ہے؟ اچھا، تو بوڑھی ہو رہی  
ہے۔ کیوں یہی بات ہی نا؟“ اور گھوڑی ہنہنا کر سر ہلانے لگتی تھی۔

تاہم وہ خدا کی اتنی دوہائی نہ دیتی تھی جتنی میرے نانا جان۔ میں نانی کے خدا کو سمجھ سکتا تھا۔ اس کے آگے جھوٹ بول کر میں آپ اپنے سے شرمندہ ہو جاتا۔ اس کا خیال ایسی ندامت پیدا کرتا کہ میں نانی سے کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا۔ ایسے اچھے خدا سے کچھ چھپانا ناممکن تھا۔ واقعی مجھے اس کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

ایک روز بھٹیاری نانا سے لڑ پڑی اور اسے خوب جلی کٹی سُنائی۔ گونانی نے اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہ لیا مگر بھٹیاری نے اسے بھی بڑی باتیں سنائیں اور ایک گاجر پھینک ماری۔ نانی نے بہت نرمی سے بس اتنا کہا: ”اچھی، تو بڑی نادان ہو“ لیکن مجھ سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور میں نے اس بدذات سے انتقام لینے کا تہیہ کر لیا۔

کئی روز تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس فربہ اندام سے بدلا لینے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہو۔ پڑوسیوں کی لڑائی کا میں نے جو مشاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے دشمن کی بتی کی دُم کاٹ لیتے، اس کے کتے کو بھگا دیتے، اس کے مرغے مرغیوں کو ذبح کر کے کھا جاتے، اس کی موری بند کر دیتے یا باغ اُجاڑ دیتے تھے لیکن مجھے ان میں سے کوئی تدبیر پسند نہ تھی۔ میں کسی ایسی ترکیب کی تلاش میں تھا جو زیادہ با اثر ہو۔ بالآخر ایک تدبیر سوچ ہی گئی۔ میں بھٹیاری کے انتظار میں دبک گیا اور وہ جیسے ہی کباڑ خانے میں داخل ہوئی میں نے کھٹ سے چور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ تالا بند کر کے چابی چھپر پر پھینک دی اور باورچی خانے

میں جا پہنچا جہاں نانی کھانا پکا رہی تھی، میں خوشی کے مارے پھولانہ ساتا تھا۔ پہلے تو نانی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر جب وہ یہ مجھ پر بھانپ گئی تو کھلے پر ایک لپٹا رسید کیا۔ کھینچتے ہوئے وہ مجھے باہر لائی اور چابی ڈھونڈنے کے لیے چھپر پر جڑھا دیا۔ بادل ناسخا یہ چابی اُسے دے کر سخت حیرت کے عالم میں میں آنگن کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں سے میں اپنے قیدی کی آزادی کا ماہرا دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں ہنسنی ہوئیں باہر چلی گئیں اور بھٹیاری نے اپنی پاؤں روٹی کی سی مٹھی دکھا کر مجھ سے کہا: ”دیکھ تجھے کیسا مزا چکھاتی ہوں“ لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار تھے۔

نانی پھر گردن پکڑ کر مجھے کھینچتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئی۔  
 ”تو نے یہ حرکت کیوں کی؟“ اُس نے پوچھا۔  
 ”کیوں کہ اس نے تمہیں گاجر پھینک کر ماری تھی۔“

”اچھا، تو آپ میری خدمت بجا لا رہے تھے! بہت خوب تو میں بھی آپ کو اس کا انعام دوں گی۔“ اُسے میں تیری چمڑی اُدھیڑ کر تجھے جوہوں کے ساتھ تندور میں بند کر دوں گی۔  
 بڑا میرا محافظ بنا ہی۔ کیا پڈی کیا پڈی کا شور با! نانا کو معلوم ہو تو وہ تیرا بھرکس نکال دیں۔ جل اپنی کوٹھری میں اور سبق یاد کر۔  
 دن بھر اُس نے مجھ سے بات چیت نہ کی۔ لیکن رات کی دعا سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اس نے نہایت اثر پذیر انداز میں مجھے یہ نصیحت کی:

”الکسی بیٹے، آئندہ تمہیں کبھی بڑوں کے معاملوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ بڑوں پر ذمہ داریوں کا بار ہی اور انہیں خدا کو جواب دینا ہی۔ لیکن تم ابھی بچے ہو۔ اُس روز کا انتظار کرو جب خدا تمہارے دل میں جگہ بنائے گا اور تمہیں ہدایت کرے گا کہ کیا کرنا ہی اور کون سی راہ پکڑنا ہی۔ سمجھ میں آیا؟ کسی قصے میں کون خطاوار ہی اور کون بے گناہ، اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ خدا انصاف کرنے والا اور سزا دینے والا ہی۔ یہ اس کا اختیار ہی، ہمارا نہیں۔“

ناس سونگھتے ہوئے وہ گھڑی بھر چُپ رہی۔ پھر داہنی آنکھ دبا کر کہنے لگی: ”کبھی اللہ میاں بھی غوطہ کھا جاتے اور انہیں بتا نہیں جلتا کہ مجرم کون ہی۔“

مجھے سخت تعجب ہوا: ”کیا خدا کو ہر امر کا علم نہیں؟“  
 ”اگر وہ قادرِ مطلق ہوتا تو وہ باتیں نہ ہوا کرتیں جنہیں نہیں ہونا چاہیے۔ پروردگار عرش بریں سے فرش زمیں کا معائنہ کرتا ہی اور ہمیں آب دیدہ اور غم سیدہ پاتا ہی تو بیکار اٹھتا ہی: ”میرے بندو! مجھے تمہارے حالِ زار پر رحم آتا ہی۔“  
 یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔ پھر اپنے گیلے گالوں کو پونچھ کر کونے میں جا کر دعا مانگنے لگی۔

اس دن کے بعد نانی کا خدا مجھ سے قریب تر ہو گیا۔ نانا بھی مجھے پڑھاتے وقت کہا کرتا تھا کہ خدا رحیم و کریم ہی، ستارہ و غفار ہی۔ لیکن وہ نانی کی طرح دعا نہ مانگتا تھا۔ صبح شہ نشین کے آگے



جانے سے پہلے وہ دیر تک وضو کرتا تھا۔ کپڑے پہن کر نہایت امتیاز سے کنگھی کرتا، بالوں کو سلجھاتا، آئینہ سامنے رکھ کر قمیص کی شکن نکالتا اور ٹائی درست کرتا تھا۔ پھر وہ سنبھل سنبھل کر چوروں کی طرح شہ نشین کی طرف جاتا تھا۔ ایک خاص تختے پر کھڑے ہو کر وہ گھوڑے کی مانند آنکھیں مٹکاتا تھا۔ سر جھکائے اور سپاہیوں کی طرح ہاتھ تانے دم بھر خاموش رہتا اور پھر سر کندھے کی مانند اکر کر بڑی شان سے کہتا :

”باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر!“

یہ کہنا تھا کہ کمرے میں مُردنی چھا جاتی تھی اور کھجیاں بھی بھنبھناہٹ بند کر دیتی تھیں۔

سر اُکڑائے، بھنویں تانے، دارھی ہلاتے ہوئے، وہ ایسی سدھی ہوئی آواز میں دعا مانگنے لگتا گویا کوئی سبق دوہرا رہا ہو اور اس کا لہجہ تیز دطّار ہوتا تھا۔

”جب انصاف کرنے والا آکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا۔“ سینہ ٹھونک کر وہ جوش سے کہتا جاتا تھا: ”عاصیوں کو تیرا ہی آسرا ہے۔ میرے گناہوں سے چشم پوشی کرے“ اس کے الفاظ بندھے بندھائے ہوتے تھے۔ اس کا داہنا پاؤ برابر کا پتا جاتا تھا گویا دُعا پر تال دے رہا تھا۔ وہ اتنا صاف ستھرا اور اپنی طلب میں مستحکم تھا کہ اس کا جسم لمحہ بہ لمحہ دراز تر ہوتا جاتا تھا۔

”مسیحا، میری بیمار روح کا علاج کر۔ مقدس کنواری، یہ

میری روح کا نوحہ ہی۔ میں تجھ پر اپنے کو قربان کرتا ہوں؟ اپنی ہری آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ فریاد کرتا تھا: ”عمل سے زیادہ مجھے ایمان دے اور میری نیکی کتنی بھی ادنیٰ کیوں نہ ہو، اُسے نہ بھول“ اس دوران میں وہ برابر صلیب کا نشان بناتا جاتا تھا اور اپنے سر کو یوں جنبش دیتا گویا کسی کو ٹکڑے مارے گا۔ اس کی آواز بیٹھ جاتی تھی۔ بعد ازاں جب مجھے یہودیوں کی عبادت گاہ میں جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ نانا یہودیوں کی طرح دعا مانگتا تھا۔ اب سادار میز پر سنانے لگتا تھا اور گرم روٹی کی خوشبو سے کراہک جاتا تھا۔ نانی آنکھیں جھکائے، ناک بھوں چڑھائے کمرے میں ٹہلنے لگتی تھی۔ سورج باغ سے کمرے کے اندر جھانکنے لگتا بیٹیوں پر شبنم کی بوندیں موتیوں کی طرح چمکنے لگتیں۔ نسیم صبح نسیم دیا سن میں جھن کر معطر ہو جاتی۔ مگر نانا کی مجروح و مغموم دعاؤں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔

”مجھ ناری کے دل سے بُری خواہتوں کو نکال دے“

مجھے یہ ساری دعائیں بر زبان تھیں اور خواب میں بھی میں انہیں حرف بحرف دُہرا سکتا تھا۔ میں بڑے غور سے انہیں سُنا کرتا تاکہ اس کی کوئی بھول چوک پکڑ سکوں۔ اس کا احتمال ہی نہ تھا۔ لیکن اگر کبھی وہ ایک آدھ لفظ چھوڑ جاتا تھا تو مجھے شرارت آمیز مسرت ہوتی تھی۔

دعاؤں کے بعد نانا ہم دونوں کو سلام کرتا اور اس کا جواب دے کر ہم سب میز پر بیٹھ جاتے۔ میں فوراً یاد دہانی کرتا:

”آپ کو آج صبح ایک غلطی کر گئے!“

”صبح بچ!“ اعتبار نہ ہونے کے باوجود مانا بے چین ہو جاتا تھا۔

”جی ہاں آپ کہنا تھا!“ میرے ایمان کا بول بالا ہو۔ مگر آپ

بول بالا کا لفظ چھوڑ گئے۔“

سخت پریشانی کے عالم میں گویا اس نے کسی گناہ کا ارتکاب

کیا ہو وہ کہتا تھا: ”لا حول ولا قوۃ“

غلطی پکڑنے کا انتقام لینا وہ ہرگز نہ بھولتا تھا۔ لیکن گھڑی بھر کے لیے اُسے پریشان دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے کوئی نمبر مار لیا ہو۔

ایک بار تانی نے مذاق مذاق میں کہا: ”بڑے میاں، مٹھاری روڑ

روڑ کی ایک ہی رٹ کو سُن کر خدا تھک گیا ہوگا۔“

نانا نے تیور چڑھا کر کہا: ”اِس . . . . . کیا کہا؟ . . . پھر تو کہنا؟“

”سیرا منشا یہ ہے کہ کبھی دل سے بھی تو کوئی دعا مانگا کرو۔“

غصے کے مارے بڑے میاں آگ بولا ہو گئے اور اُچھل کر ایک

تشری نانی کے سر پر دے ماری اور ایسی آواز نکالی جیسے کوئی زندہ

چلا رہا ہو: ”ارمی ڈھٹو، یہ لے با“

خدا کی قدرت کا ذکر کرتے وقت وہ سب سے زیادہ زور اس

جلال پر دیا کرتا تھا: ”انسان نے گناہ کیا تو سیلاب نوح آیا انسان

پھر بھی باز نہ آیا تو خدا نے قحط اور وبا سے اس کی تواضع کی۔ اب

بھی عاصیوں کے لیے تلوار تیر ہی۔ جان بچھ کر جو اس کے احکام

کو نہ مانے گا وہ ذلیل و خوار ہو کر رہے گا۔“ میر پر گھونسنے مار مار کر

وہ اس تنبیہ کو موثر بناتا جاتا تھا۔

مجھے یقین ہی نہ آتا کہ خدا بے رحم ہوگا۔ اور میرے دل میں  
سُبُّہُ اُلْعٰتٰی تھا کہ خدا کا نہیں بلکہ اپنا رعب جانے کے لیے نانا نے یہ  
جلہ تراشا ہی۔ اس لیے میں نے بے دھڑک پوچھ لیا:  
”کیا آپ یہ سب اس لیے کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کی حکم عذلی  
نہ کروں؟“ اور اس نے بھی اسی صغائی سے جواب دیا: ”مکن کر۔  
کیا تم پھر کبھی میری بات ٹالو گے؟“  
”اور نانی جو کہتی ہیں؟“

اس نے ڈانٹ کر کہا: ”اس کوڑھ دماغ کی باتوں میں نہ آنا  
وہ سدا جاہل کی جاہل رہی۔ اسے عقل و علم سے کیا واسطہ۔ میں  
اسے کہہ دوں گا کہ ایسے اہم معاملے پر تم سے گفتگو نہ کرے۔ اچھا  
اب بتاؤ فرشتوں کی کتنی کینیاں (پرے) ہیں؟“  
”پروں کی تعداد بتلا کر میں نے پوچھا: ”کیا ان کی لیسٹڈ  
کینیاں بھی ہیں؟“

قہقہہ مار کر وہ چیخ پڑا: ”اے اُو، اللہ میاں کو کسی کمپنی سے  
کیا کرنا ہی..... یہ تو دُنوی چیز ہی..... قدرت کے آئین  
کی نافرمانی کے لیے ایسی چیز یا وضع کی گئی ہیں“  
”آئین کیا ہیں؟“

بڑے میاں بڑے شوق سے اپنی تیز آنکھیں مٹکا کر سمجھانے  
لگے تھے: ”آئین! آئین کی بنیاد رسوم پر ہی۔ ایک قبیلے کے لوگ  
آپس میں طوکر لیتے ہیں کہ فلاں طریقہ عمل بہترین ہی۔ اسے ہم اپنی

ریت بنالیں۔ رفتہ رفتہ یہی رواج ان کا قانون بن جاتا ہے۔ مثلاً کھیل سے پہلے بچے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس کے قواعد کیا ہوں گے آئین بھی ایسے ہی بنتے ہیں۔

”لیکن کمپنیوں کو قوانین سے کیا تعلق؟“  
 ”یہ کبھت قانون سازی کے لیے نہیں بلکہ قانون شکنی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔“

”مگر اس کی وجہ؟“

”ماتھے پر بل ڈال کر وہ بولا: ”یہ تمھاری سمجھ میں نہ آئے گا۔“ لیکن لمحہ بھر بعد وہ سمجھانے لگا: ”انسان کا ہر عمل خدا کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ہے۔ آدمی کی مرضی جو بھی ہو لیکن مولا کا منشا اور ہی کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے اداروں کی بنیاد آنی جانی ہے۔ اللہ کی ایک پھونک ان کی فنا کے لیے بس ہے۔“

”تاہم کمپنی کا مسئلہ میرے لیے بہت دل چپ تھا اور میں یہ پرچھنے سے نہ چکا۔“ لیکن ماموں جاکوف جو یہ گیت گاتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟

اللہ کے چیلے

فرشتے سچیلے

قدرت کے بلم ٹیر!

اندر سے کالے

کمپنی والے

شیطان کے سالے

نانا نے ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنا منہ چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کٹوں کی حرکت سے میں سمجھ گیا کہ وہ دل ہی دل

میں ہنس رہا ہوں۔ پھر وہ بولا: ”جاکوف کے ہاتھ پیر باندھ کر ندی میں ڈال دینا چاہیے۔ اس بد معاش کو یہ گیت گانے کی اور تجھے اس کے مٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ خدا کی شان میں ایسی گستاخی اس کفرستان کے سوا اور کہاں جائز ہے؟ اور گویا میرے آہ پار دیکھتے ہوئے وہ مفکرانہ انداز میں بولا: ”ہشت . . . دھت . . .“

گو اس کا خدا انسانیت کے سر پر قہر و غضب کا عصا لیے کھڑا رہتا تھا، تاہم نانی کی طرح وہ بھی ہر معاملے میں اس کی امداد کا طالب رہتا تھا۔

نانی جن چند دیویوں کے ناموں سے واقف تھی وہ سب ہمدرد و مونس تھے اور انسان کی آبادیوں میں آکر اس کے سکھ دکھ کے شریک بنتے تھے۔ لیکن نانا کے دیوتا یا تو بت شکن تھے یا رومن بادشاہوں کے دشمن جو انھیں زندہ جلا ڈالتے تھے۔ کبھی نانا آپ ہی آپ کہہ اُٹھتا تھا: ”اگر خدا وہ جھوٹا بیچے میں میری مدد کر لے تو میں حضرت نکولس کی نیاز کروں۔“ مگر نانی ہنس کر مجھ سے کہتی تھی: ”بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں! کیا حضرت نکولس کو اتنی فرصت ہے کہ لوگوں کے مکان نیلام کرتے پھریں۔ کیا وہ کوئی بہتر خدمت انجام نہیں دے سکتے؟“

عرصے تک میں نے اپنے پاس نانا کی ایک جھڑی رکھ چھڑی تھی جس میں اس نے اپنے ہاتھ سے بہت سے ٹونے ٹوکے لکھ رکھے تھے۔ ”جو کم“ اور ”انا“ نامی دو بزرگوں کی سال گرہ کے سامنے سُرخ روشنائی سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا:

”میرے محسن جنھوں نے مجھے ایک آفت سے نجات دلائی“  
مجھے اس آفت کی ساری کہانی یاد ہے۔

اپنے ٹپھلے بیٹوں کا خرچ پورا کرنے کے لیے نانا نے مہاجنی شروع کی اور خفیہ طور پر سامان رہن رکھنے لگے۔ کسی نے رپٹ کر دی اور رات کو پولیس نے تلاشی کے لیے ہمارے گھر پر چھاپا مارا۔ بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ لیکن، رسیدہ بوو بلائے ولے بجز گزشت۔ نانا رات بھر دعا مانگتا رہا اور ناشتے سے پہلے میرے سامنے یہ الفاظ جنتری میں ٹانگ دیے۔

رات کے کھانے سے پہلے وہ میرے ساتھ کتاب زبور یا کوئی ایسی ہی چیز پڑھتے تھے۔ لیکن کھانا کھاتے ہی وہ دعاؤں کا سلسلہ چھیڑ دیتے تھے اور رات کے سناٹے میں یہ افسردہ الفاظ بھٹکنے لگتے تھے: ”ای شہنشاہوں کے شہنشاہ اسی پروردگار عالم، میں تجھے کیسے مناؤں، اپنے گناہوں کو کس طرح دھوؤں! ہمیں بدبختی سے بچا۔۔۔۔۔ آہی، مجھے کچھ لوگوں سے محفوظ رکھ۔۔۔۔۔ میرے آنسو میں کی طرح برستے ہیں۔ اپنے گناہوں کی یاد۔۔۔۔۔“

سیچ میں نانی جاہی لے کر بولتی تھی: ”ادوہ! میں تو بالکل تھک گئی۔ میں بے دعا کبھی سو رہوں گی!“

نانا مجھے سینچر، انوار اور تیوہاروں کے موقع پر کلیسا لے جاتا تھا۔ وہاں بھی میں مختلف خداؤں میں تمیز کر سکتا تھا۔ پادری کا بھجن نانا کے خدا کے لیے تھا۔ لیکن سرود خوانوں کا نغمہ نانی کے خدا کے لیے ہوتا تھا۔ ان دو خداؤں کے اختلاف کی نوعیت کو

میں اپنے بچپن میں صاف صاف کیوں کمر سمجھ سکتا تھا۔ لیکن خوب یاد ہے کہ نانا کا خدا مجھ میں خوف و ہراس کا جذبہ پیدا کرتا تھا اور اس کے تصور سے میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ وہ کسی سے محبت نہ کرتا تھا۔ ہم سب کی عیب چینی اس کا تنہا مشغلہ تھا اور ہماری بدیوں اور غلط کاریوں کی چھان بین میں اسے لطف ملتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خدا انسان پر پر اعتماد نہ کرتا تھا۔ وہ کفارہ مانگتا تھا اور ہمیں سزا دے کہ اسے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

اس زمانے میں میری روح کی خاص غذا وہ تصورات اور خیالات تھے جو خدا کی ہستی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ میری زندگی کے سب سے پاک دن ہیں اور سب تاثرات اپنے تشدد اور جبر سے مجھ میں کراہت پیدا کرتے تھے اور نفرت و بیزاری کے جذبات کو بیدار کرتے تھے۔ لیکن میرے ماحول کی سب سے روشن ہستی خدا کی ذات تھی — میری نانی کا خدا جو ساری دنیا کا دوست تھا اور اکثر یہ سوال مجھے بے چین کرتا تھا —

”ایسے اچھے خدا کو میرا نانا کیوں نہیں پہچانتا؟“

مجھے سڑکوں پر دوڑنے کی اجازت نہیں تھی، کیوں کہ اس سے ایک بیک میں مستقل ہو جاتا تھا۔ اس سے مجھ میں جو تاثرات پیدا ہوتے وہ مجھے باؤلا بنا دیتے تھے اور اس کے بعد اکثر کوئی نہ کوئی فساد ہو جاتا تھا۔

میرا کوئی ساتھی نہ تھا۔ پڑوس کے لڑکے مجھے دشمن گردانتے تھے۔ وہ مجھے ”کشرن لونڈا“ کہتے اور اس سے مجھے بڑی چڑھتی۔



یہ جان کر وہ مجھے اور بھی چڑاتے اور مجھے دیکھتے ہی زور سے چلاتے: ”کشن کا پوتا — دن رات روتا! لینا جانے نہ پائے بس جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ کم عمری کے باوجود میں طاقت ور تھا اور میرے گھونے ایسے ہلکے نہ تھے۔ اس لیے یہ سب مل کر مجھ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ عموگامیری کندی ہو جاتی تھی اور میں ناک یا منہ پر کوئی زخم لیے ہوئے گھر لوٹتا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور دھول میں سے ہوئے۔

نانی مجھے دیکھتے ہی درد اور پریشانی سے چیخ اٹھتی تھی: ”ارے یہ کیا؟ — ارے فادی تو پھر لڑ آیا۔ تیرے سر میں یہ کیا سودا سمایا ہے؟“

میرا منہ دھو کر وہ خراشوں کو تانبے کے سکتے سے سینکتی یا بیسے کا بھپارا دیتی: ”اس مار گٹائی سے تجھے کیا ملتا ہے۔ گھر میں تو تو اللہ میاں کی گائے بنا رہتا ہے لیکن باہر نکلتے ہی مٹھا ساند بن جاتا ہے۔ تجھے شرم بھی نہیں آتی۔ ٹھہر میں بڑے میاں سے کہہ کر تیرا باہر جانا بند کراتی ہوں۔“

نانا ان چوٹوں کو دیکھ کر بھی کچھ نہ کہتا۔ غرّا کر بس یہ حکم دیتا: ”یہ تمغے ہیں تمغے!۔ اے رسم کے بیٹے جب تک تو میرے گھر ہو خبردار جو سڑک پر قدم نہ رکھا۔ سنتا ہے؟“

سنان سڑک میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن بچوں کے شور میں وہ موہنی تھی کہ میں نانا کی تنبیہ پر لات مار کر باہر بھاگ آتا تھا۔ مار دھاڑ اور گالی گلوچ کی میں کوئی پروا نہ کرتا تھا

سڑک کے کھیلوں کی وحشت انگیزی مجھ میں جنون کی سی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ اس کے بعد طبیعت بوجھل اور چور چور ہو جاتی تھی۔ لیکن جب دوسرے لڑکے کتوں اور مرغوں کو کھدیڑ رہے ہوں، بلیوں کو مار رہے ہوں، بھودیوں کی گایوں کو بھگا رہے ہوں۔ متوالوں کو چڑا رہے ہوں اور ”اگوشا کی جیب میں موت کی پڑیا“ کا نعرہ لگا رہے ہوں — تو میں چپ کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

اگوشا اونچا پورا سوکھا سا کھا آدمی تھا۔ اس کے بے گوشت چہرے پر بال اُگے ہوئے تھے اور وہ بھیڑ کی کھال اوڑھے رہتا تھا وہ عجیب طریقے سے ڈمگاتے ہوئے سر جھکائے زمین پر نظر جمائے سڑکوں کا چکر کاٹا کرتا اور کبھی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ اس کا آہنی رنگ کا چہرہ اور جھوٹی جھوٹی آداس آنکھیں مجھ میں ایک ہراس آگئیں احترام کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ یہ کسی اہم مسئلہ پر غور کیا کرتا ہو یا کسی چیز کی تلاش میں ہو اور اسے ستانا اچھا نہیں۔ بچے اس کا پیچھا کرتے اور اس کی چوڑی پیٹھ پر ہتھ مارا کرتے تھے۔ وہ کچھ دور یوں چلتا رہتا تھا گویا اُسے اس سنگ باری کی خبر بھی نہیں۔ پھر یک بیک رُک کر اپنی بھٹی ہوئی ٹوپی یوں ہٹا لیتا تھا گویا ابھی نیند سے جاگا ہو۔

بچے چلاتے تھے: ”اگوشا کی جیب میں موت کی پڑیا! اگوشا کہاں جا رہا ہے؟ وہ دیکھ جیب میں موت سوئی ہوئی ہے!“ پہلے وہ جیب ٹٹولتا تھا۔ پھر جھٹ جھٹ کر زمین سے ہتھ مارا کرتا مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر زور سے ہاتھ گھماتے ہوئے گالیاں بکنے لگتا

تھا۔ اس کی گالیاں بندھی بندھاٹی تھیں اور وہ ہرگز بچوں کی بے نیما گالیوں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ وہ ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کا لٹبا کوٹ اسے روک لیتا اور وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتا۔ اس حالت میں وہ کسی پٹر کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ادھر بچے اس پر لگاتار سنگ باری کرتے جاتے اور ان میں سے سب سے بڑا پاس آکر اس کے سر پر خاک جھونک دیتا تھا۔ لیکن سب سے دردناک نظارہ ہمارے بڑانے مستری گری گوری کا تھا جب اب نیٹ اندھا ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی دراز قد اور ٹھیکیل تھا اور بھیک مانگتے وقت زبان سے کچھ نہ بولتا تھا۔ ایک ضعیفہ اس کا بازو تھامے رہتی تھی۔ کھڑکی کے قریب رُک کر آنکھیں جھکائے ہوئے وہ خستہ آواز میں فریاد کرتی تھی:

”بند ایک اندھے پر رحم کرو!“

لیکن گری گوری کبھی کبھی نہ کہتا تھا۔ اس کی سیاہ عینک درو دیوار کو تانکتی یا راہ گیسروں کو گھورتی رہتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر گویا مہر لگی ہوئی تھی۔ گھنی ڈاڑھی ہاتھوں پر مورچیل کرتی رہتی تھی۔ میں اکثر اسے دیکھتا، لیکن اس کے منہ سے کبھی کوئی آواز نہ سنتا تھا۔ اس بے زبان بوڑھے کا تصور میرے دل کو جھلنی کر دیتا تھا۔ مجھ میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کے قریب جاؤں۔ لیکن جیسے ہی وہ نظر آتا میں دوڑ کر نانی کو اطلاع دیتا: ”گری گوری جا رہا ہے۔“ وہ بیسیجی ہوئی آواز میں پوچھتی: ”اچھا؟ جا، دوڑ کر یہ اُسے دے آ۔“ لیکن میں غصے سے انکار کر دیتا تھا اور وہ خود اٹھ کر دروازے

تک جاتی اور دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ وہ ہنستا تھا۔ ڈاڑھی سلجھانے لگتا تھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولتا تھا۔ کبھی کبھی نانی اُسے باورچی خانے میں بلا کر کھانا کھلاتی اور کھاتے کھاتے وہ ہمیشہ پوچھتا کہ اُکسی کہاں ہے۔ نانی مجھے آواز دیتی لیکن میں بھاگ کر آنگن میں چھپ جاتا۔ میں اس کے پاس نہ جاسکتا تھا۔ اس کے سامنے میں شرم کے بار سے دب جاتا تھا اور جانتا تھا کہ نانی کو بھی ندامت ہے۔ صرف ایک مرتبہ گری گوری کے معاملے میں ہم میں گفتگو ہوئی۔ اسے باہر پہنچا کر نانی روتی ہوئی اندر آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے نرمی سے پوچھا: ”تم اس سے بھاگتے کیوں ہو۔ وہ بھلا آدمی ہے اور تمہیں چاہتا ہے۔“

”نانا اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رہتے دیتے؟“

”نانا؟“ وہ ٹک لگی اور آہستہ آہستہ یہ پیشین گوئی کرنے لگی: ”میں جو کہتی ہوں اُسے یاد رکھنا۔ خدا ہمیں اس گناہ کی سزا دیگا یہ سزا عبرتناک ہوگی۔“

اس کا کہا سچ نکلا۔ کیوں کہ دس سال بعد جب وہ مر گئی تو نانا شہر میں بھیک مانگنے لگا۔ وہ پاگل ہو چلا تھا اور دروازوں سے بھانک کر گزر دیا کرتا تھا: ”اچھے باورچی، راہِ خدا گوشت کا ایک ٹکڑا دے دے۔۔۔ ہشت، دھت“

گوشا اور گری گوری کے علاوہ ”ورنکا“ نامی عورت پر مجھے بڑا ترس آتا تھا۔ وہ بہت بدنام تھی اور اُسے کوئی شرک پر بھی کھڑے ہونے نہ دیتا تھا۔ یہ لبنی تڑنگی عورت، بال کھوئے، میسے

فخش گیت گاتی ہوئی تیوہاروں کے موقع پر نمودار ہوتی تھی۔ اس کی چال ایسی تھی کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ زمین کو چھو رہی ہو یا پاؤں اٹھا رہی ہو۔ ایک بادل تھا جو اڑا آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ مکاؤں یا دوکانوں میں چھپ جاتے تھے۔ اس کی موجودگی جھاڑو کا کام انجام دیتی اور سڑک بالکل صاف ہو جاتی تھی۔ اس کا جہر نیلا اور غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں یوں بھیٹی پڑتی تھیں کہ ڈر لگتا تھا اور وہ آہ بھر کر چیخ لگاتی تھی: ”میرے بچو، بولو، تم کہاں ہو“

میں نے نانی سے اس کے حالات دریافت کیے۔ پہلے تو اس نے بنانے سے انکار کیا مگر بعد میں مختصر واقعہ سنایا: ”یہ عورت وردنوں نامی سرکاری ملازم کی بیوی تھی۔ ترقی حاصل کرنے کے لیے اس نے اسے اپنے افسر کی نذر کر دیا۔ وہ اسے کہیں لے گیا اور دو سال تک یہ غائب رہی۔ جب وہ لوٹی تو اس کے دونوں بچے مر چکے تھے اور اس کا شوہر سرکاری رقوم کے غبن کے جرم میں قید کاٹ رہا تھا۔ غم بھلانے کے لیے یہ شراب پینے لگی اور ہنگامے برپا کرنے لگی۔ ہر تیوہار کو تم اسے حوالات میں پاؤ گے“

صبح ہو کہ گھر میں باہر سے زیادہ سکون تھا۔ سب سے پر لطف کھڑیاں وہ تھیں جب کھانے کے بعد نانا جاکوف کے کارخانے کی راہ لیتا تھا اور نانی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر مجھے بھانت بھانت کے قصے اور میرے باپ کے حالات سناتی تھی۔

جس شام بچپن کی جان اس نے بتی سے بجائی تھی، نانی نے

اس کے لیے ایک مصنوعی ٹانگ بنا دی تھی اور ٹوٹے ہوئے پروں کو بھی سدھار دیا تھا۔ وہ اسے بول سکھایا کرتی تھی۔ اس کا پیچرا کھڑکی کے اوپر لٹکا رہتا تھا اور نانی اس کے آگے گھنٹوں کسی سیدھے سادے جانور کی طرح کھڑی رہتی تھی۔ ہنڈے کے پر کوٹلے سے بھی کالے تھے۔ نانی بار بار اس سے کہے جاتی تھی:

”اچھی شاما کھانے کو کچھ مانگ“

شاما اپنی شریر آنکھوں سے اسے ایک ٹمک دیکھتی اور اپنی چوٹی ٹانگ پیچرے کے اندر پٹکتی تھی۔ پھر اپنی گردن گھما کر وہ کوئل یا بیل کی نقل کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ بتی کی طرح منمناتی یا کتے کی طرح غزاتی تھی۔ یہ سب تھا لیکن وہ انسان کی بولی نہ بول سکتی تھی۔ نانی جھنجھلا کر ڈانٹتی تھی: ”اری یہ کیا ٹیٹیں لگا رکھی ہو ہیں جو کہتی ہوں وہ بول، بیشکا، شاما کو کھانا دو“

شاما اگر پہلا بول نکال لیتی تو نانی کا چہرہ کھل جاتا اور وہ اپنے ہاتھ سے اُسے دانا چگاتے ہوئے بولتی:

”اری چڑیل میں تجھے خوب پہچانتی ہوں۔ تو یوں ہی بنتی ہی ورنہ تجھے کیا نہیں آتا۔ تو تو سب سمجھ کر سکتی ہو“

یہ واقعہ ہو کہ بڑی گھس گھس کے بعد نانی کو کامیابی ہوئی گئی وہ شاما سمجھ رہے ہوئے مجھے بولنے لگی اور نانی کے اشارے پر صاف صاف یہ کہنے لگی: ”اچھی بی سلام“

پہلے اس کا پیچرا نانا کے کمرے میں تھا۔ لیکن بہت جلد نقل مکان کرنا پڑا کیوں کہ وہ نانا کی نقل اڑانے لگی۔ جب نانا

زور زور سے دعا مانگنے لگتا تو شاما پتھرے کی تیلیوں سے چوبچ نکال کر ہیکار نے لگتی: ”تو تو . . . . تیری، تیری!“

نانا کو یہ بات اکھر نے لگی اور ایک بار دعا کے بیچ میں پاؤں ہلک کر وہ غصے سے چلا یا:

”اس شیطان کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا!“

اس گھر میں ہنسنے کھیلنے دن کٹ رہے تھے۔ لیکن گاہے گاہے میں آپ ہی آپ مغموم ہو جاتا تھا۔ یہ غم مجھے نڈھال کر دیتا تھا اور میں دیر تک کسی اندھیری کھائی میں، ہر قسم کے احساس سے محروم اندھوں اور ادھ موڈوں کی طرح بڑا رہتا تھا۔

## باب ۸

ایک روز بے وہم و گمان نانا نے یہ مکان بیچ کر ایک نیا گھر خرید لیا۔ یہ شکستہ ہو چلا تھا اور اس پر سبزہ اُگنے لگا تھا۔ تاہم وہ صاف ستھرا اور خاموش تھا۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جھوپڑیوں کی قطار کے آخر میں یہ گھر تنہا یوں کھڑا ہوا تھا گویا کھیتوں کے بیچ بیچ اس کی داغ بیل رکھی گئی ہو۔

اس میں ایک خاص سج دھج اور رک رکھاؤ تھا۔ سامنے کے حصے پر جو قلعی تھی اُس کا رنگ گہرا گلابی تھا، لیکن اس میں کوئی شوخی نہ تھی۔ اس کے مقابل کھڑکیوں کے آسمانی پٹ بہت بھلے لگتے تھے۔ اہلی اور لیمو کی ٹہنیوں نے چھت کے بائیں حصے پر گونگھٹ سا ڈال دیا تھا۔ آنگن اور پھلدارمی میں پگ ڈنڈیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور وہ آنکھ مجھلی کے لیے نہایت موزوں نہیں باغ خوبصورت تھا۔ چھوٹا سہی مگر پھول پتیوں سے مالا مال تھا ایک کونے میں ذرا سا دھوبی گھر تھا اور دوسری طرف ایک بڑا سا گڑھا جو گھاس سے ڈھنکا ہوا تھا اور اس میں سے دودکش کی نلکی اس امر کی یاد دہانی کر رہی تھی کہ یہاں کبھی دھوبی گھر کا نندو تھا۔ باغ کا بایاں حصہ کزنل اسٹینکوت کے اصطبل کی دیوار سے



گھرا ہوا تھا۔ داہنی جانب بتلنگا منزل تھی اور آخری چھوڑ پڑنا۔ نامی گوالن کے کھیت سے جا ملتا تھا۔ یہ گوالن چغندر سی سُرخ اور زربہ اندام تھی اور وہ اتنا شور مچاتی تھی کہ مجھے اس پر کسی گھڑیال کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی جھوڑی نشیب میں تھی۔ خستہ و خراب اور کائی سے ڈھنکی ہوئی۔ اس کی دونوں کھڑکیاں بڑی ہمدردی سے کھیت خندق اور اُس جنگل کو تاکا کرتی تھیں جو دور سے نیلے باداں کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ میدان میں دن بھر سپاہی دوڑتے پھرتے تھے اور ان کی تلواریں سورج کی لکڑوں میں تیز بجلی کی مانند چمک اٹھتی تھیں ہمارے مکان میں بھانت بھانت کے کرائے داروں کا مجمع تھا پہلی منزل میں ایک تاندار سپاہی اپنی پٹہ اور گداز بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ عورت صبح سے شام تک چٹر چٹر کرتی اور ہنستی رہتی تھی۔ ایک مزین ستار بجاتی ہوئی وہ بڑی سُریلی آواز میں گایا کرتی تھی۔ اس کا محبوب گیت یہ تھا۔

تو بھونرے اور ڈال پر جا

یہ سبھی اور کسی کی ہی !

جب میں پھولوں کا کیا کال

ذرا تو دل کی ڈور لگا !

اور وہ سپاہی گنیش جی کی طرح پالتی مارے کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اپنے نیلے چہرے کو پھلاتا اور کبھی اپنی خونیں آنکھوں کو شرارت سے ٹکاتا تھا۔ اپنی امر اور اُمل چلم کو پتے ہوئے وہ کھانسن کھانسن کر کُتے کی طرح غرا دیا کرتا تھا: ”سبحان . . . اللہ !“

اصطبل اور کبار خانے کے اوپر جو کتادہ کھڑا تھا اس میں بوڑھا  
 بیڑا اپنے گونگے بھینچے اسٹین کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ دونوں شراب کے  
 پھیلے کھینچنے کا کام کرتے تھے۔ اسٹین بڑا آرام طلب تھا اور اس کے  
 چہرے کو دیکھ کر مجھے تانبے کی تھالی کا خیال آتا تھا۔ ان کے ساتھ  
 ایک افسر کا تاتاری اردلی، ولی، رہا کرتا تھا۔ اس کا جسم دوہرا مگر  
 چہرہ محترمی تھا۔ یہ سب لوگ میرے لیے اپنی اپنی جگہ پر اڑکھے تھے  
 لیکن میری سب سے زیادہ توجہ اُس کرائے دار پر تھی جسے لوگوں  
 نے دراصل صاحب کا لقب دے رکھا تھا۔ اس نے گھر کے پھوٹے  
 باورچی خانے کے پاس کی کوٹھری سے رکھی تھی۔ خاصی بڑی کوٹھری  
 تھی جس کی ایک کھڑکی آئینہ میں اور دوسری باغ میں کھلتی تھی۔ وہ  
 ڈبلا تھا اور جھک کر چلتا تھا۔ چہرے کی رنگت سفید اور کالی دارھی  
 دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کی مہربان آنکھیں چنے سے ڈھنکی  
 رہتی تھیں۔ وہ کم سخن اور شرمیلا تھا۔ جب اسے جائے یا کھانے کا  
 بلادیا جاتا تو اس کا تکیہ کلام ہوتا "اے اے دراصل،" چنانچہ تانی نے  
 اس کا نام "دراصل صاحب" رکھ دیا۔ وہ مجھ سے کہتی: الکی دراصل  
 صاحب سے کہو کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ یا: میاں دراصل، تم نے  
 تو کچھ کھایا ہی نہیں۔

اس کا کمر صندوقوں اور موٹی موٹی کتابوں سے اٹا ہوا تھا  
 یہ کتابیں روسی زبان میں تھیں اور انہیں دیکھ کر مجھے سخت حیرت  
 ہوتی تھی۔ رنگ برنگے عرقوں سے بھری ہوئی بوتلیں، تانبے اور لوہے  
 کے ڈلے اور سیسے کی چھڑیں الگ جلوہ گر تھیں۔ سرخ چمڑے کی

صدی اور ایک بھوری پتلون پہنے جس میں ہزاروں قسم کے رنگ لگے ہوئے تھے، بدلو میں سنے ہوئے اور بالکل اولِ حلول بنے ہوئے وہ صبح سے رات تک کبھی سیٹا کلاتا رہتا، کبھی چھوٹی سی ترازو پر انواع و اقسام کی چیزیں تولتا اور کبھی اُننگلی جلا کر چیخ پڑتا اور پھر خاموشی سے اُسے پھونکنے لگتا تھا۔ بیج بیج میں وہ دیوار کے ایک نکتے کے قریب جاتا، اپنی صینک صاف کر کے کاغذ کو اس غور سے نکتے لگاتا کہ اس کی نیگیل پیلی ناک اس سے بھڑ جاتی تھی۔ یا وہ یک بیک کمرے کے بیج میں یا کھڑکی کے پاس جا کر سر اٹھائے اور آنکھیں بند کیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی محویت کے عالم میں مُت بنا کھڑا رہتا تھا۔

میں دھوبی گھر کی جھت پر چڑھ جاتا تھا تاکہ آنگن کے اُس پار دیکھ سکوں۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے اندر اسپرٹ کا چولہا میز پر جلنا ہوا نظر آتا تھا اور وہ خود ایک بیٹی ہوئی نوٹ بک میں کچھ لکھتا ہوتا تھا۔ اس کا چشمہ ایک نیل گوں روشنی میں جگمگاتا تھا۔ اس آدمی کی پُر اسرار حرکتیں مجھے جھت پر گھنٹوں معلق رکھتی تھیں۔ اور میرا تجسس ناقابلِ بیان ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہاتھ باندھے جھت کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑکی کے پاس یوں کھڑا ہو جاتا تھا گویا اس میں چُن دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے اس احساس سے سخت غصہ آتا تھا کہ اسے میرے وجود کی خبر بھی نہیں۔ یک بیک میز کی طرف مڑ کر وہ پھر کھڑ پڑ شروع کر دیتا تھا۔

لگ بھگ وہ زرق برق پوشاک میں ملیوس ادا میر ہوتا تو میں اُس

ضرور ڈرجاتا۔ لیکن وہ غریب تھا۔ اس کے کوٹ پر قمیص کا سیلا کار  
نظر آتا تھا۔ اس کی پتلون سیلی تھی اور اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔  
اس کے ننگے پاؤں میں بڑی موٹی چپل گھس گئی تھی۔ غریب نہ خطرناک  
ہوئے ہیں نہ طاقت ور۔ ان کے تئیں نانا کی نفرت اور نانی کے کرم  
آئینہ اتقات نے مجھے یہ بات سکھادی تھی۔

گھر بھر میں وہ اصل صاحب کی کوئی قدر نہ تھی۔ سب ان کا  
مذاق اُڑاتے تھے۔ سپاہی کی کھلندڑی بیوی نے اس کا نام سفید  
ناک رکھا تھا۔ چچا بیڑا اُسے کیمیاگر کہتا تھا اور نانا اُسے جادوگر  
کے نام سے یاد کرتا تھا۔

میں نے نانی سے پوچھا: ”یہ بیمار کرتا کیا ہے؟“  
”یہ تیرے پوچھنے کی بات نہیں ہے۔ زیادہ بک بک نہ کر!“  
مگر ایک روز میں ہمت باندھ کر اس کی کھڑکی تک پہنچ گیا اور اپنے  
مہول کو چھپا کر پوچھ ہی بیٹھا: ”آپ کیا کرتے ہیں؟“  
وہ چونک پڑا اور عنیک سرکا کر دیر تک میرا معائنہ کرتا رہا۔  
پھر اپنا ہاتھ پھیلا کر جو چھالوں کے نشانوں سے داغ دار ہو گیا تھا  
بولاً ”اوپر چڑھ آؤ“

اس کی اس تجویز نے کہ بجائے دروازے کے کھڑکی سے ہی  
اندرا اُتر آؤں، اس کی عزت میرے دل میں بڑھادی۔ وہ ایک  
صندوق پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہاں سے اُٹھ کر  
وہ میرے پاس آیا اور ویرے سے پوچھا:  
”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

مجھے بڑا اچنبھا ہوا کیوں کہ میں روز چار مرتبہ ایک ہی میز پر اس کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔

”میں مالک مکان کا نوا سا ہوں۔“

اپنی انگلیوں کو گھماتے ہوئے وہ بولا: ”ایں، دراصل“! وہ چُپ ہو گیا تھا، اس لیے اُسے سمجھانے کی غرض سے میں نے کہا: ”میں کِشَن نہیں ہوں — میرا تعلق پشکوف گھرانے سے ہے؛ شبہ آمیز لہجے میں وہ ڈہرانے لگا: ”پشکوف! ہیں، دراصل!“ مجھے الگ ہٹا کر وہ میز کی طرف گیا اور حکم دیا: ”خاموش بیٹھے رہنا!“ دیر تک میں غور سے اس کی کارروائیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ تانبے کا ایک ڈلائنجنے میں ڈال کر اس نے دبایا اور اس کے ذرے سونے کے ریزوں کی طرح ایک کاغذ پر گرنے لگے۔ انھیں اس نے اپنی ہتیلی پر جمع کیا اور ان میں کوئی سفید سفوف ملا کر ایک برتن میں ڈال دیا جس میں کوئی عرق پڑا ہوا تھا۔ یہ مرکب آن کی آن میں جوش کھا کر دھنواں دینے لگا اور اس سے ایسی چراغ نکلی کہ میں کھانستے کھانستے ہلکان ہو گیا۔

جادوگر نے فخر سے کہا: ”بُری بدبو ہے، کیوں بھئی؟“

”اور نہیں تو کیا؟“

”بہت خوب! صاحب زادے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نسو“

کا میاب رہا۔“

میں نے جی ہی جی میں سوچا کہ یہ اترانے کی کیا بات ہے اور

سنجی سے بولا، ”جس چیز کی بو بُری وہ اچھی ہو ہی نہیں سکتی“

اس نے آنکھ مار کر جواب دیا، ”میاں، یہ کوئی کلتیہ نہیں ہے۔ اچھا — کیا تم چوڑ کھیلتے ہو؟“

”ہاں، ہاں“

”تم چاہتے ہو کہ میں گوثیاں بنا دوں؟“

”لایسے دیکھو تو سہی۔“

”مگر میں اس شرط پر گوثیاں تمہیں دوں گا کہ آئندہ کبھی یہاں

نہ آؤ۔“

غصے کے مارے تن بدن میں آگ لگ گئی: ”میری جوتی اب

آپ کے ہاں آتی ہے۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا اور باغ میں چلا گیا۔

یہاں نانا سیب کے پیڑوں کو کھا دے رہا تھا کیوں کہ پت جھڑکا موسم تھا اور پتیاں گر چکی تھیں۔ مجھے قینچی تھا کہ اس نے کہا: ”جاؤ بیری کے پودوں کی پتیاں کتر ڈالو۔“

میں نے پوچھا: ”در اصل صاحب آخر کرتے کیا رہتے ہیں؟“

”کرتے کیا ہیں — کمرے کا ستیاناس! فرش جلادیا، پردے

پھاڑ دیے۔ میں اُن سے کہہ دوں گا کہ بوریہ بدنا اُٹھائے۔“

قینچی چلاتے ہوئے میں نے بھی ہامی بھری: ”ان کی بڑی عنایت ہوگی اگر وہ اپنا ڈیرا اُٹھالے جائیں۔“

لیکن میں نے اپنے فیصلے میں بڑی جلدی کی تھی۔

برسات کی شاموں کو جب نانا باہر ہوتے تھے، نانی تمام کرائے

داروں کو باورچی خانے میں چائے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ بیٹلے والے

افسر کا اردلی اور بی پتر دانا کا آنا تو ضروری تھا۔ سپاہی کی، جنپل

بوی بھی کبھی کبھار آجاتی تھی اور کوئی آئے یا نہ آئے، دراصل صاحب اپنی مخصوص جگہ پر بے حرکت بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گونگا اسٹین تاناری کے ساتھ تاش کھیلا کرتا تھا۔ دلی اس کی ناک کے نیچے پتا ٹیک کر چلاتا تھا: ”مٹھاری چال ہو“

چچا پیٹر ایک شیرمال اور جام کا ڈبائیے ہوئے آتے تھے۔ شیرمال کاٹ کر اور اس پر جام لگا کر وہ نہایت نفاست سے ہر مہمان کے سامنے پیش کرتے تھے:

”وڈری عزت افزائی ہوگی اگر آپ یہ حقیر تحفہ قبول فرمائیں!“ جب کبھی کوئی ایک ٹکڑا لے لیتا تو پیٹر بہت غور سے اپنی ہتیلی کو دیکھتا اور اس پر جام کی ایک آدھ بوند نظر آتے ہی اُسے جھٹ چاٹ لیتا تھا۔

پترونا ایک بوتل میں شیریں کی شراب اور سپاہن میوے اور سٹھائیاں لاتی تھی۔ اس جشن کو دیکھ کر میری پیاری نانی کی خوشی کی انتہا نہ رہتی تھی۔

دراصل صاحب سے اس ناگوار ملاقات کے چند روز بعد ایک ایسی ہی دعوت ہوئی۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا سنسنی رہی تھی اور پیٹر دیواروں کو اپنی ہتھنیوں سے جھاڑ رہے تھے۔ مگر باورچی خانہ گرم اور آرام دہ تھا۔ ہم سب مل جل کر بیٹھے نانی کی کہانیاں سن رہے تھے۔ خلافِ عادت نانی کا لطف و کرم دگنا ہو گیا تھا اور وہ بیکے بعد دیگرے نئے نئے حقے سناتی جاتی تھی۔ ہم سب میں باہمی ہمدردی

کی لہری دوڑ گئی تھی۔ نانی تندور کے کنارے پاؤ لٹکاتے ہماری طرف جھٹک کر بیٹھا کرتی تھی اور ایک جھللاتا ہوا چراغ اس کے چہرے کو آجال دیتا تھا۔ جب کبھی اُسے داستان گوئی کا شوق اٹھتا تو یہ اسی آسن پر بیٹھتی تھی۔ وہ کہتی تھی: ”میں کسی اونچے مقام پر بیٹھ کر زیادہ اچھی طرح باتیں کر سکتی ہوں؟“

میں تندور کی چوڑی سی سیڑھی پر نانی کے پاؤ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ دراصل صاحب میرے قریب ہی تھے۔ نانی نے ”فقیر میون اور سپاہی ایوان کی داستان چھیڑ دی“

”گور دین نامی ایک سورا تھا جس کا قلب سیاہ اور دل بھر کا تھا۔ اُسے صداقت اور شرافت سے نفرت تھی اور وہ خلقِ خدا پر بڑا ظلم توڑتا تھا۔ وہ میرون فقیر سے بہت ڈرتا تھا اور اس کی جان کا بیری تھا۔ کیوں کہ یہ اللہ والا انسانوں کا پیارا تھا۔ گور دین نے اسے قتل کرنے کا تہیہ کیا اور ایوان نامی نامور سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ اس فقیر کو مار ڈال۔ ایوان اپنی تلوار مانجھ کر فقیر کے پاس پہنچا اور باتیں بنانے لگا کہ میں آپ کی زیارت کو آیا ہوں۔ گور میون اس کا منشا سمجھ گیا اور ہنس کر بولا کہ او سنگار یوں جھوٹ بولنے سے کیا حاصل۔ ایوان یہ سُن کر نادام ہوا اور اقرار کیا کہ سچ ہی میں آپ کی جان لینے آیا ہوں۔ مجبور ہوں کہ میرے مالک کا یہ حکم ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تلوار کا وارہ کروں آپ آخری دعا مانگ لیجیے۔ فقیر نے جواب دیا کہ میری دعا میں دیر لگے گی، اس لیے تو اس کا انتظار نہ کر اور اپنا کام کر۔ مگر ایوان اصرار کرنے لگا اور قسم کھائی



کہ دعا میں جتنی بھی دیر لگے گی میں یہاں کھڑا رہوں گا۔  
 یہ سن کر میردن فقیر سجدے میں گر پڑا۔ دن ختم ہوا، رات آئی  
 اس طرح سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن میردن بھوکا  
 پیاسا دعا مانگتا رہا۔ اور خدا کی قدرت کہ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔  
 البتہ ایوان کی ننگی تلواریں زنگ لگ گیا اور وہ کھڑے کھڑے پتھر  
 گیا۔ قدرت نے اُسے ایسی سزا دی کہ وہ اسی جگہ مورت بنا کھڑا ہی  
 نہ چل سکتا ہو نہ ہل سکتا ہو۔“

اور اس مورت کے مُنہ سے ایک یہی آواز آتی ہے  
 جو ظالم کے غلاموں کے لیے ایک درس عبرت ہے۔  
 جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو اسی بندے  
 نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہے۔  
 اور فقیر میردن اب بھی سجدے میں پڑا ہوا ہمارے لیے دعا کرتا ہے۔“

.....

یہ قصہ جو منظوم تھا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ  
 کسی وجہ سے دراصل صاحبِ مشغل ہو گئے ہیں۔ وہ کبھی اپنی انگلیاں  
 چٹھاتا، کبھی چشمہ ادھر ادھر گھمانے لگتا۔ اُسے ہلا ہلا کر وہ نظم پڑھا  
 دیتا سر ہلا کر اپنی آنکھیں ہتیلی سے ملنے لگتا۔ پھر رومال سے خواہ مخواہ  
 اپنی پیشانی یوں پونچھنے لگتا گویا وہ پسینے سے شرابور ہے۔ اگر کوئی اور  
 کھانسی یا ذرا سی بھی آواز کرتا تو یہ دانت نکال کر ”شی...“ کہہ  
 اُٹھتا تھا۔ جب نانی خاموش ہو گئی اور آستین سے مُنہ کا پسینہ پونچھنے  
 لگی تو، اصل صاحب اُچھلے اور ہاتھ پھیلا کر چیخ اُٹھے،

”بہت خوب! اس داستان کو تو قلم بند کرنا چاہیے . . . . .  
کس قدر پُر معنی ہے . . . .“

ہم نے دیکھا کہ وہ آپ ہی آپ رورہا ہے۔ اس کی آنکھیں آبِ دیدہ تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ یہ نظارہ اتنا ہی حیرت ناک تھا جتنا کہ دردناک۔ لیکن ساتھ ساتھ جب وہ ادھر ادھر پھد کئے لگا اور عینک کی کمائی ناک کے آگے بچانے لگا کیوں کہ بڑا ہٹ میں وہ کان تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو بوڑھا پیڑ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ دوسرے لوگ عیب اُلجھن میں پڑ گئے۔ نانی نے ہلکے کر کہا:

”کھنٹے میں بُرائی کیا ہے! اور یہ ایک کیا مجھے ایسے ایسے سیکڑوں تھے“

باد میں۔

مگر دراصل صاحب اُسی جوش کے عالم میں بولے: ”نہیں نہیں مجھے تو یہی قصہ جا ہے۔۔۔۔۔ یہ روسی ہی۔۔۔ بالکل روسی!“

ایرکمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر داہی تباہی بکنے لگا۔ اور ایک ہاتھ میں عینک تھامے دوسرے سے گویا نیکھتا سا جھلنے لگا۔ کچھ دیر وہ اسی مشتعل انداز میں تفریر کرتا گیا۔ اس کی آواز نہ پنچم سُر کو پہنچ گئی اور سیرینک کر وہ گرج اٹھا:

”جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو اسی بندے  
نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہی۔“

”سچ بالکل سچ!“

یک بیک وہ چُپ ہو گیا۔ اس کی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک بار ہم سب کو دیکھ کر مجرموں کی طرح سر ہٹا کر کہہ رہا تھا:

باہر چلا گیا۔

سب مہمان قہقہہ مار کر ہنسنے لگے اور ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ نانی تندور کے کونے میں دبک کر گہری سانس بھرنے لگی۔

اپنے موٹے موٹے سُرخ ہونٹوں کو ہتیلی سے مل کر پتروانے کہا: ”اسے مایو لیا ہو!“

لیکن پیڑ نے جواب دیا: ”نہیں، یہ بھی اس کا ایک خبط ہو!“  
 نانی تندور سے اُٹھ آئی اور چائے کا پانی رکھنے لگی۔ پیڑ نے آسمان سے یہ رمز سمجھائی: ”خدا کی خلقت خبیثوں سے خالی نہیں۔“  
 تاتاری دلی بات کاٹ کر غرا پڑا: ”سب کنوارے بیوقوف ہوتے ہیں۔“  
 اس پر ایک فرمالینشی قہقہہ پڑا۔ پیڑ کا فلسفہ ختم نہ ہوا تھا: ”وہ سچ پچ رو رہا تھا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی۔“

مجھے یہ لعن طعن بالکل نہ بھائی۔ میرا دل بھڑک اُٹھا۔ دراصل صاحب کی ان حرکتوں سے مجھے سخت حیرت ہوئی لیکن ان پر بہت ترس بھی آیا۔ میں کسی طرح اُن ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کی یاد نہ بھلا سکا۔ رات بھر وہ باہر رہا اور دوسرے دن دوپہر کو جب گھر لوٹا تو وہ وحشت زدہ بھی تھا اور نادام بھی۔

کسی ایسے بچے کی طرح جسے اپنی غلطی کا احساس ہو، اس نے نانی سے کہا: ”رات کو میں نے بھی کیا تماشا کیا! آپ ناراض تو نہیں ہیں؟“

”اس میں ناراضی کی کیا بات ہو؟“

”میں آپ کی بات کاٹ کر . . . . . بیچ میں بکنے جھکنے لگا تھا۔“  
 ”ہنیں اس کا کسی نے بُرا نہیں مانا۔“

میں سمجھ گیا کہ نانی اس نے ڈرتی ہے۔ وہ اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر باتیں نہیں کر رہی تھی اور خلاصہ فطرت اس کی آواز دہی ہوئی تھی۔

وہ نانی کے قریب آیا اور بڑے بھولے پن سے کہنے لگا :  
 ”آپ جانتی ہیں کہ میں کتنا اکیلا ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ لیکن ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ میری روح آپ ہی آپ تڑپ اٹھتی ہے گویا اس میں نشتر لگ گیا ہو۔ ایسے موقعوں پر پیڑ پودوں اور سنگ و خشت سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔“

نانی اس کے پاس سے ہٹ گئی اور جواب دیا :

”تھیں شادی کر لینا چاہیے۔“

”آئیں۔“ — یہ کہہ کر اور منہ بنا کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ

باہر بھاگ گیا۔

نانی نے ناک بھوں چڑھا کر اُسے دیکھا اور ناس سونگھتے ہوئے مجھے یہ ڈانٹ بلائی : ”خبردار جو اس سے میل جول بڑھایا۔ سنایا نہیں؟ خدا جانے یہ کس قماش کا انسان ہے۔“

لیکن اس سے میری دل چسپی اور بھی بڑھ گئی۔ میں اکیلا

ہوں، یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کسی اُداسی چھا گئی تھی۔ ان الفاظ کا مفہوم کچھ میں ہی سمجھ سکتا تھا اور میرے دل پہ چوٹی لگی۔

اس کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

آنگن سے میں اس کے کمرے میں جھانکنے لگا۔ اس میں کوئی

نہ تھا اور وہ ایسا کباڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا جس میں دنیا بھر کی غیر ضروری چیزیں جمع کر دی گئی ہوں — اتنی ہی غیر ضروری جتنا کہ ان کا مالک۔ میں باغ کی طرف آیا اور وہاں اُسے کھائی کے پاس بیٹھا پایا۔ وہ ایک ادھ جلعے تختے پر سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ کہنی گھٹنوں پر ہاتھ سر کے پیچے بندھے ہوئے جسم آگے جھکا ہوا۔ آدھا تختہ زمین میں دھنسا ہوا تھا اور آدھا کھائی کے اوپر کائی سے ڈھنکا ہوا تھا۔ اُسے اس عاجزی کی کیفیت میں دیکھ کر مجھے اور بھی ترس آیا کچھ دیر تو اُسے میری موجودگی کی اطلاع بھی نہ ہوئی وہ اپنی مدھم مگر تیز آنکھوں سے میرے پرے کسی نقطے کو گھور رہا تھا۔ پھر یکایک جڑجڑی آواز میں اس نے پوچھا:

”تمہیں کچھ چاہیے؟“

”نہیں تو۔“

”پھر یہاں کیوں آئے؟“

”مجھے خود نہیں معلوم۔“

اپنی مینک اُتار کر اور اُسے اپنے رنگ برنگے رومال سے

پونچھ کر وہ بولا: ”اچھا، یہاں جڑھ آؤ۔“

جب میں پاس بیٹھ گیا تو میری گردن میں ہاتھ ڈال کر اس نے

مجھے اپنے سے چٹایا۔

”لو جب رہنا اور نہ ہلنا چاہتا۔ تم اس طرح بیٹھ سکو گے۔“

”تم ہندی تو نہیں ہو؟“

”کیوں نہیں؟“

”ایں، دراصل“

ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ شام خوش گوار مگر سو گوار تھی۔ آخری گرمیوں کی ایک شام جب زمین گل پوش تو ہوتی ہو، لیکن خزاں کے آثار بھی نمایاں ہو جاتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ ایک نہ ایک بوٹا مڑ جاتا ہو۔ تابستان کی جاں نواند مہک کی بجائے زمین سے سِلن کی بو آنے لگتی ہو۔ ہوا میں عجیب سی شفافی آ جاتی ہو اور پرندے سُرخ آسمان میں اپنی کھوئی ہوئی منزل کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ہر طرف اُداسی پھیلا دیتے ہیں۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی بھی آواز نہ، مثلاً چڑیوں کی پھر پھڑاہٹ یا گرے ہوئے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، ایسا شور پیدا کرتی تھی کہ آدمی چونک پڑتا تھا اور پھر یہ آواز اُس عمیق سکون میں غائب ہو جاتی تھی جو دنیا پر چھایا ہوا تھا اور دل کو مبہوت کر رہا تھا۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جن میں معصوم و نرہت افزا خیالات پیدا ہوتے ہیں — کمال نازک، تارِ عنکبوت سے زیادہ نرمل، ناقابلِ بیان، ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح وہ دم کے دم اوجھل ہو جاتے ہیں اور بچتے بچتے روح میں طال کی مشعل سی جلا دیتے ہیں جو تسکین بھی دیتی ہو اور خلش بھی۔ روح گویا آگ کا مندر ہو۔ اور وہ اتنی حساس ہو کہ ایک ہلکا سا تاثر بھی رہتی زندگی کے لیے اس پر قبضہ کر جاتا ہو اس انوکھے کرائے دار کے پاس بیٹھے بیٹھے اس کے ساتھ

سیب کے پٹر کی سیاہ ٹہنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ننھے ننھے سے پھل شاخوں پر جھول رہے تھے، بجلے قطار باندھے اڑ رہے تھے اور اوپر لال آکاس کا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ کالے پیلے بادل، جن کی کنارہ سرخ ہو گئی تھی، کھیتوں کے اوپر منڈلا رہے تھے اور کوسے ان کے نیچے ان گھونسلوں کی جانب اڑ رہے تھے، جو قبرستان میں تھے۔

کتنا نظر فریب تھا یہ منظر۔ خصوصاً آج کی شام کو اس کا حُسن اور بھی بڑھ گیا تھا اور میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ بیج بیج میں ایک لمبی سانس لے کر میرا سامتھی کہہ دیتا تھا: "میاں کیا لطف کا سماں ہے۔" ہی یا نہیں؟ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟ لیکن جب آسمان پر تاریکی جھاگئی اور جھٹ پٹے کی سیلن ہر طرف پھیل گئی تو اس نے کہا:

"مجبوری ہے۔ اب تو اندر جانا ہی ہوگا!"

باغ کے پھاٹک پر رُک کر وہ دھیرے سے بولا: "تمہاری ثانی بڑی اچھی عورت ہے۔ کیا کہتے ہیں!" آنکھیں بند کر کے مسکراتے ہوئے وہ بڑے مزے میں وہ بند گانے لگا:

اور اس مورت کے مُنہ سے ایک یہی آواز آتی ہے  
جو ظالم کے غلاموں کے لیے ایک درس عبرت ہے  
جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو ای بندے  
نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہے۔

رُکے، ان الفاظ کو کبھی نہ بھولنا!

مجھے آگے کر کے اس نے پوچھا: ”تمہیں لکھنا آتا ہے؟“

”جی نہیں“

”تمہیں لکھنا ضرور سیکھنا چاہیے۔ جب سیکھ لو تو نانی کی کہانیاں

قلم بند کر ڈالو۔ ایک روز تمہیں ان کی قیمت کا اندازہ ہوگا“

اس طرح ہم میں دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد جب کبھی جی چاہتا میں دراصل صاحب کے یہاں پہنچ جاتا۔ کسی بچے یا تھیلے پر بیٹھ کر میں اسے سیساتا بنا گلاتے خوبصورت سی ہتوڑی سے لوہا پیٹتے یا باریک سی آدھی سے کچھ کاٹتے ہوئے دیکھا کرتا تھا اپنی نازک سی ترازو پر وہ بڑی نفاست سے ہر چیز تولتا تھا سفید پتیلیوں میں ایسے سفوف ڈالتا کہ سارا کمر ڈھنویں اور بدبو سے بھر جاتا تھا۔ پھر ماتھے پر بل ڈال کر وہ ایک موٹی سی کتاب کی چھان بین کرتا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے گنگناتا جاتا تھا:

”گلاب جل دو۔۔۔“

”آپ کر کیا رہے ہیں؟“

”میاں میں کوئی چیز تیار کر رہا ہوں“

”آخر اس کا نام بھی تو معلوم ہو؟“

”ایں۔۔۔ میں تمہیں یہ نہ بتاؤں گا۔ بھکاری سمجھ میں بھی

نہ آئے گا“

”نانا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شاید آپ جعلی سکتے بنایا کرتے

ہیں۔“

”بھارے نانا؟۔۔۔ ایں! اماں! انہیں تو زبان چلانے سے



کام ہی۔ ورنہ پیسہ بھی کوئی چیز ہی، یہ تو ہاتھ کا میل ہی۔“

”لیکن پیسہ نہ ہو تو روٹی کہاں سے ملے؟“

”یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ روٹی کے لیے پیسے کی ضرورت ہی۔“

”وہ اور گوشت کے لیے بھی۔“

”وہاں گوشت کے لیے بھی۔“

وہ اس بھولے پن سے مسکرایا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا اور

میرے کان کھینچ کر بولا: ”ابے تو بھی کیا محنت ہی! بابا تو جیتاں ہارا،

لیکن میں بحث نہیں کرنے کا۔“

کبھی وہ کام و ام بند کر کے میرے پاس بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے

باہر دیکھنے لگتا تھا کہ پانی کس طرح برس رہا ہو گھاس کیسے اُگ رہی

ہی، پتیاں کیسے مرجھا رہی ہیں۔ دراصل بہت کم سخن تھا لیکن کہتا تھا

پتے کی۔ اگر وہ کبھی میری توجہ کسی چیز کی طرف منعطف کرنا چاہتا

تو زبان سے کچھ کہنے کے بدلے کہنی اور آنکھ سے کام لیتا۔ آنگن میں

پہلے میرے لیے کوئی چیز جاذبِ نظر نہ تھی۔ لیکن اس کا ایک جلد

یا ایک اشارہ چیزوں کی رنگت بدلنے کو کافی تھا اور اب ہر معمولی

شے بھی میرے لیے قابلِ غور بن گئی۔ ایک بتی دوڑتے دوڑتے

پانی کی باؤلی کے پاس پہنچی اور اس میں اپنی برچھائیں دیکھ کر اس

طریقے سے پہنچ جھاڑا کہ گویا اُسے ملنا چاہتی ہی۔

دراصل نے آہستہ سے کہا: ”پتیاں مکار اور خود پسند ہوتی ہیں۔“

ایک اکیلے مرغا باغ کی بارٹھ کے قریب جا کر یوں پر پھڑپھڑانے

لگا گویا ابھی اُڑ جائے گا اور اسی کوشش میں گر پڑا۔ اُٹھ کر وہ

غصے سے بانگ دینے لگا۔

”گھنڈی اور بیوقوف سب ہی!“

تاتاری ولی یکپڑ میں کسی بوڑھے ٹٹو کی طرح چل رہا تھا۔ آنکھیں  
پھپھکتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہاں سے سورج  
کی پیلی کرنیں اس کے کوٹ کے پتیل کے ٹٹوں کو جھل جھلا رہی تھیں۔  
تاتاری ایک جگہ رُک کر اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے انہیں یوں  
گھمانے لگا گویا بقول دراصل صاحب ”وہ سونے کے تمغے ہیں“

دراصل سے میری دوستی گہری ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ خواہ میں  
غم گین ہوں یا مسرور، اس کی صحبت میرے لیے ناگزیر ہو گئی۔ وہ  
خود تو بہت کم بولتا تھا لیکن مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ  
جو جی میں آئے بکتا رہوں۔ اس کے برعکس نانا ایسے موقعوں پر فوراً  
ڈانٹ دیا کرتا تھا: ”اے آدمی ہی یا بن چکی! جب دیکھو ٹر ٹر کیسے  
جاتا ہے!“

نانی بھی اپنے خیالات میں ایسی لگن رہتی تھی کہ نہ کسی دوسرے  
کی سُنتی تھی اور نہ اس کی باتوں کو ذہن نشین کرتی تھی۔ لیکن دراصل  
بہت غور سے میری کوا اس سُنتا تھا اور اکثر مسکرا کر کہتا تھا: ”بچو،  
یہ تو غلط ہے، تم بے پردگی اُڑا رہے ہو“

یہ مختصر جملے بھی وہ اسی وقت استعمال کرتا تھا جب وہ از بس  
ضروری ہوتے تھے۔ وہ میرے دل و دماغ کے اندر بیٹھ کر سب  
کچھ دیکھ لیتا تھا اور میرے لب پر کوئی بیکار کلمہ آنے سے پہلے ہی  
وہ سمجھ جاتا تھا — اور صرف یہ دو لفظ کہ کر ان کی جڑ کاٹ دیتا تھا

— ”سفید جھوٹ!“

کبھی میں اس کی ساحرانہ نمکنہ سنجی کا امتحان لینے کے لیے جھوٹ موٹ کوئی قصہ گھڑ کر یوں سُنا تا تھا گویا وہ سچ مچ بیش آیا ہے۔ لیکن چند جملے سُنتے ہی وہ سر ہلانے لگتا تھا:

”میاں، یہ تو صریحا غلط ہے“

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”میں اندازہ لگا سکتا ہوں“

جب نانی کنوئیں سے پانی لینے جاتی تو مجھے بھی ساتھ لے لیتی تھی۔ وہاں ایک مرتبہ ہم نے دیکھا کہ باپنج شہرِ یے ایک کسان کو پٹک کر یوں پیٹ رہے ہیں گویا کتے ایک دوسرے کو بھنبوڑ رہے ہوں۔ یہ دیکھتے ہی نانی نے دونوں لگڑے تو پھینک دیے اور جڑے کی لائٹھی لے کر کسان کی مدد کو دوڑی اور پکار کر مجھ سے کہا: ”تو بھاگ جا!“

لیکن میں ڈر گیا اور نانی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ شہریوں پر ہیں پتھر برسائے لگا اور نانی نے ان کی کھوپڑیوں کی خاطر اس لائٹھی سے کی۔ اتنے میں اور لوگ بھی آگئے اور یہ بد معاش فرار ہو گئے۔ نانی مجروح کسان کے زخموں کو دھونے لگی۔ جب اس کی کٹی ہوئی انگلیوں سے خون کی ایسی دھار نکلی کہ نانی کا چہرہ تر تر ہو گیا اور وہ کبھی کھانسنے اور کبھی کراہنے لگا، تو مجھے شدید کراہت ہوئی۔ نانی بھی چیخ پڑی اور مہرِ حقیر کا بننے لگی۔

گھروٹے ہی میں اپنے دوست کے پاس بھاگا گیا اور اسے یہ واقعہ سُنانے لگا۔ وہ کام بند کر کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور

اپنی منیک کے اندر سے مجھے گھورنے لگا۔ یک بیک بات کاٹ کر اس نے ایک خاص مؤثر انداز سے کہا: ”بہت خوب — بہت خوب!“ مجھ پر اس واقعہ کا ایسا اثر تھا کہ ان الفاظ کی پروا نہ کر کے اپنی داستان سُناتا گیا۔ لیکن میری گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ کمرے میں ہٹنے لگا: ”بس — میں اور کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ میرے بچے آج وہ کہنے کی بات تھی سو تم کہ چکے۔ سمجھے؟“

مجھے بہت بُرا لگا اور میں چُپ ہو گیا۔ لیکن بعد میں جب اس واقعہ پر غور کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اُس نے عین مناسب موقع پر میری زبان بند کر دی تھی۔ میں وہ سب کچھ کہ چکا تھا جو ضروری تھا۔

اس نے مجھے یہ رائے دی: ”اس واقعہ کا زیادہ ذکر نہ کرو۔ گزشتہ واقعات کی یاد میں کیا رکھا ہو۔“

کبھی جوش میں وہ ایسی ایسی باتیں کہ جاتا تھا جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں نے اسے اپنے ایک دشمن کا حال سُنایا۔ یہ موٹا تازہ لڑکا لڑائی میں نہ مجھ سے ہارتا تھا اور نہ مجھے ہراسکتا تھا۔ دُرُ اصل نے میرے شکوے کو غور سے سُنا اور پھر یہ نصیحت کی: ”اُس کا وِزوری سے کیا حاصل! طاقت کا راز پھرتی میں ہے۔ جو سب سے زیادہ تیز ہے وہ سب سے قوی ہے۔“

اگلے اتوار کو میں نے ایسی پھرتی دکھائی کہ میرا رقیب فوراً شکست کھا گیا۔ اب اپنے عجیب دوست کی نصیحتوں کی مین بہت قدر کرنے لگا۔

”تمہیں ہر معاملے کو پکڑ میں لانا چاہیے۔ چیزوں پر عبور حاصل کرنا بہت ہی دقت طلب ہے۔“

اُس وقت میری سمجھ میں یہ معنی نہ آیا۔ لیکن بلا ارادہ یہ قول مجھے یاد رہ گیا کیوں کہ اپنی سادگی کے باوجود وہ پُر اسرار معلوم ہوتا تھا۔ چیزوں کو پکڑ میں لانا کیا مشکل تھا! پتھر روٹی یا ہتھوڑی کو گرفت میں لینے کے لیے کیا کسی خصوصیت کی ضرورت تھی۔

لیکن گھر میں دراصل صاحب کی مخالفت بڑھنے لگی۔ سپاہن کی بلی اور سب کے پاس تو جاتی تھی لیکن میرے دوست سے جی چڑاتی تھی اور اس کی پکار پر کوئی دھیان نہ دیتی تھی۔ اس پر میں نے بلی کو خوب ٹھونکا اور عاجزی کی کہ اس سے نہ ڈرا کرے۔

دراصل نے بتلایا کہ بلی میرے پاس اس لیے نہیں آتی کہ میرے کپڑوں سے بھانت بھانت کی بو آتی ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سب لوگ، نانی تک، اس کی اور ہی تعبیر کرتے تھے اور اس پر نہایت شرم ناک بہتان لگاتے تھے۔

نانی مجھے ڈانٹا کرتی تھی: ”تو اس کی دُم کے پیچھے کیوں لگا رہتا ہے! دیکھ لیجیو، وہ تیرا سنیا ناس کر کے رہے گا۔“ نانا کو یقین کامل تھا کہ یہ کراہ مار کوئی اٹھائی گیر ہے اور جب کبھی میں اُس سے ملتا تو وہ بُری طرح میری گوشالی کرتا تھا۔

اپنے دوست سے میں نے یہ توہنیں کہا کہ مجھے اس سے ملنے کی ہمت نہ تھی۔ لیکن گھر والے اس کی بابت جو کچھ کہتے تھے وہ سب صفائی سے سنا دیا۔

”نانی بھی تم سے ڈرتی ہے، سمجھتی ہے کہ تم جادوگر ہو۔ نانا کہتے ہیں کہ تم خدا کے بیڑی ہو اور تمہیں یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔“

اُس نے یوں ہاتھ ہلایا گویا کھٹی اڑا رہا ہو۔ اس کے سفید چہرے پر مسکراہٹ آئی لیکن اس کی آنکھوں کے آگے دُھند لکھا چھا گیا اور یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔

”کتنے افسوس کی بات ہے۔ کیوں؟“

”اس میں کیا شک ہے۔“

”میرے بیٹے، بڑے افسوس کا مقام ہے۔“

بالآخر اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا گیا۔ ایک صبح ناشتے کے بعد میں اس کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ زمین پر بیٹھا صندوقوں میں اپنا سامان بھر رہا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ ”گلاب جل“ کا گیت بھی گاتا جاتا تھا۔

”میرے یار، یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

”کیوں اور کہاں؟“

مجھے سر سے پزیر تک دیکھ کر وہ بولا: ”کیا یہ ممکن ہے کہ تمہیں خبر نہیں! یہ کرا تمھاری ماں کے لیے خالی کیا جا رہا ہے۔“

”آپ سے کس نے کہا؟“

”تمھارے نانا نے۔“

”وہ جھوٹ بولتا ہے۔“

کرائے دار نے مجھے اپنے پاس زمین پر بٹھایا اور آہستہ سے کہا:

بگڑنے کی بات نہیں۔ میں سمجھا تھا کہ تمہیں یہ سارا قصہ معلوم ہو لیکن مجھ سے چھپا رہے ہو اور صفائی نہیں برت رہے ہو۔“  
اب میں سمجھا کہ وہ کیوں آنا تنک مزاج اور اُداس ہو گیا تھا۔  
اس نے کان میں کہا: ”سنو! تمہیں وہ دن یاد ہی جب میں نے تم سے یہاں نہ آنے کو کہا تھا۔“  
”میں نے ہامی بھری۔“

”تمہیں میری بات ناگوار بھی معلوم ہوئی تھی؟“  
”یہ بھی سچ ہے۔“

”میرے بیٹے، میں تمہارے دل کو دکھ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اگر تم یہاں زیادہ آنے جانے لگے تو گھر والے تمہیں تنگ کر دیں گے۔ میرا خدشہ صحیح تھا۔ اب تم سمجھے؟“

وہ مجھ سے میرے ہم جولیوں کی طرح بات کرنے لگا اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں عرصے سے یہ بات سمجھ گیا تھا۔  
”میں تو اسی زمانے میں آپ کی مصلحت کو تار ڈال گیا تھا۔“

”جو بھی ہو۔ میرے دوست، ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے؟“  
میرا دل درد سے پھٹا پڑتا تھا۔

”لیکن آپ سے وہ سب کیوں خار کھاتے ہیں؟“  
اس نے مجھے گلے لگا لیا: ”میں ان سب سے مختلف ہوں۔“  
”سمجھے؟ سارا ماجرا یہ ہے؟“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا کیوں کہ میرا گلا زندہ گیا تھا اور رقت کے مارے کچھ کہتے نہیں بنتی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا: "ناراض نہ ہونا — اور نہ رونے"۔ لیکن اس کی سینک کے اندر سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وہ حسب معمول خاموش ہو گیا، بیچ بیچ میں بہت ہڑا تو ایک آدھ بات کہہ دی۔ شام کو وہ چلا گیا اور رخصت سے پہلے سب کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا اور مجھے محبت سے گلے لگایا میں دروازے تک اس کے ساتھ گیا اور دیر تک اس گاڑی کو دیکھتا رہا جو جی ہوئی کچڑ کے تودوں پر ڈلگاتی ہوئی اسے ہچکولے دے رہی تھی۔

نانی فوراً اس گندے کمرے کی صفائی میں لگ گئی اور میں جان بوجھ کر ادھر ادھر کو دھکے لگا تاکہ وہ کام نہ کر سکے۔ ایک بار مجھ سے ٹکرا کر وہ چلا آئی: "نکل یہاں سے کل منہ!"

"تم نے اُسے نکالا کیا سمجھ کر!"

"جو باتیں تیری سمجھ میں نہ آئیں ان میں دخل نہ دے!"

"تم سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

اُس نے بھیگا ہوا جیتھڑا مجھے دے مارا۔

"ارے بھٹنے، تو باگل تو نہیں ہو گیا!"

میں نے اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا: "میں تمہیں نہیں، دوسروں

کو کہہ رہا ہوں۔" لیکن بات نہ بنی۔

کھاتے وقت نانا بولنے لگا: "خدا کا شکر کہ وہ دفان ہوا! اگر

وہ خود کشی بھی کر لیتا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوتا۔ اچھا ہوا جو وہ چلا گیا۔"

اس کے انتقام میں میں نے ایک دو برتن توڑ دیے اور مجبوراً



پھر مرتا کیا نہ کرتا، کی حالت پر آگیا۔

اس طرح ان بے شمار دوستوں میں سب سے پہلے سے  
میرا تعلق ختم ہو گیا۔ — وہ لوگ جو میرے ملک کے بہترین  
باشندے ہیں۔



## باب ۹

میرا بچپن گویا شہد کا پھٹتا تھا۔ جس طرح مدھ کھیاں دہاں شہد لے لے کر آتی ہیں، سیدھے سادے اور گم نام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لیے میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے۔ یہ شہد عموماً کڑوا اور کسیلا ہوتا تھا۔ تاہم وہ بھی علم تھا — اور ہر قسم کا علم شہد ہی۔

دُر اصل صاحب کی روانگی کے بعد بوڑھے پیٹر سے میسری دوستی ہو گئی۔ دیکھنے میں وہ نانا سے ملتا جلتا تھا — وہی ستھرا پن اور چہرے کی جھڑپاں۔ لیکن قد و جسم میں وہ نانا سے چھوٹا تھا گمان ہوتا تھا کہ یہ کوئی لڑکا ہو جس نے بوڑھوں کا بھیس لے لیا ہو اس کے چہرے پر دلی ہی ہلکی ہلکی شکنوں کا حال بچھا ہوا تھا جیسا بچے ہوئے اچھے سے چڑے کے ٹکڑے پر۔ اس کی شریر اور پرمیات آنکھیں ان جھڑیوں کے بیچ میں یوں ناچتی رہتی تھیں گویا پرندوں کا ایک جوڑا پتھر کے اندر چھدک رہا ہو۔ اس کے سیاہ و سفید بال گھنگھرا لے تھے داڑھی میں بھی چھتے پڑے ہوئے تھے اور وہ پائپ بیٹا تھا تو اس کے دھنوں کی بھی کمائی بن جاتی تھی۔ اس کی بات چیت بڑے مزے کی ہوتی تھی اور اس میں کہاوتوں

اور منٹلوں کی بھرمار رہتی تھی۔ اس کی آواز گونج دار تھی۔ اس میں کبھی کبھی ہمدردی کا جذبہ آجاتا تھا۔ مگر عموماً مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کا مذاق اڑا رہا ہے۔

”جب میں کاؤنٹس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا کہ تم ہمارے محل میں دوہار کا کام کرو۔ مگر گھڑی بھر بعد اس نے مجھے مالی کا ہاتھ بٹانے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کیا کہ سرکار کا استاد سر آنکھوں پر لیکن مجھے بھاؤڑا چلانے کی مشق نہیں۔ تب وہ کہنے لگی کہ اچھا تم مچھلی پکڑ کر لایا کرو۔ مچھلی پکڑو یا کھٹی مارو بات ایک ہی ہے۔ سو میں نے بی صاحبہ کو سلام کیا اور شہر میں آکر ٹھیلا بانی کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے آج تک اپنا پیشہ نہیں بدلا۔ اس سے میرے پتے تو کچھ پڑا نہیں، ایک گھوڑی کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں اور اس گھوڑی کی شکل اس کاؤنٹس سے ملتی ہوئی ہے۔ یہ سفید گھوڑی بوڑھی ہو گئی تھی۔ ایک روز کسی رنگ ساز نے نمٹے میں اسے رنگنا شروع کیا اور اپنا کام ادھورا چھوڑ گیا۔ اس کی ٹانگیں اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں اور فی الجملہ اس پر کاٹھ کی گھوڑی کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا سؤکھا سؤکھا سر بے نور آنکھوں کے ساتھ ابھری ہوئی رگوں اور پھٹی پڑانی جڑی کی مدد سے دھڑ سے چپکا ہوا تھا۔ پیٹر اس کی بڑی خاطر کرتا تھا اور اسے ”ٹانکو“ کہہ کر بکارتا تھا۔

نانا نے ایک مرتبہ سوال کیا: ”تم اسے عیسائی نام سے کیوں پکارتے ہو؟“

”بڑے میاں“ میں نے تو پیار کے مارے اسے یہ نام دیا ہے۔  
اور ”تنکا“ بھی بھلا کوئی عیسائی نام ہے؟“

پیٹر خاصا پڑھا لکھا تھا۔ اس میں اور نانا میں اکثر اس مسئلے پر بحث ہوا کرتی تھی کہ کون کون سے دلی سب سے مقدس ہیں وہ دونوں پُرانے زمانے کے گنہگاروں پر فتوے بھی دیا کرتے تھے۔ کبھی وہ محاوروں کے استعمال پر محبت کرتے تھے۔ نانا کہتا تھا کہ ”لنبا سانس“ اور ”طامی“ صحیح ہے۔ لیکن پیٹر لنبی سانس“ اور ”بالائی“ کو ترجیح دیتا تھا نانا غصے سے سمجھ کر کہتا: تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ”مُسہ چڑھا کر؟“ آیا ہے بڑا بالائی دالا!“

لیکن پیٹر دھنوں کے بادل اُڑاتے ہوئے یہ بھیبتی کُنسے سے نہ چوکتا تھا۔  
”اور آپ کی ع غ میں کیا رکھا ہے؟ کیا خدا اس کی کوئی پروا کرتا ہے؟  
خدا کا حکم تو یہ ہے کہ جیسے جی چاہے دعا مانگو۔“

نانا نے غصے کے مارے آنکھیں نکال کر کہا: ”الکی جل ہٹ  
یہاں سے!“

پیٹر کو صفائی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آنگن میں اگر وہ کوئی کوڑا کرکٹ دیکھتا تو اسے چُن کر الگ پھینک دیتا اور آپ ہی آپ بھنبھناتا جاتا: ”یہ بیکار چیریا راستے میں کیوں پڑی ہیں!“

یوں وہ ملنسار اور یار باش تھا۔ لیکن بسا اوقات اس کی آنکھیں کسی مُردے کی آنکھوں کی طرح خونیں اور بے نور ہو جاتی تھیں۔ ایک کونے میں وہ اپنے بھتیجے کی طرح خاموش اور اُداس بیٹھ جاتا تھا۔ درشت لہجے میں وہ کہتا تھا: ”مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔“

ہماری سڑک کے ایک مکان میں ایک عجیب انخلقت انسان رہتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ کھڑکی پر بیٹھ کر کتوں، بلیوں، مرغیوں غرض کہ ہر اُس چیز پر جس سے اُسے چڑھتی، گولیاں چلایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے دراصل صاحب کی پسلیوں کو نشانہ بنایا۔ خیر ہوئی کہ چھترے اُس کے موٹے کوٹ کو چھید نہ سکے اور اس کی جیب میں گر پڑے۔ میں کبھی اُس متحیر انداز کو نہ بھولوں گا جس سے وہ ان چھتروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ نانا نے اسے بہت اُکسایا کہ رپٹ کر دے، لیکن اس نے چھتروں کو ایک طرف پھینک کر جواب دیا: ”اجی اتنی سی بات پر یہ طوار کون باندھے؟“

دوسری مرتبہ اس شکاری نے نانا کی ٹانگ میں دو چہار چھترے دے مارے۔ یہ حضرت سخت برہم ہوئے۔ اس کے خلاف ایک رپٹ تیار کی اور دوسرے مجرموں اور گواہوں کے دستخط لینے لگے۔ لیکن اس دوران میں وہ دیوانہ غائب ہو گیا۔

بندوق کی آواز سنتے ہی پیٹر کنوٹ پہن کر فوراً باہر لپکتا تھا کوٹ کے پیچھے سے اپنا ہاتھ مرغی کی دُم کی طرح نکال کر وہ اکرٹا ہوا شکاری کے قریب جاتا تھا اور بھر لوٹ آتا تھا۔ وہ بار بار یہی حرکت کرتا تھا اور ہمارے گھر کے سب لوگ پھانک کے سامنے جمع ہو جاتے تھے۔ اُدھر اُس بندوق باز کا لال گلاں چہرہ کھڑکی کی آڑ سے نظر آتا تھا اور اس کی بیوی کی کھوپڑی اس کے کاندھے پر دھری ہوتی تھی۔ سڑک پر پڑوسیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی کبھی تو پیٹر کی یہ ہم ناکام ہتی تھی۔ کیوں کہ وہ بگڑے دل اُس شکار کو قابل اعتنا ہی نہ سمجھتا تھا۔ لیکن اکثر

اس کی دونالی بندوق دندنانے لگتی تھی۔

چہل قدمی کرتے ہوئے پیٹر ہمارے پاس لوٹ کر خوشی کا ایک نعرہ لگاتا تھا: ”اس کے سارے چہرے کھیت میں گئے!“

ایک بار کوئی چہرہ اس کی گردن میں آ لگا۔ نانی سوٹی سے اُسے نکالتی ہوئی پیٹر کو پھسکار بتاتی جاتی تھی: ”تم اس جانور کو شہ کیوں دیتے ہو؟“ آنکھ وانکھ پھوٹ گئی تو عمر بھر رویا کرو گے!“

پیٹر نے حقارت سے منہ بنایا: ”یڑی بی، یہ ممکن ہی نہیں! وہ بھی کوئی نشانہ باز ہے؟“

”تاہم تم اُسے شہ کیوں دیتے ہو؟“

”خوب رہی! میں بھلا اُسے شہ کیوں دینے لگا، البتہ اُسے

چڑانے میں مزا ملتا ہے!“

چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا: ”اُسے نشانہ لگا

تو آتا نہیں۔ ہاں میری مالکہ کاؤنٹس کے محل میں ایک سپاہی تھا

— جس کا نام تھا ’مارمون ایچ‘۔ وہ ہمیشہ کاؤنٹس کی خدمت

میں مستعد رہتا تھا کیوں کہ اس کی نگاہ میں شوہر اور دربان میں

کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن وہ اول نمبر کا نشانہ باز تھا۔ ہاں وہ صرف

گولی استعمال کرتا تھا۔ ایک بار اس نے کسی کی دونوں ٹانگوں

کے بیچ میں بوتل باندھ کر چالیں ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا کیا اور

ایک بار میں اُسے چورچور کر دیا۔ مگر خدا جانے اُسی آن اس گھماڑ

کو مجھڑ نے کاٹا یا کیا ہوا کہ وہ اچھل پڑا اور گولی اس کے گھٹنے کی

کٹوری میں گھس گئی۔ ڈاکٹر بلا یا گیا اور اس نے منٹ بھر میں ٹانگ

کاٹ کر زمین میں دفنادی —

” مگر اس بچارے گھاٹر کا کیا حشر ہوا؟ “

” اجی اس کا کیا بگڑنا تھا! اور پھر گھاٹروں کو ہاتھ پاؤں کی ضرورت بھی کیا ہے؟ انہیں اپنی حالتوں سے پیٹھے بٹھائے پیٹ بھر دوٹی مل ہی جاتی ہے۔ ساری دُنیا گھاٹروں کو پسند کرتی ہے کیوں کہ وہ بے خطر ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے: ” سب غریب احمق ہو جائیں تو نقصان نہ پہنچا سکیں “

ان باتوں سے نانی کو کوئی تعجب نہ ہوتا تھا کیوں کہ وہ بارہا ایسے واقعات سُن چکی تھی۔ لیکن میں بہت حیرت ہوتا اور پیٹر سے پوچھتا تھا: ” کیا یہ سپاہی انسانوں کی جان بھی لے سکتا تھا؟ “

” کیوں نہیں؟ بہت آسانی سے! اسے ڈوئل لڑنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ ایک مہان سے کسی بات پر اس کی تکرار ہو گئی۔ دونوں پستول لیے ہوئے باغ میں گئے۔ مہان نے وہ گولی ماری کہ اس سپاہی کے جگر کے آدھار ہو گئی۔ وہ قبرستان بھج دیا گیا اور مہان قید خانہ۔ ذرا دیر میں سب اس واقعہ کو بھول گئے۔ وہ لوگ اس طریقے سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کر لیا کرتے تھے۔ اب کسان بھول کر اس کا نام بھی نہیں لیتے۔ کسی نے اس کا سوگ نہیں منایا۔ . . . . صرت ایک بار اس کی جائداد کی خاطر لوگوں نے اس کا غم کیا۔ “

نانی نے کہا: یہ کہو کہ کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی۔  
پیٹر نے بھی سر ہلایا: ” سچ ہے۔ . . . . جائداد کی بساط ہی کیا؟ “

وہ ہمیشہ مجھ سے ہربانی سے بیٹا آتا تھا۔ مجھ سے اس طرح باتیں کرتا تھا گویا میں اس کا ہم عمر ہوں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اس میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مجھے نفرت تھی۔ مجھے وہ خوب 'جام' کھلاتا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ بھاڑ پونچھ کر سارا جام میری روٹی پر لگا دیتا تھا اور میرے لیے بازار سے نان خطائی لاتا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے وہ مجھ سے یہ سوال کیا کرتا: "کیوں میاں، بڑے ہو کر کیا کرنے کا خیال ہے۔ فوج یا نوکری؟"

"میں تو فوج میں جاؤں گا۔"

"شاباش! آج کل سپاہی کو بڑا آرام ملتا ہے۔ پادری بھی مزے میں رہتا ہے۔۔۔۔۔ اسے دعا مانگنے اور تسبیح پڑھنے کے سوا کام ہی کیا ہے اور اس میں دیر بھی کیا لگتی ہے۔ سچ پوچھو تو سپاہی سے زیادہ پادری مزے میں ہے۔۔۔۔۔ ان دونوں سے آرام وہ پیشہ ماہی گیر کا ہے۔ اس کے لیے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں، صرف عادت ڈالنے کا سوال ہے۔"

مچھلی کس طرح چارہ نگلتی ہے اور پھر کس طرح تڑپتی ہے، پیڑ ان سب باتوں کو تفصیل سے سنانے لگا۔

وہ تسلی دینے کے لیے کہا کرتا تھا: "جب نانا تمہاری ٹھکانی کرتے ہیں تو تم ناراض ہو جاتے ہو۔ لیکن تمہاری خفگی بے محل ہے۔ یہ تمہاری تعلیم کا ایک جز ہے اور پھر تمہیں جو مار پڑتی ہے وہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ میری مالکہ کا وٹس کا ہاتھ کیا چلتا تھا



واللہ وہ اس فن میں بڑی ماہر تھی!۔ اس خدمت کے لیے اس نے ایک خاص ملازم رکھ چھوڑا تھا جس کا نام کرسٹوفر تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسا ہوشیار تھا کہ پاس پڑوس کے زمیندار اپنے نوکروں کی سرزنش کے لیے اُسے بلوا بھیجتے تھے۔

بڑی سادگی سے پٹر اس نظارے کی تصویر کھینچنے لگتا تھا جب کاؤنٹس ملل کی گرتی میں ملبوس سر پر ایک آسمانی رومال باندھے ہوئے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ جاتی تھی اور کرسٹوفر کسانوں اور ان کی عورتوں پر کوڑے برسانے لگتا تھا۔

”کرسٹوفر کی شکل چسپیوں سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی مونچھ کی نوکیں کان کی لڑکھوٹی تھیں اور اس کا ہیب چہرہ اس جگہ نیلا پڑ گیا تھا جہاں ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ یا تو وہ واقعی احمق تھا یا بنتا تھا کیوں کہ کسی فضول سوال کا جواب وہ ہرگز نہ دیتا تھا ایک پیالی میں پانی بھر کر وہ کھیوں اور تیل چٹوں کو اس میں گراتا تھا اور پھر یہ پانی آگ پر اُبالا کرتا تھا۔“

مجھے نانا نانی نے ایسے بہترے قصے سنائے تھے۔ مختلف ہوتے ہوئے بھی ان سب میں ایک عجیب مشابہت تھی۔ یہ مُنتے مُنتے میں تھک گیا تھا کہ انسانوں پر مظالم ہوتے ہیں، ان کی ہتک کی جاتی ہے اور وہ مصیبتیں سہتے رہتے ہیں۔ اب میں اس قسم کا کوئی واقعہ سُنے کا متعلیٰ نہ تھا۔ چنانچہ بڑے پیر سے فرامیش کی کہ مجھے کوئی اور کہانی سناؤ۔

ایک پل کے لیے اس کی ٹھہریاں باجھوں کے پاس جمع ہو گئیں

اور پھر آنکھوں کی طرف لوٹ گئیں۔ اس نے احسان جتانے کے انداز میں کہا:

”اچھا بے چوڑے! . . . ہمارے گھر ایک باورچی تھا“  
”کس کے گھر؟“

”کاؤنٹس، ٹنشن کے گھر اور کہاں؟“

”لیکن تم اُسے ٹنشن کیوں کہتے ہو؟ کیا وہ مرد تھی؟“

پیڑ ہنستے ہنستے لوٹ گیا، ”مرد تو نہ تھی۔ پھر بھی اس کی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ جرمن نسل کی تھی . . . یہ لوگ مشینوں کی اولاد ہیں۔ اچھا تو میں تمہیں باورچی کا قصہ سنا رہا تھا — میاں بڑے مزے کی کہانی ہے“

مزے کی کہانی یہ تھی کہ باورچی نے بھلی جلا دی اور اسے حکم دیا گیا کہ ساری ہنڈیا خود کھائے۔ جلی بھلی کھانے سے وہ بیمار ہو گیا۔

میں نے بگڑ کر کہا: ”یہ بھی کوئی کہانی میں کہانی ہے“  
”اچھا تو تمہیں کس قصے میں لطف آتا ہے۔ زرا مجھے بھی تو معلوم ہو“

”میں نہیں جانتا —“

”تو پھر بک بک نہ کرو!“ یہ کہہ کر اُس نے کوئی ایسا ہی نامعقول قصہ چھیڑ دیا۔

اتواروں اور منہ ہاروں کو میرے دولوں ماموں زاد بھائی  
— کاہل اور اداس سانشا نیر ایک اور تیز و طرار سانشا

نبرد — ہمارے گھر آتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم سب جھت پر چڑھ گئے تو کیا دیکھا کہ 'بتلنگا منزل' کے آنگن میں ایک گنجا ککڑی کے گھٹوں پر بیٹھا کتے کے پتوں سے کھیل رہا ہو۔ ہم نے یہ طو کیا کہ ایک پلا چرانا چاہیے۔ دونوں بھائیوں نے فوراً ایک اسکیم تیار کر ڈالی۔ وہ یہ کہ یہ دونوں آنگن کے پھاٹک کے پاس چھپ رہیں اور میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ گنجا ہڑ بڑا جائے۔ اس کے پلٹے ہی دونوں ساشا کتے کا بچہ لے بھاگیں۔

”لیکن میں اسے کس ترکیب سے ہڑ بڑاؤں؟“

ایک نے یہ ترکیب سمجھائی: ”اس کی کھوپری پر تھوک دو“ لیکن کیا کسی آدمی کے سر پر تھوکنا گناہ کبیرہ نہ تھا؟۔ مگر میرے بھائیوں نے اپنی ایسی ایسی شرارتوں کا حال سنایا کہ میں مان گیا اور اپنا فرض بڑی حُسن و خوبی سے ادا کر دیا۔ مگر کسی کی قسمت ہی پھوٹی ہو تو کیا علاج۔

وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ خدا کی پناہ۔ ’بتلنگا منزل‘ سے نرماداول کا ایک لشکر نمودار ہوا جس کی سرداری ایک جوان افسر کر رہا تھا۔ میرے دونوں بھائیوں کو اس سانحہ کی اطلاع بھی نہ ہوئی کیونکہ وہ سیٹی بجاتے ہوئے سڑک پر ٹھل رہے تھے۔ اس لیے مانا جانے سارا بخار مجھ اکیلی جان پر نکلا اور ان کی اس مستعدی کی داد پوری بتلنگا منزل نے دی۔

میں باورچی خانے میں گٹا گٹایا پڑا ہوا تھا کہ پیٹر صاف ستمے کپڑے پہنے، ہنستے ہنستے وہاں داخل ہوا۔

”بھئی قربان جاؤں تیری چھیڑ خانی کے! اس بڈھے بکرے سے  
یہی برتاؤ کرنا تھا۔ بہت خوب سر پر تھوک مارا! آئندہ اس کی  
گنجی کھوپری پر پتھر مارنا۔“

میرے آگے اس غریب بوڑھے کی تصویر آگئی۔ اور یاد آیا کہ  
تھوک پونچھتے ہوئے وہ کتے کے پلوں کی طرح بلبلانے لگا تھا۔ میں  
دل میں بہت ناوم ہوا اور اپنے بھائیوں پر مجھے سخت غصہ آیا  
لیکن جب میں نے پیڑ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر حقارت اور  
ہیبت کے وہی آثار تھے جو مجھے پیٹنے وقت نانا کے منہ پر ہویدا  
ہو جاتے تھے تو میں سب کچھ بھول گیا۔ ”نکل یہاں سے!“ میں  
چیخ پڑا اور اس پر گھونے لات رسید کرنے لگا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسنا اور مجھے آنکھ مار کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد میرا جی اس سے اُچٹ گیا اور میں اس سے  
کترانے لگا۔ اس کی ہر حرکت کو میں شک و شبہ سے دیکھا کرتا تھا  
اس خیال سے کہ شاید اس کی اصلیت میری سمجھ میں آجائے گی۔  
اس واقعہ کے بعد ہی ایک نیا حادثہ پیش آیا۔ کچھ عرصے  
سے مجھے ’سنیکوف منزل‘ سے دلچسپی ہو گئی تھی کیوں کہ محسوس ہوتا  
تھا کہ اس کے اندر کوئی خفیہ راز چھپا ہوا ہے۔

”بتلنگا منزل‘ میں ہمیشہ چل پل رہتی تھی۔ وہاں کئی حسین عورتیں  
رہتی تھیں۔ ان سے ملنے کے لیے طلبا اور افسر آیا کرتے تھے۔ نقد  
و سرود اور قہقہوں اور لغزوں کا ایک لا قناہی سلسلہ جاری رہتا  
تھا۔ اس حویلی کی صورت میں بھی مسرت کا پہلو تھا جس کی شہادت

جکتی ہوئی کھڑکیاں دے رہی تھیں۔

نانا کو یہ بڑوس ناپسند تھا۔ اس کے کمینوں کے بارے میں نانا کا فیصلہ یہ تھا کہ ”یہ سب کافر اور مُرتد ہیں!“ وہاں کی عورتوں کے متعلق اس نے کوئی خاص فحش لفظ استعمال کیا جس کے معنی سمجھنے میں پیڑنے کچھ کم بلاغت سے کام نہیں لیا۔

لیکن بے آواز اور بے حرکت ’اسٹینکوت منزل‘ نانا کے دل میں احترام کے جذبات پیدا کرتی تھی۔

یہ مکان ایک منزلہ ہوتے ہوئے بھی خاصا بلند تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک ہر ابھرا آنگن تھا جس کے بیچوں بیچ ایک کنواں تھا اور اس کے اوپر دو کھپوں کے سہارے ایک چھت کھڑی ہوئی تھی۔ مکان سڑک سے کچھ یوں الگ تھلگ ہو گیا تھا گویا اس سے چشم پوشی کر رہا ہو۔ اس کی دو کمافی دار کھڑکیاں زمین سے کچھ اونچائی پر تھیں اور ان کے خاک آلودہ شیشوں پر سورج کی کرنیں قوس قزح کا رنگ پیدا کر دیتی تھیں۔ پھاٹک کے مقابل ایک گودام تھا اور اس کی قطع ایسی تھی کہ بجائے خود کوئی مکان معلوم ہوتا تھا اور اسی انداز پر اس کے سامنے تین نقلی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے چوکھے اور پٹ دیوار میں چُنے ہوئے تھے اور ان پر سفید قلعی کی ہوئی تھی۔ ان نقلی جھروکوں کی کج رُخی اور گودام کی پوری ہیئت اس مکان کے دُزدیدہ انداز کو اور بھی شبہ دے رہی تھیں۔ سارے مکان کی فضا سے ایک پوشیدہ چپاک یا خاموش غصے کی بات نکلتی تھی۔ اس کے اصطبل خالی تھے اور چوڑے چوڑے دروازوں پر بھی

ہوکا عالم رہتا تھا۔

کبھی کبھار ایک بوڑھا جس کی داڑھی منڈھی ہوئی اور سفید مونچھ کے بال کانٹوں کی طرح تنے ہوئے تھے آنگن میں ٹہلتا ہوا نظر آتا تھا۔ بعض اوقات ٹیڑھی ناک اور گل ٹھٹھوں والا ایک دوسرا بوڑھا صطبل سے ایک بھوری گھوڑی کو آنگن میں لاتا تھا۔ گھوڑی کی گردن ہنسی، سینہ تنگ اور ٹانگیں تیلی تھیں۔ باہر نکلتے ہی وہ کسی چالوس راہبہ کی طرح سُم مارنے لگتی تھی۔ یہ بڑھا سیٹی بجاتے ہوئے اسے تھپتھپاتا اور اس دوران میں برابر ہانپتا رہتا تھا۔ گھڑی بھر بعد وہ گھوڑی پھر اس ویران صطبل میں چھپ جاتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہونہ ہو یہ بڑھا ساحر ہی ورنہ اس بہت بھون میں کیوں رہتا۔

ہر روز دوپہر سے شام تک تین لڑکے آنگن میں کھیلا کرتے تھے وہ تینوں ایک سا لباس پہنے رہتے تھے اور تینوں کی آنکھیں بھوری اور چہرے گول تھے۔ ان کی شبابہت اس قدر ملتی جلتی تھی کہ میں صرت قد کے فرق سے ان میں تمیز کر سکتا تھا۔

دیوار کے سوراخ سے میں انہیں دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکتے تھے گو میرا جی بہت چاہتا تھا کہ ان کی نظر مجھ پر پڑے۔ وہ جس طریقے سے ہنسی خوشی عجیب و غریب کھیل کھیلا کرتے تھے وہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ ان کے لباس بھی مجھے پسند تھے۔ ایک دوسرے کا وہ بہت خیال رکھتے تھے خصوصاً اپنے چھوٹے بھائی کا یہ تہناسا مسخرہ گویا بجلی کا ٹکڑا تھا۔ اگر وہ گر پڑتا تو دونوں بڑے بھائی

ہنس پڑتے تھے — کیوں کہ یہ ایک عام رسم ہے!۔ لیکن ان کی ہنسی معصوم ہوتی تھی اور وہ دوڑ کر اسے اٹھالیتے تھے۔ اگر اس کے ہاتھ پاؤ گندے ہو جاتے تو وہ رومال یا پتوں سے اسے جھاڑ دیتے اور مچھلا بھائی محبت سے کہتا: ”کیوں بے گندے!“

وہ کبھی آپس میں نہ لڑتے تھے اور نہ ایک دوسرے کو دھوکا دیتے تھے۔ تینوں مضبوط ہمت ور اور ہوشیار تھے۔

ایک روز میں درخت پر چڑھ کر ان کی طرف سیٹھ بجانے لگا وہ لوگ بھوپلے ہو گئے اور مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔ اس ڈر سے کہ وہ مجھ پر سنگ باری کا منصوبہ کھانڈ رہے ہیں میں بچے کودا اور اپنی جیب ڈھیلوں سے بھر کر پھر پیڑ پر چڑھ گیا لیکن اب وہ مجھ سے دُور آنگن کے دوسرے کونے میں کھیل رہے تھے اور بظاہر مجھے بالکل بھول گئے تھے۔ مجھے سخت افسوس ہوا کیوں کہ ایک تو میں ان سے لڑنا نہ چاہتا تھا، دوسرے اسی وقت کسی نے انھیں اندر سے آواز دی: ”لڑکو چلو اندر!“

وہ بڑی سعادت مندی سے بطخوں کی طرح قطار باندھ ہوئے اندر چلے گئے۔

اکثر میں دیوار کے اوپر درخت پر اس امید سے بیٹھنے لگا کہ وہ مجھے ساتھ کھیلنے کی دعوت دیں گے، لیکن انھیں اس کی توفیق نہ ہوئی۔ تاہم اپنے تصور میں ان کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی ان کے کھیلوں سے میں اتنا متاثر ہو جاتا کہ زور سے پکار مٹھتا یا ہنس پڑتا تھا۔ یہ سن کر وہ تینوں مجھے تکنے لگتے اور آپس میں مشورہ کرنے

مجھے یقین نہ آیا کہ میری طرح ان پر بھی سید پڑتے ہیں اور مجھے ان پر رحم آیا۔

”جھوٹے نے پوچھا: تم چلیا پکلا کتے ہو؟“  
 ”ہاں مجھے یرندوں کے گیت بہت پسند ہیں۔“  
 ”یہ بُلی بات ہے۔ اُمہیں اُسنے کیوں نہیں دیتے؟“  
 ”یہ میری خوشی۔ تم نصیحت کرنے والے کون ہو؟“  
 ”اچھا مجھے ایک چلیا پکل دو گے؟“  
 ”اوہو۔۔۔۔۔ اچھا، کس قسم کی چڑیا؟“  
 ”بہت خوبصورت سی۔۔۔۔۔ ایک پچلے کے ازل۔۔۔۔۔“  
 ”سنا۔۔۔۔۔ کیوں، تمہیں یہی چاہیے نا؟“

”جھوٹے نے کہا: اسے بلی کھا جائے گی، اول بابا بھی خفا ہوں گے۔  
 بڑے نے بھی سر ہلا کر کہا: بابا ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔“  
 ”تمہاری اماں بھی ہیں؟“

”بڑے نے جواب دیا: ”نہیں“ مگر منھلے نے ٹوک کر کہا: ”ہیں تو  
 لیکن وہ ہماری سگی ماں نہیں۔ ہماری ماں مر گئیں۔“  
 میں نے کہا: ”وہ تو سوتیلی ماں ہوئیں۔“

”تپنوں کے چہرے پر اُداسی چھا گئی اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔  
 نانی کے قصوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سوتیلی ماں کیا چیز ہے؟  
 اس لیے میں اُن کے تفکر کی وجہ سمجھ گیا۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر  
 وہ یوں بیٹھ گئے گویا پرندے قفس میں ایک نہنی پر ہوں۔ مجھے اُس  
 جادوگرنی سوتیلی ماں کا قصہ یاد آیا جو شعبدے کے زور سے سگی ماں



بن گئی تھی۔

میں نے دلاسا دینے کے خیال سے کہا: ”تمہاری سگی ماں ایک نہ ایک روز ضرور آئے گی۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں“  
لیکن بڑے بھائی نے بے اعتباری سے شانہ ہلایا۔

”مردہ بھی کبھی واپس آیا ہی؟ ایسا نہیں ہوا کرتا“  
”کیا ایسا نہیں ہوتا! اجی اللہ کا نام لو! آپ حیات چھڑکنے کی دیر ہی، کتنے مردے جن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے، دوبارہ زندہ ہو گئے۔ صد ہا مرتبہ ایسا ہوا کہ موت اللہ میاں نے نہیں بھیجی بلکہ جادو ٹونے کی وجہ سے موت کا گمان ہو گیا“

پھر میں بڑے جوش سے انہیں نانی کی کہانیاں سنانے لگا لیکن بڑا ہنسنے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:

”یہ طلسم ہوش ربا ہم پہلے بھی سُن چکے ہیں“  
باقی دونوں بھائی چپ چاپ میری داستان سُننے لگے۔ چھوٹے کی تھوٹھنی باہر نکلی ہوئی تھی اور تھجلا اس کے ہاتھ اپنی گردن میں ڈالے گھٹنوں پر کہنی ٹیکے ہوئے تھا۔

اندھیرا ہو چلا تھا اور سُرخ بادل ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اتنے میں وہ سفید موجھوں والا بڈھا پادریوں کی سی ڈھیلی ڈھالی قبا پہنے باہر نکلا۔ میری طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا: ”یہ چھوکر اکون ہی؟“  
بڑا لڑکا ادب سے کھڑا ہو گیا اور نانا کا گھر دکھا کر بولا: ”یہ وہاں

رہتا ہے“

”اسے یہاں کس نے بلایا؟“

تینوں لڑکے گھاڑی سے اتر کر دُم دبائے ہوئے بھیڑوں کی طرح گھر میں گھس گئے۔

بڈے نے میرے کانڈھے کو گویا چمٹے سے پکڑ لیا اور مجھے پھاٹک کی طرف کھینچنے لگا۔ میں دہشت کے مارے یقیناً چیخ پڑتا، لیکن وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، ہم ٹرک پر تھے۔ اور مجھے گھونسا دکھا کر ڈانٹنے لگا۔

”خبردار جو میرے قریب بھی پھٹکا“

اب تو میں غصے میں آپے سے باہر ہو گیا:

”ابے بڈے کھوسٹ، میں تیرے قریب کیوں آنے لگا تھا!“

اس نے پھر مجھے پکڑ لیا اور یوں کڑک کر بولا گویا میرے سر پر ہتھوری کا وار کر رہا ہو:

”تیرا نانا گھر پر ہی؟“

افسوس کہ یہ بزرگوار گھر میں تشریف فرما تھے۔ نانا اس بڈے کو اپنی بے نور مگر جنچل آنکھوں سے گھورتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی بولا: ”اس کی ماں یہاں نہیں ہے اور میں بھی مصروف رہتا ہوں اس لیے اس لونڈے کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں کرنل صاحب، اس مرتبہ اسے معاف کر دیجئے“

کرنل پاگل کتے کی طرح دیر تک بکتا جھکتا رہا۔ اس کی پیٹھ پھرتے ہی نانا نے مجھے پیٹر چچا کی گھاڑی میں ٹپک دیا۔ گھوڑے کی زین اُتارتے ہوئے اس نے پوچھا:

”ابے بچے تو نے اس مرتبہ کیا گل کھلایا؟“

میں نے سارا قصہ سنایا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ آخر ان سانپ کے کچوں پر تبر دم فدا کیوں ہی؟ دیکھ، انہوں نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بدلا تو اُن سے لیجیو! بھولے گا تو نہیں؟“

دیر تک پیٹر پھنکارس مارتا رہا اور مار سے چور چور ہونے کے باوجود میں توجہ سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن اس کے تھری دا چہرے کا اتار چڑھاؤ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا اور مجھے اُن لڑکوں کا بھی خیال آیا جو میری رائے میں بلا وجہ پٹ رہے ہوں گے۔

”وہ تینوں بڑے نیک ہیں اور اُنہیں ہرگز نہ مارنا چاہیے۔ اور تم تو پرلے درجے کے جھوٹے ہو۔“

وہ ایک بیک پیچ پڑا: ”نکل میری گاڑی سے!“

میں یہ کہتے ہوئے نیچے کود پڑا: ”لے بے اُتو!“

وہ میرے پیچھے جھپٹا اور مجھے پکڑنے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے گلا پھاڑ کر ریٹکنے لگا: ”اس لونڈے کی باتیں سنو! کیا میں اُتو ہوں؟ کیا میں جھوٹا ہوں؟“

یہ شور سن کر نانی باورچی خانے سے نکل آئی اور میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔

”اس لڑکے نے میرا جینا دو بھر کر دیا ہی! میں اس کے نانا کا ہم عمر ہوں، مگر یہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔۔۔ میری ماں کو میرے سارے گھرانے کو!“

اتنا بڑا جھوٹ سن کر میں تو بھوچکا رہ گیا اور اُسے آنکھیں

پھاڑ کر تکلے لگا۔ لیکن نانی نے ڈانٹ کر جواب دیا:  
 ”پیٹر، تمہارے بھوٹے ہونے میں کیا شبہہ ہے۔ یہ لڑکا تمہیں یا  
 کسی اور کو ہرگز گالی نہیں دے سکتا۔  
 لیکن اگر نانا ہوتے تو فوراً پیٹر پر اعتبار کر لیتے!

اب ہم دونوں میں ایک خاموش مگر سخت تناہنی رہنے لگی۔  
 وہ گویا دھوکے میں مجھے لگام سے مار دیتا، میرے پرندوں کو پھرے  
 سے اڑا دیتا اور کبھی بلی اُنھیں کھا جاتی تھی۔ موقع بے موقع وہ  
 نانا سے میری شکایت کرتا اور یہ حضرت تو اُدھار کھائے بیٹھے ہی  
 رہتے تھے۔ اب میرے اُس خیال کی تصدیق ہو گئی — کہ پیٹر بوڑھے  
 کے ہتھیں میں مجھ جیسا ایک لڑکا ہے! میں اُس کے جوتوں کا تلا اس  
 طریقے سے کاٹ دیتا تھا کہ پیر ڈالتے ہی جوتا دو ٹکڑے ہو جاتا تھا  
 ایک مرتبہ میں نے اس کی ٹوپی میں مَرچ کی بُکنی رکھ دی اور وہ  
 گھنٹا بھر جھینکتا رہا۔

سارا اُتار وہ میری غجری میں گزارتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے  
 مجھے پُر دسی لڑکوں سے ملتے دیکھ لیا اور اس گناہِ کبیرہ کی خبر نانا کو  
 دے دی۔

تاہم ان لڑکوں سے میری دوستی گہری ہوتی گئی اور مجھے اس  
 میں نیا مڑا ملنے لگا۔ دیوار کا جو کونا پیٹر بودوں سے ڈھنکا ہوا تھا  
 اس میں میں نے ایک سوراخ بنا یا۔ تینوں بھائی باری باری سے  
 یاد دہ کر کے وہاں آتے اور سوراخ سے مُنہ بھڑا کر ہم لوگ  
 دیر تک دھیرے دھیرے باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک

پہرے پر مستعد رہتا تھا تاکہ کرنل کے آنے کی اطلاع دے دے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان کی زندگی کتنی تلخ ہے۔ اور مجھے سن کر دلی افسوس ہوتا تھا۔ وہ میرے پرندوں یا دوسرے طفلانہ معاملات کا ذکر کرتے تھے لیکن بھول کر بھی اپنی سوتیلی ماں یا باپ کا نام نہ لیتے تھے۔ اکثر وہ مجھ سے کوئی قصہ سنانے کی فرمائش کرتے اور میں ایمانداری سے نانی کی کوئی داستان سنانے لگتا تھا۔ اگر میں کچھ بھول جاتا تو دوڑ کر نانی سے پوچھ آتا تھا۔ اس سے نانی کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔

میں اپنی نانی کا چرچا بہت کیا کرتا تھا۔ ایک بار بڑے بھائی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ”تمہاری نانی کتنی اچھی ہیں۔۔۔۔۔“

... کبھی ہماری بھی ایک نانی تھیں۔“

اس کا لہجہ غم میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ گزشتہ واقعات کا ذکر یوں کرتا تھا گویا اس کی عمر گیارہ نہیں بلکہ سو سال ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی کلائی پتلی اور آنکھیاں نازک تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مہر تھی اور وہ گر جا کے چراغوں کی طرح جلگاتی تھیں۔ اس کے بھائی بھی بڑے اچھے تھے اور ان کی خاطر میں سب کچھ کر سکتا تھا لیکن مجھے محبت بڑے بھائی سے تھی۔

اکثر میں گپ شپ میں ایسا لگن ہوتا کہ بیڑ چچا کی آمد کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، حتیٰ کہ وہ سر پر آکر اپنی ڈاؤنی آواز میں ”پ۔۔۔۔۔“ کا نعرہ لگاتا اور ہم سب سر پر پیر رکھ کر بھاگ جاتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ پیٹر کی اُداسی اور خاموش پسندی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جب وہ کام سے لوٹتا تو میں ایک نظر میں بھانپ جاتا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔ عموماً وہ پھانک کو آہستہ سے کھولتا تھا اور اُس کی چول دیر تک جبر چرایا کرتی تھی۔ لیکن جب وہ غصے میں ہوتا تو چول یوں پیچ پڑتی گویا دود سے کراہ رہی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے اس کے گونگے بھتیجے کی شادی ہو گئی تھی اور وہ دیہات میں رہنے لگا تھا۔ چنانچہ اب پیٹر تنہا اصطبل کی ایک تنگ کوٹھری میں رہا کرتا تھا۔ اس سے لگاتار چڑے، پسینے، تالکل اور تنباکو کی بو آیا کرتی تھی اور یہ بدبو اس قدر ناگوار تھی کہ میں اس میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ سر ہانے چراغ جلا کر سویا کرتا تھا اور نانا اس عادت کو نا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

”امان پیٹر، تم گھر میں آگ لگائے بغیر نہ مانو گے۔“  
 ”اجی نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں لیمپ پانی کے طشت میں رکھ کر سوتا ہوں۔“

اب وہ ہر آدمی سے جھجکتا تھا۔ نہ نانی کی پارٹی میں شامل ہوتا نہ اس کے لیے جام لاتا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں گہری ہونے لگیں اور چلتے وقت وہ کسی بیمار کی طرح لڑکھڑانے لگا۔ ایک صبح میں نانا کے ساتھ آنگن کی برت صاف کر رہا تھا کہ یک بیک پھانک کھلا اور ایک پولیس مین نمودار ہوا۔ اس نے پیٹھ سے دھکیل کر پھانک بند کر دیا اور موٹی سی انگلی کے

اشارے سے نانا کو طلب کیا۔ نانا کے پاس آتے ہی اپنی لمبی سی ناک سے نانا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے وہ کچھ کھسّر پسر کرنے لگا۔ اس کی بات میں بالکل نہ مَن سکا، مگر نانا نے چونک کر جواب دیا:

”یہاں؟ کب؟ خدا میرے!“  
 اچانک میٹک میٹک کر وہ چلائے لگا:  
 ”خدا رحم کرے! کیا یہ ممکن ہے؟“  
 پولیس والے نے ڈانٹ کر کہا: ”اتنا شور نہ مچاؤ“  
 نانا نے چاروں طرف دیکھ کر مجھ سے کہا: ”پھاؤڑا رکھ کر اندر چلے جاؤ۔“

ایک کونے میں دبکے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ دونوں پیٹر کی گپکھا کی طرف گئے۔ جمعدار نے داہنا دستانہ بائیں ہتھیلی پر مار کر کہا: ”اسے معلوم ہے کہ ہم اس کی تاک میں ہیں۔ گھوڑا باہر چھوڑ کر وہ کہیں چھپ گیا ہے۔“

میں نانی کو یہ ماجرا سنانے باورچی خانے میں لپکا۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی اور اس کا سر ایک خاص گت سے تھمک رہا تھا سب کچھ سن کر اس نے اطمینان سے کہا:

”میرا قیاس ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔ ان باتوں سے تجھے کیا؟“

آنکھوں میں لٹ کر میں نے دیکھا کہ نانا جان پھاٹک کے پاس ٹوپی اتارے کھڑے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر صلیب

کے نشان بنا رہے تھے۔ غصے کے مارے ان کا بُرا حال تھا اور ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ پچھلے تو اس نے گرج کر کہا: ”میں نے تجھ سے اندر جانے کو کہا تھا یا نہیں؟“ مگر پھر میرے ساتھ باورچی خانے میں جا کر اس نے آواز دی: ”بڑی بی، یہاں تو آنا“

بغل کے کمرے میں جا کر وہ دیر تک کا نا پھوسی کرتے رہے۔ جب نانی باہر آئی تو اس کے چہرے کی رنگت سے میں سمجھ گیا کہ کوئی خوفناک حادثہ ہو گیا ہو۔

میں نے پوچھا: ”تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟“ اس نے دھیرے سے کہا: ”تو تو اپنی زبان کو لگام لگا“ دن بھر گھر کی فضا بوجھل سی رہی۔ نانا اور نانی برابر بے چینی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اُکھڑے اُکھڑے جملوں میں کچھ کہتے تھے جس سے میری وحشت بڑھتی جاتی تھی۔

نانا نے کھانستے ہوئے حکم دیا: ”بڑی بی، گھر بھر میں

چراغاں کر دو“

ہم میں سے کسی کو بھوک نہ تھی، تاہم ہم نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا جیسے کسی کا انتظار ہو۔ نانا بڑبڑانے لگا: ”شیطان کی قدرت تو دیکھو..... ہر جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے..... دین دار ہوں یا پادری..... کوئی اس سے محفوظ نہیں..... آخر اس کی وجہ کیا ہے؟“

نانی نے ایک لمبی سانس لی۔



جاڑے کا یہ دُھندلا دن ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا اور مکان کی فضا زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی تھی۔ شام کو ایک دوپٹہ جمعدار چولال گلال اور فربہ اندام تھا، آدھکا اور تندور کے پاس بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ جب نانا نے پوچھا کہ آپ پر یہ بھید کیسے کھلا، تو وہ غصہ کر بولا: ”اجی تم اپنا کام کرو۔ ہم سے بھی کوئی بات چھی رہ سکتی ہے؟“

کھڑکی کے پاس بیٹھ کر میں منہ کی بھاپ سے ایک پیسہ گرم کر رہا تھا تاکہ شیشہ پر جمی ہوئی برف پر اس کی مہر لگاؤں۔ اتنے میں غلام گردش سے ایک بھیانک آواز آئی، دروازہ دھڑ سے کھلا اور پترونا، پاگلوں کی طرح چلائی:

”دیکھو تو یہی کہ یہ کیا ہے!“

پولیس مین کو دیکھتے ہی وہ بھاگی مگر اُس نے اس کا دامن پکڑ کر ڈانٹ بتلائی: ”ٹھہر! تو کون ہے؟ وہاں کیا ہے؟“

وہ چوکھٹ پر گھٹنوں کے بل گر پڑی اور ڈر کے مارے اس کی گھگمی بندھ گئی: ”میں دودھ دوہنے جا رہی تھی کہ اس پر نظر پڑی... میں نے سوچا کہ کٹرن بابا کے باغ میں یہ بوٹ کہاں سے آیا۔“

یہ سنتے ہی نانا جان اُچھل پڑے: ”اری بے حیا، جھوٹ کیوں بولتی ہے؟ دیوار اتنی اونچی ہے کہ باغ کے اندر کی چیز تھیں دکھائی نہیں دے سکتی۔ تو مکر کر رہی ہے، باغ میں کچھ نہ تھا۔“

مگر پترونا نے ایک ہاتھ سے اس کے پانو اور دوسرے سے

اپنا سر مقام کر کہا: ”بڑے میاں قسیہ میں سچ کہہ رہی ہوں...“  
 ہمارے دیوار تک پیر کے نشان بنے تھے اور ایک جگہ برف  
 کیچڑ بن گئی تھی... اور میں نے دیکھا کہ وہ... وہاں پڑا  
 ہے۔“

”ارے کون؟“

ہاں یہ سوال پوچھنے کے باوجود ہم اس سے کچھ نہ معلوم  
 کر سکے۔ یکا یک وہ سب ایک دوسرے کو دھکیلاتے ہوئے باغ  
 کی طرف جھپٹے۔ وہاں پیٹر گھائی کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس پر برف  
 کی ہلکی سی چادر بچی ہوئی تھی۔ وہ جلے ہوئے شہتیر کے سہارے  
 پڑا تھا اور اس کا سر سینے تک ٹھک آیا تھا۔ اس کی داہنی کپٹی  
 پر ایک بہت بڑا زخم تھا اور اس سے گوشت کے بڑے بڑے  
 ٹوٹھڑے لٹک رہے تھے۔

خون کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پیٹر کے داہنے  
 ہاتھ کی سیاہ انگلیوں میں ایک بڑا سا جھڑکا جسے میں خوب  
 پہچانتا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کٹ کر برف میں دب گیا تھا۔  
 اس کے تلے کی برف دھنس گئی تھی اور وہ اس میں دبک کر اور  
 بھی زرا سا معلوم ہو رہا تھا۔ لاش کے داہنے پہلو پر برف میں  
 ایک سُرخ خاکہ سا بن گیا تھا جو کسی چڑیا کی شکل سے ملتا جلتا تھا  
 لیکن بائیں پہلو کی برف جوں کی توں چکنی اور چمک دار تھی۔ سر  
 گویا سجدے میں گر پڑا تھا اور ٹھڈی سینے پر یوں رک گئی تھی  
 کہ دائرہ ہی بیچ میں کچل کر رہ گئی تھی۔ سینے میں جمے ہوئے خون کے

سُرخ تیکٹوں میں پتیل کی بڑی سی صلیب صاف جھلک رہی تھی۔  
 تماشائیوں کے شور و غوغا سے میرا سر پھٹنے لگا۔ پترونا کی فریاد  
 کا سلسلہ جاری تھا۔ جمعدار گلا پھاڑ کر دلی کو کوئی حکم دے رہا تھا  
 اور نانا جان پھیری والے کی طرح ہلکتا دے رہے تھے۔

”پاؤ کے نشان نہ مٹنے پائیں!“

لیکن بڑے میاں نے ایک بیک پھوں تان کر کرٹک کر جمعدار  
 سے کہا: ”ای میاں بگڑی والے! تم نے یہ کیا پنچایت لگا رکھی ہو؟  
 یہ خدا کا معاملہ ہے۔۔۔۔ یہ قدرت کی سزا ہے۔۔۔۔ مگر تم اپنے کو  
 دیکھو کہ ہر بات میں ٹانگ اڑاتے پھرتے ہو۔“

سب لوگ سٹائے میں آگئے۔ ایک بنی سانس لے کر سب نے  
 صلیب کا نشان بنایا۔ انہ میں باہر سے کئی لوگ باغ میں آئے  
 کچھ تو جلدی میں دیوار سے نیچے گر پڑے۔ نانا نے بگڑ کر اُنھیں  
 للکارا: ”پڑوسیو، تم میری مچھواری کا ستیاناس کیوں کر رہے  
 ہو؟ کیا تمھاری مت ماری گئی ہے؟“ یہ سُن کر وہ سب رعب  
 میں آگئے۔

نانی نے سُسکی بھرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر کے اندر  
 چلی آئی۔

میں نے پوچھا: ”آخر اس نے کیا کیا تھا؟“

”تو نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا؟“

رات بھر اجنبیوں کی آمد و رفت اور غل غباڑے کا سلسلہ  
 جاری رہا۔ پولیس کا پہرا برابر موجود رہا اور ایک شخص جو بڑے

پادری کی طرح اٹھیو تھا، ڈاڑی لکھنے لگا۔ بیج بیج میں بطخ کی طرح وہ بول اُٹھتا تھا۔

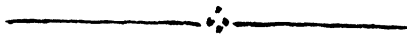
”کیا... کیا... کیا...“

نانی نے ان سب کو باورچی خانے میں چائے پلائی۔ میر پر ایک موٹے تازے ڈڑھیل اور پیچک رو آدمی نے سارا قصہ سنایا:

”اس کا اصل نام ہمیں نہیں معلوم... بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ ”التاما“ کا باشندہ تھا۔... اس کا بھتیجا نہ گونگا تھا نہ بہرا، یہ سب جھوٹ موٹ کا سوانگ تھا۔... اسے اس جرم کی خبر تھی۔... ایک تیسرا آدمی بھی ان کا شریک تھا لیکن اب تک اس کا پتہ نہ چل سکا۔... عرصے سے وہ گر جا گھروں میں چوری کرتے تھے۔ یہی ان کا پیشہ تھا۔“

پترونا پسینے سے شرابور ہو گئی اور اس نے ”ہائے میرے مولا“ کی صدا لگائی۔

میں تندور پر بیٹھ کر ان سب کا جائزہ لے رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیسے بد نما اور وحشی ہیں۔“



## باب ۱۰

ایک سینچر کو نور کے ”رڑ کے“ میں ”رودن“ چڑیا پکڑنے کے لیے پتروں کی بارڈی میں گھسار مجھے وہاں دیر تک رہنا پڑا کیوں کہ یہ چڑیاں مشکل سے دام میں آتی ہیں۔ ان کا روپ میرے من کو لکھا رہا تھا۔ روپیلی برف پر چھدک کر وہ برف پوش ٹہنیوں پر چھونے لگتی تھیں اور اپنے پروں سے چاندی سی لٹانے لگتی تھیں۔ یہ نظارہ ایسا دل ربا تھا کہ ناکامی کا غم میرے دل سے دھل گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میں پکا شکاری نہ تھا۔ شکار سے زیادہ اس کا تماشا مجھے لطف دیتا تھا اور سب سے زیادہ دلچسپی پرندوں کے طور طریقوں کے مطالعہ سے ہوتی تھی۔ لہذا میں برف کی ایک چٹان پر بیٹھ کر پنچبیوں کے ان نغموں کو خوش خوش سن رہا تھا جو اس خنک دن کے روپیلے سناتے میں خلل ڈال دیتے تھے اتنے میں مجھے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی گھنٹی سنائی دی گویا روسی زمستان میں کوئی لیلیل ایک افسردہ گیت گارہا ہے۔

برف میں بیٹے بیٹے میں اکڑ گیا تھا اور میرے کان گویا بھر گئے تھے۔ لاچار حال اور پتھرے سمیٹ کر میں دیوار سے اپنے باغ میں کودا اور گھر کی راہ لی۔

سڑک کا پھانک کھلا ہوا تھا اور ایک دیو قامت انسان سیٹی بجاتے ہوئے تین گھوڑوں کو آنگن سے نکال کر ایک بند گاڑی میں جوت رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا: ”کس کی سواری آئی ہے؟“

اس نے ایک نظر مجھے دیکھ کر گھوڑے پر اُچلتے ہوئے جواب دیا: ”پادری صاحب کی!“

مجھے یقین نہ آیا۔ بفرض محال، پادری صاحب نازل بھی ہوئے تو وہ کسی کرائے دار کے مہان ہوں گے۔

گاڑی بان نے لگام سے گھوڑوں پر گویا مورچیل جھلتے ہوئے آواز دی: ”آ جاؤ میرے بیٹو!“

گھوڑے میدان میں ہوا ہو گئے۔ دیر تک انھیں دیکھنے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا۔ باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی میں بغل کے کمرے سے اپنی ماں کی گرج دار آواز سنی جو بڑی تیزی سے کہہ رہی تھی: ”تو آپ لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟ کیا میری جان لینا چاہتے ہیں؟“

شکار کی پوشاک اتارے بغیر پنجرے ایک کونے میں پھینک کر میں غلام گردش کی طرف لپکا اور وہاں نانا سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے میرا کندھا پکڑ کر اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ”تیری ماں آئی ہے۔۔۔۔۔ اس کے پاس جا۔۔۔ ٹھہر!“ اس نے مجھے اس زور سے جھنجھوڑا کہ میں گرتے گرتے بچا اور چکر کھا کر دروازے سے جا لگا: ”اچھا جا۔۔۔ دفن ہو۔۔۔!“

میں نے دروازے پر دستک دی جس پر موم جامہ چڑھا ہوا تھا۔  
لیکن ہاتھ ٹھنڈ سے ایسے سن ہو گئے تھے کہ ہتھ بہ مشکل پکڑ میں آیا۔  
اندر قدم نہ رکھتے ہی میں چوکھٹ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اماں نے کہا "لو، وہ اب آیا ہے! ماشاء اللہ، کتنا بڑا ہو گیا!  
..... کیوں، کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ ..... اور اس نے  
یہ کیا دھج بنا رکھی ہے..... ارے اس کے کان تو سپید ہوئے جا رہے  
ہیں! امی! دوڑ کر زرا سی چربی تو لانا!"

کمرے کے بیچ میں آکر وہ میرے کپڑے اتارنے لگی اور مجھے  
یوں گھمانے لگی گویا میں ایک جھوٹا سا گنبد تھا۔ اس کا شان دار  
جسم ایک نرم و گرم اور خوبصورت لبادے میں ملبوس تھا جو کاندھے  
سے اتر کر زانو تک ٹٹکا ہوا تھا۔ میں نے اس وضع کا لبادہ پہلے  
کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس کا چہرہ پچک گیا تھا، آنکھیں دراز تر ہو کر اندر دھنس گئی  
تھیں اور بالوں کا رنگ گہرا سنہرا ہو گیا تھا۔ میرے پڑانے کپڑے  
باہر پھینک کر وہ حقارت سے ہونٹ چبا رہی تھی اور بار بار اپنی  
سُریلی آواز میں کہتی جاتی تھی: "آخر یہ چُپ کیوں سادھ رکھی ہو؟  
کیا مجھے دیکھ کر تجھے خوشی نہیں ہوئی؟ تو بہ، کیا میلا کرتا ہے؟"

پھر اُس نے چربی سے میرے کانوں کی ایسی مالش کی کہ میں  
لبلا اُٹھا۔ لیکن اس کے بدن سے ایسی اچھی مہک آ رہی تھی کہ  
میرا درد کم ہو گیا۔

میں اس سے چٹ گیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے

دیکھنے لگا کیوں کہ رقت کے مارے میرا گلا رندہ گیا تھا۔ نانی کو میں نے اُداسی سے یہ کہتے سنا:

”یہ بڑا سرکش ہے..... کسی کو پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا

اب تو اپنے نانا کی بھی نہیں سنتا..... آہ واریا.... واریا“

”اماں اللہ یہ رونا دھونا بند کرو۔ اب لکیر پٹنے سے کیا حاصل“

میری ماں کے سامنے ہر چیز نحیف و ضعیف معلوم ہونے لگی۔ اور

میں بھی اپنے کو نانا کی طرح بوڑھا محسوس کرنے لگا۔

مجھے زانو پر بٹھا کر اپنے وزنی ہاتھوں سے کنگھی کرتے ہوئے،

اماں نے کہا: ”اس کی تربیت ہونا چاہیے اور اب تو اسے اسکول

بھی جانا چاہیے.... کیوں تمہیں پڑھنا لکھنا پسند ہے یا نہیں؟“

”مجھے حرب ضرورت پڑھنا آگیا ہے“

”نہیں، ابھی تمہیں تھوڑی سی تعلیم اور حاصل کرنا ہی....“

اور ہو یہ کتنا طاقت ور ہو گیا ہے!“ یوں مجھ سے کھیلتے ہوئے وہ جی

کھول کر اپنی دلکش آواز میں ہنسنے لگی۔

جب نانا اندر آیا تو وہ غصے سے کھول رہا تھا، اس کی آنکھوں

میں خون اتر آیا تھا اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ مگر اماں نے بے خوف

و خطر پوچھا: ”ابا، آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا میں چلی جاؤں؟“

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر ناخون سے ہر بات کھڑچتا رہا اور

دیر تک خاموش رہا۔ عجب کشمکش کا عالم تھا، اور جیسی کہ میری

فطرت تھی میں اس گھڑی ہمہ تن گوش ہو گیا اور میرے سینے میں

کوئی شہ پریچ و تاب کھانے لگی اور مجھے زور سے چیخ پڑنے کو



بے تاب کرنے لگی۔

نانا نے ڈانٹ کر کہا: ”الکسی، یہاں سے ہٹ جا!“ مگر اماں نے مجھے اپنے آغوش میں کھینچ کر کہا: ”کیوں؟ تو یہاں سے نہ جائے گا یہ میرا حکم ہے!“ وہ اٹھی اور گلابی بادل کی طرح اڑتی ہوئی نانا کے قریب گئی:

”سنیے ابا جان —“

وہ پلٹ کر گرج اٹھا: ”چپ رہتی رہی یا نہیں؟“ اماں نے سرد دھری سے کہا: ”آپ مجھے یوں ڈانٹ ڈپٹ نہیں سکتے۔“

نانی کوچ سے اٹھی اور اُنکلی دکھا کر پوچھی: ”درشکا، یہ کیا؟“ نانا بیٹھ کر بڑبڑانے لگا: ”زرا ٹھہرو! مجھے بھی تو معلوم ہو کہ وہ کون تھا۔؟ ایں .... آخر یہ سب کیسے ہوا؟“

پچایک وہ ایک غیر فطری آواز میں چیخ اٹھا:

”درشکا، تو نے مجھے زمانے بھر میں رسوا کر دیا!“

نانی نے مجھے باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باورچی خانے میں جا کر تندر پر بیٹھ گیا جہاں سے میں ان کی بات جیت بخوبی سن سکتا تھا۔ میرا تو دم گھٹنے لگا۔ یا تو وہ سب بیک وقت ہونا شروع کر دیتے تھے اور ایک دوسرے کی بات کاٹنے لگتے تھے اور یا یوں خاموش ہو جاتے تھے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس بہا حے کا موضوع ایک بچے کی ذات تھی جو حال ہی میں میری ماں کے پیدا ہوا تھا اور فی الحال کہیں اور پل رہا تھا۔ مگر میری

سمجھ میں یہ امر مطلق نہ آیا کہ نانا جان اس بات پر غصا ہیں کہ آٹا  
نے بلا اُن کی اجازت یہ بچہ کیوں جنا، یا اس بات پر کہ وہ بچے  
کو ساتھ کیوں نہ لائی۔

جب نانا باورچی خانے میں آیا تو وہ سخت حیران اور پریشان  
تھا۔ جیسے جیسے نانی آستین سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی آئی۔ نانا  
ایک پنج پر جھک کر بیٹھ گیا اور اپنے ہونٹوں کو برابر کاٹنے لگا۔  
نانی اس کے آگے دوڑا نو بیٹھ کر یہ التجا کرنے لگی :

” بڑے میاں، خدا کے لیے اسے معاف کر دو! اسے یوں  
نکالنا اچھا نہیں۔ بڑے بڑے شریفوں اور سیٹھوں کے گھر آئے دن  
ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو عورت کی فطرت ہی۔ خدا  
اسے بخش دو۔ جانتے ہو کہ دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں !“

نانا دیوار کا سہارا لے کر اسے ٹکڑ ٹکڑ دیکھتا رہا۔ پھر جب  
وہ تلمی سے ہنسا تو گمان ہوا کہ ان کا قلب پھٹا جا رہا ہو۔  
” اور بھی تو کچھ کہو ؟ واللہ اعلم، تم کسے معاف کرنے سے انکار  
کرو گی ؟ تمہارا بس چلے تو کسی گناہ کی کوئی سزا نہ ہو۔ . . . .  
مہشت . . . . . دھت !“

نانی کا شانہ پکڑ کر اس نے بُری طرح ہلایا اور فیزی سے  
زیر لب یہ کہنے لگا :

” مگر خدا کی قسم تمہاری چالپوسی کسی کام نہ آئے گی۔ میرا  
دل ایسا کمزور نہیں۔ ہمیں دیکھو کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔  
اور مصیبت کا یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہی . . . . . ہمارے لیے نہ سترت ہی

نہ اطمینان — اور نہ کبھی یہ نصیب ہوگا . . . . . اور یہ سن رکھو کہ مرتے مرتے ہمیں بھیک کا ٹھیکرا تھا منا ہوگا — ہم بھیک منگوں کی سوت میں گئے !“

نانی اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور ہنستی ہوئی بولی : ”تم بھی ایک ہی بدھو ہو، اور کچھ نہیں تو بھیک کے ڈر سے ڈبے ہوئے جا رہے ہو۔ خدا نخواستہ ایسا ہوا بھی تو کیا؟ تم گھر کی رکھوالی کرتا میں بھیک مانگ لایا کروں گی . . . . اور سارا شہر میری جھولی بھر دے گا۔ . . . . ہمیں کھانے بھر کو مل جائے گا تم ادھر سے مطمئن رہو۔“

ایک بیک مانا بھی فقیر مار کر ہنس پڑا اور بوڑھے بکروں کی طرح اپنا سر ہلانے لگا۔ نانی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اس سے چپک گیا اور اس کی بغل میں عجب ریچ پوچ معلوم ہونے لگا۔ ”ارمی پھوٹڑ خاتم! . . . . . تیرے سوا دنیا میں میرا اور کون ہے — تجھے کسی چیز کی پروا نہیں کیوں کہ تو تو عقل و شعور سے محروم ہے۔ لیکن زرا پچھلے دنوں کو یاد کر اور سوچ کہ ہم دونوں نے ان بدکاروں کے بے کسی کسی مصیبتیں جھیلیں . . . . . میں نے کیسے کیسے گناہ کیے . . . . . اور اس کا انجام یہ ہونا تھا —“

اب میں اپنے کو ضبط نہ کر سکا اور نہ اپنے آنسوؤں کو روک سکا۔ میں تندور سے کود کر ان کی طرف لپکا۔ میں خوشی کے مارے رو رہا تھا کیوں کہ وہ آپس میں اس اخلاص سے باتیں کر رہے تھے اور میرا دل ان کے غم کا شریک حال تھا

نیز اس لیے کہ میری ماں واپس لوٹ آئی تھی۔ نانا اور نانی مجھے  
گھلے لگا کر روتے رہے اور دیر تک مجھے بھینچتے رہے۔ مگر نانا نے  
آہستہ سے کہا:

”اے بھٹنے تو یہیں چھپا ہوا تھا! اب تو تیری ماں آگئی ہے اور  
غائباً تو ہمیشہ اسی کے ساتھ رہے گا۔ اب اپنے بوڑھے نانا سے  
تجھے کوئی واسطہ نہ رہے گا کیوں؟ — اور بیچاری بڑھیا نانی کی  
بات بھی تو نہ پوچھے گا جس نے لاٹ میں تجھے سر جڑھالیا ہے۔ کیوں  
— ہشت . . . . دھت!“

ہم دونوں کو الگ ہٹا کر وہ غصے سے بولا:  
”یہ سب یکے بعد دیگرے ہمیں چھوڑ رہے ہیں . . . . خیر اسے  
بلا لاؤ۔ بڑی بی، جلدی کرو، دیکھ کیا رہی ہو!“  
جب نانی باہر چلی گئی تو وہ سر جھکا کر کونے میں جا کھڑا ہوا۔  
”خداے کریم!“ اس نے اپنی طوطا کہانی شروع کی: ”تو  
دیکھتا ہے کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے؟“ اور اپنا سینہ پیٹتے لگا۔  
مجھے اس کی یہ حرکت سخت ناگوار تھی۔ وہ خدا سے جس انداز  
سے باتیں کرتا تھا وہ مجھے بالکل ناپسند تھا۔ وہ تو اپنے خالق کے  
آگے بھی لن ترانی ہانکنے سے نہ چوکتا تھا۔

جب اماں اندر داخل ہوئی تو اس کی سرخ پوشاک سے کمر  
جھل جھلا اٹھا۔ وہ میز پر جب نانا نانی کے بیچ میں بیٹھی تو اس کے  
لبادے کی کشادہ آستینیں شانوں سے ڈھلک پڑیں۔ وہ سنجیدگی  
سے ہولے ہولے کوئی واقعہ بیان کرنے لگی اور وہ دونوں اس

ادب سے اسے سننے لگے گویا وہ دونوں بچے ہیں اور وہ اُن کی ماں -

اشتعال کی تھکن ایسی تھی کہ مجھے کوچ پر ہی نیند آگئی -  
 جھپٹے کے سئے بڈھوں کا جوڑا بن ٹھن کر گر جا گھر چلا - نانا  
 نے برادری کے جد دھری کی وردی ڈانٹ لی تھی اور اس پر  
 ایک فیتہ بھی لگا رکھا تھا - اپنی ٹونڈ نکالے ہوئے وہ اس دھج میں  
 بڑا رعب دار معلوم ہوتا تھا - نانی نے اس کی طرف آنکھ مار کر اتاں  
 سے کہا: ”زرا بڑے میاں کے ٹھاٹ تو ملاحظہ ہوں! کیا بانکے  
 پھیلا بنے ہوئے ہیں . . . . . معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جوان پٹھاری“  
 اس پر اماں کھل کھلا کر ہنس پڑی -

جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے تو وہ کوچ پر دونوں  
 پیر اٹھا کر بیٹھ گئی اور خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”آؤ  
 یہاں بیٹھو - اب بتاؤ کہ تمہیں یہ گھر پسند ہے یا نہیں؟“  
 ”زیادہ نہیں“

”کیوں؟“

مجھے خود اس کی خبر نہ تھی -

”مجھے نہیں معلوم“

”نانا اب بھی تمہیں ٹھونکتے ہیں؟“

”اب زیادہ نہیں“

”اچھا؟ . . . . . خیر مجھے اپنی سب باتیں سناؤ“

میں نانا کا ذکر نہ کرنا چاہتا تھا - اس لیے دراصل صاحب کا

قعدہ سنانے لگا جس غریب سے سب لوگ چڑتے تھے اور جسے نانا نے نکال دیا تھا۔ مگر میں سمجھ گیا کہ اماں کو یہ کہانی نہ بھائی۔ اس نے کہا: ”اور کچھ سناؤ“

میں نے اُسے تین بھائیوں کا حال سُنا یا اور بتایا کہ کرنل نے کس طرح مجھے احاطے سے نکال دیا تھا۔ یہ سُنتے سُنتے اُس نے میرا ہاتھ زور سے بھینچا: ”کیسا ظلم ہی!“ یہ کہتے وقت اس کی آنکھ چمک اُٹھی اور وہ ایک لمحے کے لیے چُپ چاپ فرس کی طرف تাকা کرنے لگی۔

اب میں نے دریافت کیا: ”نانا تم سے خفایوں ہیں؟“  
 ”اس لیے کہ اُن کے اُصول کے مطابق میں گناہ گار ہوں؟“  
 ”وہ بچہ یہاں نہ لانے کی وجہ سے —؟“

وہ چونک پڑی، اُس کے ماتھے پر بل آگئے اور وہ ہونٹ چبانے لگی۔ پھر زور سے ہنس کر اس نے مجھے پٹالیا اور کہا:  
 ”ارے شیطان! آئندہ کبھی اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا، سنتا ہی یا نہیں؟ ان باتوں کو ہمیشہ کے لیے بھول جا“

تھوڑی دیر وہ مجھ سے مُکادات اور سختی سے بولتی رہی۔ لیکن ان جُملوں کی طرف میری کوئی توجہ نہ تھی۔ اپنی ٹھنڈی کو انگلی سے ہٹو کے دیتے ہوئے اور گھنی بھوؤں کو چڑھاتے اُتارتے ہوئے وہ کمرے میں ٹپلنے لگی۔

میز پر ایک موم جٹی روشن تھی اور آئینہ میں اس کا عکس جھللا رہا تھا۔ فرس پر دُھندلی پرچھائیاں ہل رہی تھیں۔ شہ نشین

کے آگے ایک چراغ ٹٹھا رہا تھا اور برف پوش کھڑکیوں کو چاندنی  
منور کر رہی تھی۔ ماں درود دیوار کو یوں دیکھنے لگی گویا کچھ ڈھونڈ  
رہی ہے۔

”تم کس وقت سویا کرتے ہو؟“

”مجھے کچھ دیر یہیں رہنے دیجیے۔“

”ارے ہاں، تم تو دن میں سو بھی چکے ہو؟ اسے یہ یاد آیا۔

”کیا آپ جانا چاہتی ہیں؟“

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ اور میرا سر اٹھا کر دیر تک

مجھے اس انداز سے تکتی رہی کہ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”میری ناک چرچا رہی ہے۔“

در اہل میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کیوں کہ خود بخود یہ خیال

میرے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہ رہے گی اور  
جلد رخصت ہو جائے گی۔

ایک چٹائی کو پیر سے ٹھکراتے ہوئے وہ بولی، ”ہر ادا اپنے

باپ کی سی ہے۔۔۔۔۔ نانی نے تمہیں ان کا حال کبھی سنا یا تھا؟“

”ہاں ہاں“

”اتنی جان کو ان سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی انہیں

چاہتے۔۔۔“

”مجھے یہ بات معلوم ہے۔“

اماں نے چپیں بچھیں ہو کر موم بتی کو دیکھا اور اُسے بھٹاکر

کہا: ”اب ٹھیک ہی اے“

واقعی نعمت زیادہ خوش گوار ہو گئی اور وہ مہیب سائے معدوم ہو گئے۔ ان کی جگہ فرش پر روشنی کی کرنیں چمکنے لگیں اور بھر و کوں پر گویا نور پارے بکھر گئے۔

”لیکن اتنے عرصے آپ کہاں رہیں؟“

اس نے بہت سوچ سوچ کر گویا کسی بھولے ہوئے واقعہ کو یاد کر رہی ہو، بہترے شہروں کے نام گنائے۔ اس اشنا میں برابر وہ ایک شاہین کی طرح کمرے میں بے آواز گشت لگاتی رہی۔

”یہ لبادہ آپ کو کہاں ملا“

”میں نے خود بنایا تھا۔ اپنے تمام کپڑے میں خود سیتی ہوں؟“

یہ تصور میرے لیے راحت بخش تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہی مگر وہ بہت کم سخن تھی۔ جب تک میں چھیڑتا نہ تھا وہ بولتی نہ تھی۔

وہ پھر میرے قریب کوچ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چپ چاپ چمٹے رہے تا وقتیکہ نانی نانا موم بتی اور لوبان کی مہک میں بسے ہوئے لوٹ نہ آئے۔ اس وقت ان دونوں کی چال ڈھال بہت نیک و معصوم ہو گئی تھی۔

یہ کھانا ہم نے اس طرح کھایا جیسے تیوہار کا کھانا ہوتا ہی یعنی بہت کم بات چیت کی اور جو چند الفاظ کہے بھی تو ایسی دبی زبان سے جیسے کسی سونے والے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ ہو۔

اماں نے فوراً مجھے باقاعدگی سے روسی پڑھانی شروع کر دی



وہ کئی کتابیں خرید لائی جن کی مدد سے چند روز میں میں فر فر پڑنے لگ گیا۔ مگر اس نے مجھے نظمیں رٹانی شروع کیں اور یہ ہم دونوں کے لیے ایک جنجال ہو گئی۔

مثلاً اگر نظم کا ایک بند یہ ہوتا:

مالی آدٹ دیکھ کر کلیاں اٹھیں مپکار

بھولی بھولی جن یوں کال ہماری بار

تو میں کلیاں کو دٹھلیا، یا پھولی کو پھلی، پڑھ جاتا۔ اماں خفا ہوتی: "ہوش میں تو ہر!۔ ارے کولہو کے بیل، یہ دٹھلیا، کیسے بن گئی؟..... کل۔۔۔۔۔ یاں..... اب سمجھ میں آیا؟" سمجھنے کے باوجود میں دوبارہ یہی غلطی کرتا تھا اور اس سے ہم دونوں کو یکساں تعجب ہوتا تھا۔

وہ ناراض ہو کر کہتی کہ میں غبی اور ضدی ہوں۔ یہ الزام صحیح نہ تھا کیوں کہ ان بیہودہ نظموں کو یاد کرنے میں میں نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ طرفہ یہ کہ دل ہی دل میں انھیں حرف بحرف دہرا سکتا تھا لیکن زور سے پڑھتے وقت وہ غلط ہو جاتی تھیں۔ مجھے ان فریب کار اشعار سے چڑ ہو گئی اور میں جان بوجھ کر انھیں خلط ملط کرنے لگا اور ایک ردیف و قافیہ کے تمام الفاظ کو جمع کرنے لگا۔ اپنی یہ کاوش مجھے پسند آئی کیوں کہ اس طرح۔ خود بخود اشعار بن جاتے تھے گو وہ بالکل بے معنی ہوتے تھے۔

لیکن یہ جدت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ ایک روز جب میں نے

اپنا سبق حُسن و خوبی سے سنا دیا تو اماں پوچھ بیٹھی کہ نظم یاد کی یا نہیں۔ بلا ادا دہ میں نے یہ غزل خوانی شروع کی :

”تلخ ہی چقندر اور سُرخ ہی قلندر۔“

بہت دیر میں مجھے ہوش آیا۔ اماں نے میز پر ہاتھ پٹک کر پوچھا : ”یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے ؟“

میں نے لا پرواہی سے کہا : ”مجھے نہیں معلوم“

”نہیں، تم خوب جانتے ہو !“

”یہ بڑا مزیدار۔“

”مزیدار کیا ہے ؟“

”مزیدار ”چٹکلا“ ہے۔“

”جلو مرغا بنو“

”کیوں ؟“

”کونے میں جاتا ہو یا نہیں ؟“ اس کا چہرہ متما اُٹھا۔

”کون سا کونا“

اس نے مجھے یوں گھور کر دیکھا کہ میں ساری سٹی بھول گیا

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس کونے میں جاؤں، کیوں کہ ایک میں پلنگ تھا، دوسرے میں شہ نشین قمیرے میں صندوق اور

جو تھے میں دروازہ۔

بوکھلا کر میں نے جواب دیا : ”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔“

وہ کچھ ٹھنڈی پڑی اور اپنے گال اور ملتے کو پونچھتے ہوئے

پوچھا :

”نانا نے تمہیں کبھی مرغا نہیں بنایا؟“

”کب؟“

”کب کے بچے! میں جو پوچھتی ہوں اس کا جواب دے۔“ میر  
پر گھونسا مار کر وہ چلا پڑی۔

”نہیں — مجھے تو یاد نہیں ہے۔“

اس نے ایک لمبی سانس لی: ”تو بہر تو بہ! زرا یہاں تو آنا۔“  
میں یہ کہتے ہوئے اس کے پاس گیا: ”آپ مجھ سے خفا کیوں ہیں؟“  
”کیوں کہ تم نے جان بوجھ کر اُس نظم کا ایسا ستیاناس کیا؟“  
میں نے حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں دل  
میں یہی نظم صبح صبح دہرا سکتا ہوں لیکن زبان کھولتے ہی  
الفاظ آپ ہی آپ یہاں سے وہاں بھاگ جاتے ہیں۔  
”تم بن تو نہیں رہے ہو؟“

اس کا جواب میں نے نفی میں دیا۔ مگر لمحہ بھر بعد میں نے  
یہی نظم لفظ بہ لفظ سنا دی اور یہ کارنامہ میری خفت اور ندامت  
کا باعث ہوا۔ شرم کے مارے میں اماں کے آگے کھڑا کا کھڑا  
رہ گیا۔ چہرہ جلنے لگا، کان بھائیں بھائیں کرنے لگے اور بھیجا  
اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ اپنی اشک فشاں آنکھوں سے دیکھا  
کہ اماں کا چہرہ غضب آلودہ ہی اور وہ بھوں چڑھائے ہوئے  
چہا رہی ہی۔

بدلی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا: ”اس سوانگ کا مطلب  
کیا ہے؟ تم نے دانستہ یہ شرارت کی تھی؟“

”میں نہیں جانتا۔ انجان پنے میں ایسا ہو گیا“  
 سر جھکا کر وہ بولی: ”تم بھی اپنی قسم کے ایک ہی ہو! ہٹو  
 یہاں سے۔“

اماں نظم پر جتنا زور دیتی تھی میرا حافظہ اتنا ہی بغاوت  
 کی طرف مائل ہوتا جاتا تھا اور ان لطیف و ہموار بحروں کو  
 یاد کرنے سے انکار کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ اشعار کو مسخ کرنے  
 کی خواہش زور پکڑتی گئی اور اس نے خطرناک صورت اختیار  
 کر لی۔ اب میں نئے نئے الفاظ تراشنے لگا اور مجھے خود اپنی  
 صلاحیت پر رشک آیا۔ کیوں کہ خدا جانے کہاں سے نئے نئے  
 اور بے ٹکے بول میرے دماغ میں آجھتے اور نظم کی صحیح ترکیبوں  
 کو نکال باہر کرتے تھے۔ اکثر نظم کا ایک آدھ بند میں بھول جاتا  
 تھا اور لاکھ سر مارنے پر بھی یاد نہ آتا تھا۔ خصوصاً ایک مشہور  
 نظم نے مجھے بہت دق کیا جس کا پہلا بند میں کسی طرح یاد  
 نہ کر سکا:

صبح ہو یا شام ہو  
 ایک ضعیف ایک یتیم  
 جھولیاں لیے ہوئے۔  
 ”دے خدا کی راہ پر“  
 چنم نم ، دل میں غم

آدمی پہ یہ الم - ار خدا یہ کیا ستم !  
 مگر دوسری کڑی مجھے خوب یاد رہتی تھی:

پھر رہے ہیں در بدر روٹیوں کی چاہ میں  
 یہ بھی کیا ظلم ہی آدمی کی جان پر  
 اماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ میرے دماغ کا کون سا پرزہ  
 ڈھیلا ہے۔ جب اس نے نانا سے میری حرکتوں کا ذکر کیا تو  
 ان حضرت نے تیوری چڑھا کر کہا: ”یہ سب اس کی ڈھٹائی  
 ہی!۔ اس کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ تو تے کی طرح  
 دعائیں سنایا کرتا تھا..... شرارت کر رہا ہے، ورنہ جو سننا  
 ہے اس کے دماغ پر نقش ہو جاتا ہے..... کندی کرو کندی!  
 لات کا دیو کہیں بات سے مانتا ہے!“

نانی نے بھی صلوایتیں سنائیں: ”گیت اور کہانی کیسے یاد  
 رکھتا ہے — اور نظم گیت نہیں ہی تو کیا ہے؟“  
 ان کے طعنے تشے ٹھیک تھے۔ لیکن اسے کیا کروں کہ  
 نظم پڑھنے بیٹھنا ہی تھا کہ کہیں سے الفاظ کا لشکر آکر آپ ہی  
 آپ یوں پریڈ کرنے لگتا تھا:

ہمارے گھر کے سامنے بھکاریوں کی بھیڑ ہے  
 گڑ گڑا رہا ہے ایک بڑ بڑا رہا ہے ایک  
 ”دے خدا کے نام پر“ ایک یہی حدیث ہے  
 میں مگر یہ بد معاش روٹیوں کو بیچ کر  
 جامِ می پیے ہوئے نالیوں میں ہیں پڑے

رات کو نانی کے پاس لیٹے لیٹے میں اسے دن بھر کا سبق  
 اور اپنی ٹمک بندی سنایا کرتا تھا۔ کبھی تو وہ ہنس پڑتی تھی

لیکن بیشتر یہ نصیحت کرتی تھی: ”بہت ہوا!۔ اچھا تو بڑا ملک  
الشعرا ہی۔ مگر بھکاریوں کا مذاق اڑانا گناہ ہی۔ خدا ان کی  
مشکلیں آسان کرے!۔ کیا عیسیٰ اور سب پیر پیغمبر غربت میں  
نہیں رہے؟“

میں گنگانے لگتا تھا:

”بھک منگوں کا دشمن ہوں میں نانا جان کا میری ہوں  
جب دیکھو تب تاک دھنا دھن روٹی کی کیا ڈھیری ہوں“  
اب تو نانی پھر پڑتی تھی: ”ارے بھڑوے! پھر تو کہہ کر  
دیکھ۔ اگر بڑے میاں یہ سُن لیں تو —“

”سُن لیں میری بلا سے!“

اب نانی نے سنجیدگی اور محبت سے کہا: ”جتنے صد نہیں  
کرنی چاہیے۔ اس سے تیری ماں کا مزاج اور بھی خراب ہوتا ہے  
اس بیچارے کے ساتھ یوں ہی کچھ کم مصیبتیں لگی ہوئی ہیں“  
”کون سی مصیبتیں؟“

”یہ باتیں تیری سمجھ میں نہ آئیں گی“

”اجی میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سب نانا کی —“

”چپ رہتا ہی یا نہیں!“

میں بھی عجب محضے میں تھا۔ مجھے کسی ہم درد کی ضرورت  
تھی لیکن یہ بات کسی سے کہتے بھی نہ بنتی تھی۔ لا محالہ میں چڑچڑا  
اور مندی ہو گیا۔ اماں کا درس میرے لیے سخت بے لطفی اور  
کوفت کا باعث ہو گیا۔ حساب تو میں آسانی سے سیکھ گیا لیکن

اطلا لکھنے کی سکت نہ تھی اور گرامر تو میرے لیے کالے انچھڑے بھی بدتر تھی۔

ان باتوں سے زیادہ غم انگیز یہ احساس تھا کہ اس گھر میں رہنا اماں کے لیے قطعاً ناممکن تھا۔ ہر روز اُس کے چہرے پر اُداسی کی ایک نئی تہ چڑھتی جاتی تھی اور وہ ہر شو کو اجنبی کی نظر سے دیکھنے لگی وہ کھڑکی کی سیل پر بیٹھ کر دیر تک باغ کو تکتی رہتی اور کسی سے کچھ نہ کہتی تھی۔ اس کا کُندن سا رنگ پھیکا پڑتا جاتا تھا۔

درس کے وقت اس کی آنکھیں گویا میرے آر پار درو دیوار کو دیکھا کرتی تھیں اور وہ ٹکلی ہوئی آواز میں کوئی سوال پوچھ کر آن کی آن میں اس کا جواب بھول جاتی تھی۔ اب وہ زرا زراسی باتوں پر مجھ سے ناراض رہنے لگی۔ اور مجھے اس کا بڑا صدمہ تھا کیوں کہ راوی کا بیان تھا کہ ہر ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ کبھی میں اُس سے پوچھ بیٹھتا تھا: ”آپ کو ہمارے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے؟“ وہ غصے سے پیر پکھنے لگتی: ”تو ان باتوں میں دخل دینے والا کون؟“

مجھے شبہ ہونے لگا کہ نانا کوئی ایسا منصوبہ مگانٹھ رہا ہے جس کی وجہ سے نانی اور اماں دونوں پریشان ہیں۔ وہ اکثر اماں کے ساتھ کوٹھڑی میں بند ہو کر اس کانے گڈرے کی بانسری کی طرح پیس پیس کرنے لگتا تھا جس سے مجھے انتہائی نفرت تھی۔ ایک مرتبہ اسی قسم کی مجلس مشادرت کے درمیان اماں گلا بھاڑ کر چلا پڑی:

”میں ہرگز نہ مانوں گی۔ ہرگز نہ ہرگز نہیں!“

دردازہ دھڑ سے کھلا اور بڑے میاں نے قیامت برپا کر دی۔  
 شام کا وقت تھا۔ نانی اپنے میاں کے لیے کرتا سیتی ہوئی جی  
 ہی جی میں بڑ بڑا رہی تھی۔ دردازے کا دھڑا کا سن کر وہ بولی،  
 ”مذا خیر کرے! لڑکی کرایے داروں کے ہاں کیوں گئی؟“  
 اُسی وقت نانا بادرچی خانے میں دوڑا ہوا آیا اور اس کے  
 سر پر گھونسا مار کر پھنکارنے لگا: ”ارمی جڑیل! تیری زبان کبھی بند  
 ہوگی یا نہیں؟“

نانی نے اپنا جوڑا باندھتے ہوئے آہستگی سے کہا: ”تھاری  
 عقل ماری گئی ہے! میں ہرگز خاموش نہ رہوں گی! تھاری ہر سازش  
 کا حال میں اسے سناؤں گی۔“

بڑھا اُس پر ٹوٹ پڑا اور تابڑ توڑ لات گھونے مارنے لگا۔  
 نانی نے مداخلت کی کوئی کوشش نہ کی اور نہ اس پر ہاتھ اٹھایا  
 اس کی ایک یہی رٹ تھی: ”ٹھیک ہے! رُک کیوں گیا۔۔۔۔۔ قسم  
 کہ جو مجھے زندہ چھوڑا۔“

میرے ہاتھ نیکیے، جوتے، غرض کہ جو چیز سامنے نظر آئی، نانا کی  
 طرف پھینک ماری۔ لیکن وہ غصے میں ایسا اندھا تھا کہ مطلق اثر  
 نہ ہوا۔ نانی زمین پر گر پڑی تو وہ اس کے سر پر ٹھوکر مارنے لگا  
 تا وقتیکہ وہ خود بھسل کر پانی کی بالٹی پر نہ گر پڑا۔ وہ ہانتا کانتا  
 اُٹھا۔ اور پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر اوپر بھاگ گیا۔  
 نانی آہ بھر کر اٹھی اور تخت پر بیٹھ کر اپنے بکھرے جوتے بال  
 ٹھیک کرنے لگی۔ میں کوچ سے نیچے اُترا تو وہ غصے سے بولی:



”تکیوں و کیوں کو اپنی جگہ پر رکھ دے! آیا ہر بڑا بچہ پھینکے والا۔۔۔۔۔ اور مجھے دخل دینے کی کیا پڑی تھی! اس بوڑھے کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے — خطی کہیں کا“

پھر سانس بھر کر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور مجھے ہلکا کر سر نیچے جھکایا: ”دیکھنا تو سہی، مجھے کس وجہ سے یہ درد ہو رہا ہے؟“ اس کا جوڑا ہٹا کر دیکھا تو ایک ہیر پن اس کے سر میں چبھ گئی ہے۔ میں نے اسے تو کیچنے لیا مگر ایک دوسری پن دیکھ کر میری انگلیاں کانپنے لگیں اور میں نے کہا: ”مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔ میں اماں کو بلاتا ہوں۔“

اس نے مجھے ایک دھکا دیا: ”ایسی کیا آفت آگئی!۔۔۔۔۔ چلے ہیں اماں کو بلانے۔۔۔۔۔ شکر اللہ کہ وہ یہاں نہ تھی اور تو — ارے تو اپنا صنف کالاکر!“

یہ کہہ کر وہ اپنی انگلیوں سے باؤں کو ٹٹولنے لگی۔ ہمت بازہ کر میں نے دوپٹھی ہوئی پنیں باہر نکالیں: ”بہت درد ہر نانی؟“ ”نہیں بیٹا۔ کل میں سردھوہوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا!“ پھر وہ بکینی چٹری آواز میں بولی: ”گڈے، اپنی ماں سے اس مار چٹائی کا ذکر نہ کرنا۔ ان دونوں میں ایسے ہی کیا کم کٹا جھنی ہے۔ کہے گا تو نہیں؟“

دیکھ، بھول نہ جانا۔ اچھا، آ۔ اب سب چیزیں ٹھکانے سے رکھ دیں — میرے منہ پر کوئی نشان تو نہیں ہے؟ یہ خیریت ہوئی ذرہ نہ بھید کل جاتا“

وہ فرش دھونے لگی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں تیرے دل سے  
چینگ اٹھا: "نانی تم فرشتہ ہو۔۔۔ یہ سب تم پر کیا ظلم کرتے ہیں اور  
تم ہو کہ اُن بھی نہیں کرتیں؟"

"چپ رہ رہے بڑبڑاؤ فرشتہ۔۔۔ دیکھا بھی ہو کوئی فرشتہ؟  
اکڑوں بیٹھ کر وہ زیرِ لب کچھ کہنے لگی اور میں تندرود پر چڑھ کر نانا  
سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلی مرتبہ اس نے میرے  
سامنے نانی پر ایسا سنگین حملہ کیا تھا۔

شفق کی سُرخی میں اس کے بھرے ہوئے لال بال اور تھمایا  
ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ میرا دل غصے سے کھولنے  
لگا اور مجھے اس خیال سے اور بھی چڑھوئی کہ میں بدلا لینے کی کوئی  
ترکیب نہ سوچ سکا تھا۔

ایک دو روز بعد نانا کے نام کوئی پیغام لیے ہوئے میں اوپر  
اُس کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھا کہ وہ فرش پر ایک کھلے ہوئے  
صندوق کے سامنے بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا ہے۔ چھپے کسی پر اس  
کی محبوب خبثی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بارہ موٹے موٹے ورق  
تھے اور ہر صفحہ ہینے اور تاریخ کے حساب سے خانوں میں بننا ہوا تھا  
اور ہر خانے میں ایک ولی کی تصویر تھی۔ یہ خبثی نانا کو جان سے  
زیادہ عزیز تھی اور صرف میں وہ خوش قسمت تھا جسے اس کی زیارت  
کا شرف حاصل ہوتا تھا، یہ بھی ان سہاگ ساعتوں میں جب چھٹے  
چھما ہے نانا جان مجھ سے بہت خوش ہو جاتے تھے۔ ان دنوں چپ  
تصویروں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہو جاتا تھا

ان میں سے کئی کی زندگی کے احوال مجھے معلوم تھے۔ لیکن سب سے زیادہ میں حضرت الکی رحمت اللہ علیہ کی عزت کرتا تھا اور ان سے منسوب قطعات بھی مجھے پسند تھے۔ نانا اکثر بڑے احترام سے انھیں مجھے سنایا کرتا تھا۔ ایسے ایسے سیکڑوں بندے گزر چکے ہیں اور یہ خیال تسکین کو کیا کم تھا کہ ان سب نے جامِ شہادت پیا ہو!

لیکن اس وقت میں نے اس خبثی کو بھاڑ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب نانا کھڑکی کے پاس جا کر ایک نیلا خریطہ پڑھنے لگا تو میں خبثی کے کئی ورق چڑا کر نیچے بھاگ آیا اور نانی کی قینچی چکے سے لے کر کوچ پر بیٹھ گیا اور ویلوں کے سر قلم کرنے لگا۔ جب میں ایک قطار کا کام تمام کر چکا تو یہ خیال آیا کہ ایسی اچھی خبثی کا ستیاناس نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا میں نے سوچا کہ مرث حافی خانوں کو تراشنا چاہیے۔ ابھی میں نے اس نئے دستور پر عمل شروع کیا ہی تھا کہ نانا دروازہ پر برآمد ہوا اور آواز دی:

”بچھے میری خبثی یہاں لانے کی اجازت کس نے دی؟“

مینر پر کاغذ کے پھیلے ہوئے ٹکڑوں پر نظر پڑتے ہی وہ انھیں یکے بعد دیگرے اٹھا اٹھا کر سونگھنے لگا۔ اس کے جیڑے ہٹنے لگے ڈاڑھی بل کھانے لگی اور اس نے ایسی پھٹکار ماری کہ تراشے سارے کمرے میں بکھر گئے۔

”ارے تو نے یہ کیا کیا؟“ بالآخر اس کے منہ سے یہ صدا نکلی اور اس نے ٹانگ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ میں سر کے بل گر پڑا۔ نانی

مجھے بچانے کو دوڑی تو نانا نے اس پر سبی دو ہتھڑ رسید کی اور چنا کہ میں اس کا خون پی کر رہوں گا۔

اُسی گھڑی اماں اندر آئی اور میں بھاگ کر تندور کے کونے میں کھڑ ہو گیا۔ اماں نے نانا کا ہاتھ پکڑ کر اسے الگ ڈھکیل دیا: ”آپ کی یہ حرکت بالکل نازیبا ہے! آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟“ نانا تخت پر لوٹ-لوٹ کر بیٹلانے لگا: ”تم لوگ میری جان بے کر رہو گے۔ تم سب ایک ایک کر کے میرے دشمن ہو!“ میری ماں نے جواب دیا: ”آپ کو شرم نہیں آتی۔ اس ڈھکوسلے بازی سے کیا فائدہ؟“

نانا نے چلا کر بیچ کے لات ماری اور اس کی ڈاڑھی مشکہ خیز انداز سے ہچت کی طرف اٹھ گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دراصل اماں کے آگے شرما رہا ہے اور بن رہا ہے اور اسی لیے اس نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

اماں نے ان پھٹے ہوئے ورقوں اور تراشوں کو دیکھ رکھا: ”میں انھیں اٹلس پر چپکا دوں گی اور یہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو جائیں گے۔ یہ پہلے سے پھٹے ہوئے تھے، ان میں کتنی شکنیں آگئی ہیں۔“

جب کوئی سبق میری سمجھ میں نہ آتا تھا تو وہ عین اسی انداز سے مجھ سے گفتگو کرتی تھی۔ یہ سنتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کر کے بولا: ”آج ہی ٹھیک کر دینا۔ میں دوسرے ورق بھی لانا ہوں۔“

وہ دروازے تک گیا وہاں رُک کر اور مجھے اُنکلی دکھا کر بولا  
 ”اس کی مرمت ابھی باقی ہے۔“  
 اماں نے میری طرف جھٹک کر کہا: ”اس میں کوئی کسر نہ ہوگی۔  
 تو نے یہ حرکت کیوں کی؟“

میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ اگر آئندہ اُنھوں نے نانی کے  
 ہاتھ لگایا تو میں ان کی ڈارہی نوچ لوں گا۔“  
 نانی نے اپنی بھٹی ہوئی صدری اُتارتے ہوئے کہا:  
 ”بھول گیا اپنا وعدہ۔“ زمین پر ہتھوک کر وہ بولی: ”زیادہ بات  
 کی تو تیری زبان بھڑجائے۔“

اماں ایک نظر سے دیکھ کر پھر میرے قریب آئی:  
 ”ابا نے کس وجہ سے اتنی کو مارا؟“

نانی کو اب غصہ آگیا: ”اری درشکار بچے سے ایسے سوال  
 کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟۔ تجھے ان معاملوں سے کیا واسطہ؟  
 اماں نانی سے ہٹ گئی: ”اری میری دُکھا ماں!“  
 ”جل ہٹ میرے پاس سے! تیری ماں کوئی اور ہوگی۔“  
 ایک دوسرے کو اُنھوں نے خاموشی سے دیکھا۔ ادھر نانا جان  
 غلام گردش میں مٹر گنت کر رہے تھے۔

— x — x — x —

اپنی آمد کے چند روز بعد ہی اماں نے اس ہنسور سہیل  
 سے دوستی کر لی تھی ہر شام کو وہ اس کے کمرے میں جاتی تھی جہاں  
 نچنے کے افسروں اور حسین عورتوں کا مجمع رہتا تھا۔ نانا کو اس کی

یہ بات پسند نہ تھی۔ ایک روز باورچی خانے میں اس نے پتچ ہلاتے ہوئے یہ ڈانٹ بتائی: ”بے حیا، آٹنی پھر اپنی اصلیت پر! رات بھر وہ اودھم چوکڑی رہتی رہی کہ سونا حرام ہو گیا ہے۔“

اس نے فوراً کرایے داروں کو نکال باہر کیا۔ جب وہ چلے گئے تو وہ کہیں سے دو چھکڑے بھر چرانا فریج پر لایا اور اُن سے سامنے کے کمرے کو سجا کر اُسے بڑے سے تالے سے بند کر دیا۔

”کرایے داروں کی ضرورت نہیں۔ آئندہ میں خود لوگوں کو مدعو کیا کروں گا۔“

چنانچہ اتوار اور تیواروں کے موقع پر مہمانوں کی بھیسٹ رہنے لگی۔ نانی کی بہن بی مترینا جو ایک لڑاکا دھوبن تھی۔ اپنی چینی سی ناک لیے ہوئے پیش پیش ہوتی تھی۔ وہ بالوں میں سُہرا خضاب لگاتی اور دھاری دار ریشمی لباس پہنتی تھی۔ اس کے دونوں لمکے بھی آتے تھے۔ نقشہ نویس واسلی جو جھپٹا اور خوش مزاج تھا، سرتاپا بھورے کپڑے پہنتا تھا۔ دکٹر گوبا اینڈ دھنش میں ملبوس ہوتا تھا۔ اس کا سر گھوڑے کا سا اور مُتھیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ غلام گردش میں دستانے اتارتے ہوئے بھی وہ نہایت بے سُری آواز میں کوئی دھریپہ الاپا کرتا تھا جسے سُن کر میں چونک پڑتا اور سہم جاتا تھا۔

ماموں جاکوٹ ستارے ہوئے آتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گنج گھڑی ساز ہوتا تھا جس کے طور طریقے ایسے سُگھڑ تھے کہ مجھے پادری کا خیال آ جاتا تھا۔ ایک کونے میں ایک طرف سر ڈھلکا کر

وہ بیٹے بیٹے آپ ہی آپ مسکراتا اور اپنی مُنڈ ہی ہونی ٹھنڈی کو ناخون سے کریدتا رہتا تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور وہ ایک آنکھ سے عجیب انداز سے ہم سب کو گھورا کرتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور اس کا تکیہ کلام یہ تھا، ”تکلف نہ کیجیے، کوئی بات نہیں“

پہلی مرتبہ اُسے دیکھتے ہی مجھے بے اختیار ایک پُرانے واقعہ کی یاد آئی۔ دروازے کے باہر نقارے پر چوب پڑ رہی تھی اور ایک گاڑی جسے پولیس والا اور سیاہ پوش لوگ گھیرے ہوئے تھے قید خانے سے نکل کر چوک کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک منجھولے قد کا آدمی بڑا سا کنوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر ایک کالی تختی لٹک رہی تھی جس پر بڑے بڑے سفید حرفوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ غریب یوں سر جھکائے ہوئے تھا گویا اس تحریر کو پڑھ رہا ہو۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور زنجیریں جھنجھٹا رہی تھیں۔ لہذا جیب اماں نے گھڑی ساز سے مجھے ملایا تو میں ڈر کے مارے ہٹ گیا اور ہاتھ پیچھے چھپا لیے۔

”کوئی بات نہیں“ یہ کہہ کر اس نے کمر بند پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور ادھر ادھر گھما کر چھوڑ دیا۔ اس کی باجھیں کھو پڑی کی طرح کھل گئیں اور اس نے کہا:

”مضبوط لڑکا ہے“

میں کونے میں جا کر اس آرام کر سی پر دراز ہو گیا جسے نانا جانا

بڑے فخر سے کسی شہزادے سے منسوب کیا کرتے تھے۔ اس میں لیٹ کر میں سب کی حرکتوں کو دیکھنے اور سوچنے لگا کہ معمر لوگوں کی ہنسی خوشی بھی کس قدر باعثِ کوفت ہوتی ہے۔ اس اشنا میں گھڑی ساز کا چہرہ بھانت بھانت کے رنگ بدلتا جانا تھا اور میری ہر اس بڑھتی جاتی تھی۔

یہ چہرہ بہت لمبلا اور چکنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پگھل رہا ہے اور آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ مسکرانے میں اس کے موٹے موٹے ہونٹ اور ذرا سی ناک دہسنے کلاؤں میں گھس جاتی تھی اور کمان ہوتا تھا کہ برتن میں کوفتہ رکھا ہوا ہے!۔ اس کے بڑے بڑے کان بھی حرکت کرتے تھے۔ ایک کان تو بھوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اور دوسرا گال کی ہڈی کے ساتھ ہلتا تھا۔ جب وہ چھینکتا تھا تو دونوں کان ناک کو یوں چھپا لیتے تھے گویا اس پر ہتیلی رکھ دی گئی ہو۔ کبھی وہ گہری سانس لے کر اپنی جیب کو ہونٹوں کے ارد گرد اس خوبی سے گردش دیتا تھا کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔

وہاں چائے میں "رم" شراب ملا تے تھے جس سے جلی ہوئی پیاز کی سی بو آتی تھی۔ نانی کی بنائی ہوئی مختلف شرابوں کا دور چلنے لگتا تھا جن میں سے کوئی سونے کی طرح پیلی، کوئی تارکول کی طرح کالی اور کوئی سبز ہوتی تھی۔ وہ شہد، انڈے اور کیک بھی کھاتے تھے اور اس دوران میں سب پسینے میں شرابور ہو کر ہانپتے ہانپتے نانی کی تعریف کے پُل باندھ دیتے تھے۔ کھاپی کر



وہ دھڑا دے کر کرسیوں پر پڑ جاتے تھے اور ادٹکتی ہوئی آوازیں  
جاکوف سے کچھ بچانے کی فرمائش کرتے تھے۔

وہ فوراً ستار بجا بجا کر یہ یہودہ اور بے مُسکائیت گانے لگا:  
چنگ بجے، مردنگ بجے، کچھ راگ رنگ کی باتیں ہوں

دھوم مچائی ایسی ہم نے

جاگ اُٹھے سب بھائی برادر

ایک رنڈی کو پیار کیا

ہم سب نے جامِ موی پی کر

کالی کالی راتوں میں کچھ راگ رنگ کی باتیں ہوں!

یہ گیت مجھے نہایت نامعقول معلوم ہوا اور نانی نے بھی ٹوکا:  
”لڑکے گانے کو ایک یہی چیز رہ گئی ہے؟ بہن، تمہیں وہ گیت  
یاد ہیں جو ہم گایا کرتی تھیں؟“

اپنا لہنگا جھٹک کر بی دھوبن فرمانے لگیں: ”بہن، ہر چیز  
کی طرح اب گیتوں کا فیشن بھی بدل گیا

جاکوف نے آنکھ مل کر نانی کو یوں دیکھا گویا وہ سوگز کی

دوری پر ہو اور پھر حسب سابق اپنی میٹ میں شروع کر دی۔

نانا گھڑی ساز سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ گھڑی ساز

بھوں اُٹھا کر اماں کی طرف دیکھتا تھا اور اس کا محرک چہرہ ایک

عجیب و غریب انداز اختیار کر لیتا تھا۔

نانی ہمیشہ اپنے بھانجوں کے بیچ میں بیٹھتی تھی۔ دسلی سے

بڑی سنجیدگی سے کچھ کہہ کر وہ آہ بھرتی تھی:

”ہاں — اس معاملہ پر غور کرنا ہوگا“  
 وکٹر کسی اگھائے ہوئے کبوتر کی طرح مسکرا کر اپنے پاؤں پکھنے  
 لگتا تھا۔ اور یکایک زور شور سے وہی دھڑپ بھڑپ دیتا تھا:  
 ”کالی بلی کبوتر کھا گئی رے!“

سب لوگ چونک کر دم بھر کے لیے چپ ہو گئے اور اس کی  
 طرف گھورنے لگے۔ مگر دھوہن نے بڑے گھنڈ سے یہ بات سمجھائی:  
 ”اس نے نامک میں یہ گیت سیکھا ہے۔ وہاں سب لوگ یہی  
 گاتے ہیں۔“

اس قسم کی دو تین شایں گزریں اور ان کی ممکن اب تک  
 میرے دماغ میں باقی ہے۔ اس کے بعد ایک اتوار کو وہ گھڑی ساز  
 دن کے وقت نمودار ہوا۔ میں اماں کے ساتھ اس کے کمرے میں  
 بیٹھا ایک بھٹی ہوئی گوٹ کو سدھار رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ  
 کھلا اور نانی حیران و پریشان اندر آئی اور ”واریا، وہ آگیا!“  
 یہ کہہ کر فوراً غائب ہو گئی۔

اماں مبت بنی بیٹھی رہی۔ لیکن دروازہ دوبارہ کھلا اور  
 چوکھٹ پر نانا کا بھوت نظر آیا: ”بیٹی کپڑے پہن کر آ جا!“  
 اس نے سر بھی نہ اٹھایا: ”کہاں چلنے کو کہہ رہے ہیں“  
 ”یہ ضد نہ کرو، آ جاؤ۔ وہ بڑا نیک آدمی ہے اور خوش  
 حال بھی ہے۔ وہ الکسی سے سگے باپ کا سا سلوک کرے گا“  
 خلاف معمول وہ بڑے رُعب داب سے باتیں کر رہا تھا  
 اور اپنے سینے پر ہتیلی سے طبلہ سا بجا رہا تھا۔ لیکن اس کی

کہنیاں کانپ رہی تھیں گویا اس کے ہاتھ زبردستی آگے پھیلنے کو  
مچل رہے تھے۔

اماں نے اپنے فطری صابرانہ انداز میں کہا: ”کہہ دیا کہ یہ نہیں  
ہوسکتا۔“

نانائیوں ہاتھ پھیلائے ہوتے اس کے قریب آیا گویا اندھا  
ہو گیا ہی اور غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا،

”آتی ہی یا نہیں — ورنہ بال پکڑ کر کھینچ لے جاؤں گا۔“ اماں  
نے سن کر کہا: ”مجھے کھینچ لے جاؤ گے، ایس؟“ اس کے چہرے پر  
مردنی جھاگئی۔ اس نے اپنی کرتی اور سایہ اتار پھینکا۔ جب اس  
کے تن پر صرف زیر جامہ رہ گیا تو اس نے للکارا:

”چلو اب میں تیار ہوں۔“

نانا دانت پیس کر اسے ”مکا دکھانے لگا:“ دارشکا، پھر کہتا  
ہوں کہ کپڑے پہن لے۔“

اماں اسے دھکا دے کر دروازے تک گئی: ”کیوں آتے  
کیوں نہیں؟“

نانا نے چیخ کر کہا: ”تجھ پر خدا کی لعنت!“

”مجھے کس کی پروا ہے — آؤ نا اب!“

اس نے دروازہ پورا کھول دیا مگر نانا نے زیر جامہ پکڑ کر  
اسے دھکا اور گھٹنوں کے بل مگر پڑا۔

”اری چڑیل تو ہمیں غارت کر کے رہے گی۔ تیری شرم و  
حیا کو کیا ہوا؟“ اور وہ بکرے کی طرح منمنانے لگا: ”بڑی بی!“

نانی، اماں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی اور اسے یوں کھڈینے لگی گویا وہ مرغی ہو۔ وہ یوں سسکارنے لگی :

”درشکا، بجھے کیا ہو گیا ہے۔ دیوانی کہیں کی، ہٹ، منہ کالا کر“ اسے کمرے کے اندر کر کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر نانا کو ایک ہاتھ کا سہارا دے کر اور دوسرے سے دھمکا کر وہ بولی :  
”ارے بچے کھوسٹ“

نانی نے اُسے کوچ پر ٹپک دیا اور وہ روئی کے گڈے کی طرح منہ کھولے اور سہہ ہلاتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا۔  
نانی نے کڑک کر اماں سے کہا: ”کپڑے پہنتی ہو یا نہیں“  
زمین سے کپڑے اٹھا کر اماں نے کہا: ”لیکن میں کہ چکی کہ میں ہرگز اس کے پاس نہ جاؤں گی“

نانی نے مجھے کوچ سے اٹھا کر کہا: ”دوڑ کر بالٹی بھر پانی لے آ“  
میں غلام گردش کی جانب جھپٹا۔ دیوان خانے میں ایک گت سے کسی کا جوتا چرچا رہا تھا۔ ادھر اماں کی آواز سُنائی دی :  
”کل میں اس گھر کو چھوڑ دوں گی“

میں باورچی خانے میں جا کر محویت کے عالم میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

نانا کراہنے لگا، نانی بڑبڑانے لگی۔ پھر کوئی دروازہ بند ہوا اور ہر طرف موت کا سا ساٹا چھا گیا۔

اتنے میں مجھے ہوش آیا اور میں لوٹا بھر پانی لے کر غلام گردش کی طرف گیا۔ دیوان خانے سے کھڑی سائز باہر نکلا۔

ہتیلی سے اپنے کنوئپ کو سہلاتے ہوئے وہ خود بخود کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ نانی ہاتھ باندھے ہوتے اس کے پیچھے کھڑی خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہی تھی: ”آپ خود خیال کیجیے — محبت زبردستی نہیں کی جاتی“

وہ چوکھٹ پر ایک لمحہ رُک کر آگن میں نکل گیا۔ نانی کے جسم میں لرزہ آگیا اور وہ صلیب کے نشان بناتی ہوئی اس دُہکا میں پڑ گئی کہ ہنسنے یا رونے۔ لپک کر میں نے پوچھا:

”نانی کیا بات ہوئی؟“

اُس نے لوثا چھین لیا اور پانی اُس کے پیروں پر اچھل پڑا:

”ارے سر پھرے، تو یہاں پانی لینے آیا ہر۔ بند کر دے دروازہ!“

وہ اماں کے کمرے میں چلی گئی اور میں نے باورچی خانے سے سنا کہ وہ دونوں یوں ہانپ رہی ہیں جیسے بہت بڑا بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ سرکاری -

\* ————— \*

بڑا سہانا دن تھا۔ برت پوشِ شبنوں سے سورج کی ترچھی کرنیں اندر جھانک رہی تھیں۔ میز پر کھانے کے برتن چٹنے ہوئے تھے۔ دو ساغروں میں شراب جھلک رہی تھی۔ جھتوں اور دیواروں پر برت کی چادر کسی چاندی کے سمندر کی طرح جھلک جھلک کر رہی تھی۔ پنجرہ میں میرے پرندے دھوپ میں تھارہے تھے اور بھانت بھانت کی کھولیں کر رہے تھے۔

لیکن ایسا حسین و حبیبی دن جس میں ہر آواز گیت معلوم ہو رہی تھی، میرے دل کو خوش نہ کر سکا۔ ہر چیز مجھے بے موقع دے بے محل معلوم ہو رہی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ اپنے پرندوں کو آزاد کر دوں۔ اس خیال سے میں پتھروں کے پاس گیا ہی تھا کہ نانی چوڑ پیٹی ہوئی اندر دوڑی اور تندور کے پاس جا کر آپ اپنے کو کھسنے لگی۔

”اری اکولینا، تجھ پر ہزار پھٹکارا پاگل کہیں کی“

تندور سے دم بجت نکال کر اُس نے انگلی سے چھوا اور غصے کے مارے ٹھوک دیا: ”کم بخت اکڑ کر پتھر ہو گیا!۔ تو بے آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اری چڑیل، تیری عقل چرنے گئی ہو یا آنکھیں پٹ ہو گئی ہیں۔۔۔۔ ہاتے اللہ اب کیا کروں؟“

دم بجت کو پھونکتے ہوئے وہ رونے لگی اور جب اسے ادھر ادھر لوٹانے لگی تو اس پر اُس کے آسو ٹپاٹپ گرنے لگے۔ جب اماں اور نانا باورچی خانے میں آئے تو نانی نے میز پر جلا ہوا مرغ اس زور سے ٹپکا کہ تمام برتن اُجھل پڑے۔

”دیکھ لو اپنے کروت۔۔۔۔ سارا گوشت جل کر کوئلا ہو گیا“ مگر اماں کی مسرت اور اطمینان میں فرق نہ آیا۔ اس نے نانی کو پیار کر کے کہا کہ دل بدہشتہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نانا پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میز پر بیٹھ کر دست پاک کھولتے ہوئے وہ آنکھیں پھپھکانے لگا جو دھوپ کے مارے چُندھیا گئی تھیں: ”کوئی بات نہیں۔ سیکڑوں بار اچھے سے اچھا دم بجت

کھایا ایک بار جل گیا تو کیا ہوا..... خدا - لاکھ مرتبہ زرا ازرا سی تکلیف دیتا ہے لیکن ایک بار رحمت کی ایسی بارش کرتا ہے کہ گھر آگن ہنسال ہو جاتے ہیں۔ ورشکا، آؤ بیٹھو..... مارو گولی۔“

وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا اور متواتر خدا والیس کا ذکر کرتا رہا۔ وہ شکایت کرنے لگا کہ آباؤں کی زندگی بھی کیسی اجیرن ہے آخر خشن نانی نے ڈانٹ کر کہا:

”اگر تم چپکے سے کھانا کھاؤ تو خدا پر بڑی مہربانی ہوگی!“ اماں برابر ٹھٹھول کر رہی تھی اور اُس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مجھے دھکا دے کر بولی: ”تو ابھی ڈر کیوں گیا تھا؟“

تب تو نہیں لیکن اب دراصل میں کچھ بے چینی اور بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ ہر توبہ اور اتوار کی طرح آج بھی خورد نوش کا سلسلہ

دیر تک جاری رہا اور مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو دم بھر پہلے ایک دوسرے پر دیدے نکال رہے تھے اور شکوہ و فریاد سے گھر سر پر اٹھا رہے تھے۔ یعنی مجھے یقین نہ آیا کہ ان کی یہ خوشی سچی ہے اور وہ از سر نو رونا بیٹنا نہ شروع کر دیں گے۔ لیکن وہ اکثر اسی طرح لڑ جھگڑا اور روپیٹ کر پھر آپس میں مل جاتے تھے اور میں رفتہ رفتہ ان منظرؤں کا ایسا عادی ہو گیا کہ اس کا مجھ پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔

بہت دنوں بعد مجھے خبر ہوئی کہ روسی لوگوں کی زندگی ایسی غربت اور چلتا میں بسر ہوتی ہے کہ غم ان کی تفریح کا ایک پہانا ہو جاتا ہے۔ وہ سنج و محن سے بچوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ کام سے تھک کر وہ بغیر کسی تکیے پر آرام کرتے ہیں۔ آگ ان کے پیسے کھلونا ہے۔ اور زخم ان کے جسم کا زیور۔

## باب ۱۱

اس واقعہ کے بعد اماں نے یک بیک ایسا رعب جمایا، ایسی دھاک باندھی کہ وہ گھر کی مالکن بن بیٹھی اور نانا جو خلافت فطرت متفکر اور خاموش رہنے لگا تھا، اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھا۔

اب وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا دن بھر اپنی کوٹھڑی میں گھسے ہوئے چُھپ چُھپ کر ایک کتاب پڑھا کرتا تھا جس کا نام تھا: ”آسانی باپ کی تحریریں“ اس کتاب کو وہ صندوق میں بند رکھتا تھا اور ایک بار میں نے دیکھا کہ اسے نکالتے ہوئے وضو کر رہا ہے۔ اس موٹی سی کتاب پر سُرخ جلد چڑھی ہوئی تھی۔ نیلے سرورق پر رنگ برنگی روشنائیوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ”وسیلی کثرن کو۔ نذر خلوص و محبت“ اس کے نیچے عجیب سا نام لکھا تھا اور جلد کے اوپر ایک اڑتے ہوئے پرندے کی تصویر تھی۔

میں نے کئی بار پوچھا کہ وہ کون سی کتاب ہے۔ لیکن نانا نے ہمیشہ نہایت پُر اسرار انداز میں ایک ہی جواب دیا: ”ٹھہر جا....“ انتظار کر۔ میرے بعد یہ تجھے ہی ملے گی۔ اور تیرے لیے میں وہ چمڑے کی جاکٹ بھی چھوڑ جاؤں گا۔“

اماں سے اب وہ ملائمت سے بات کرنا تھا گو بہت کم اس کی



گنگو کو وہ غور سے سُنتا تھا اور اس کی آنکھیں پٹری کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتی تھیں اسے الگ ہٹا کر وہ بڑبڑانے لگتا تھا:

”اچھا، بہت ہوا۔ تو تو آپ اپنی فتمار ہی، جو جی چاہے کرے“

نانا کے اس صندوق میں بہت خوبصورت کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ریشمی لہنگے، ساتن کی صدریاں، زرد دوزی کے کام کے بادلے، موتی جڑے ہوئے سرپوش، رنگین رومال اور رنگ برنگ کے بار۔ ایک روز وہ ان سب کو لے کر ہانپتے ہوئے اماں کے کمرے میں گیا۔ اماں کپڑوں کے پیچھے دیوانی تھی۔ اور انھیں میزوں اور کرسیوں پر ٹپک کر کہا: ”ہمارے زمانے میں کپڑے اب سے زیادہ امیرانہ اور خوبصورت ہوتے تھے۔ اب وہ دن گئے اور کبھی نہ آئیں گے۔ لو، یہ تمہارے لیے ہیں، انھیں اپنے صحن میں لاؤ۔“

ایک دن اماں زرد دوزی کا بادلہ اور موتیوں کا سرپوش پہنے ہوئے نانا کے آگے آئی اور جھک کر آداب بجا لائی:

”آسمانی باپ، یہ لباس آپ کو پسند آیا؟“

نانا کا چہرہ کھل گیا اور اس کے ارد گرد جا کر دھیمی آواز میں بولا:

گویا وہ خواب میں بڑبڑا رہا تھا: ”اوہو... ورشکا... اگر تو امیر ہوتی تو بڑے بڑے تیرے آگے پانی بھرتے۔“

اماں اب سامنے کے دونوں کمروں میں رہتی تھی اور اس سے ملنے کو بہترے مہانوں کا جگمگٹ رہتا تھا۔ اکثر آنے والوں میں دونوں میکسٹن برادران تھے: پیٹر ایک گھٹیل، سمیلا افسر تھا جس کی آنکھیں خلیں اور ڈاڑھی گھنری تھی۔ یہ وہی تھا جس کے سامنے نانا نے ایک بوڑھے

کی چندیا پر تھوکنے کے جرم میں مجھے پٹایا تھا۔ دوسرا بھائی یوحین، اونپنا اور دُبلاتا تھا۔ اس کا چہرا پیلا اور داڑھی چھوٹی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بادام کی سی تھیں۔ وہ ایک سبر کوٹ پہنتا تھا جس میں سونے کے بٹن لٹکے تھے اور جس کے کاندھوں پر سنہرے فیتے لگے تھے۔ وہ اپنے سر کو جنبش دے کر گنگنہرالی ٹوں کو ماتھے پر سے ہٹا کر پیچھے پھینک دیتا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں لطافت کا پہلو ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ اپنی بیٹی ہوئی آواز میں کوئی قصہ سُنا تا تو سب سے پہلے یہ جملہ کہتا:

”آپ کو معلوم ہو کہ ایسا کیوں ہوا“

اس کی باتیں سننے وقت اماں کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں اور وہ اکثر بات کاٹ کر کھکھلا پڑتی تھی: ”یوحین صاحب، معاف کیجیے گا ابھی آپ بچے ہیں“ اور وہ افسران پر ہاتھ مار کر کہہ اٹھتا تھا:

”جی ہاں، ابھی دودھ پیتے ہیں!“

بڑے دن کی چھٹیوں میں بڑی دھوم دھام رہتی تھی۔ لوگ زرق برق لباس پہنے اماں سے ملنے آتے تھے۔ وہ خود جو پوشاک پہنتی وہ ان سب سے بہتر ہوتی تھی اور وہ مہانوں کے ساتھ سیر کو جایا کرتی تھی۔ جب کبھی وہ ان ریگیلے مہانوں کے ساتھ چلی جاتی تو گھر میں موت کا سا سناٹا چھا جاتا تھا۔ ہر طرف قبر کی سی خاموشی پھیل جاتی تھی۔ نانی کسی بوڑھی بطخ کی طرح کمر ٹھیک کرنے لگتی تھی۔ نانا گرم تندو سے پھڑک کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا تھا: ”ہوں.... ہوں.... ٹھیک ہوا دیکھنا ہو کہ گھرنے کا۔“

بڑے دن کے بعد اماں نے مجھے اور ماموں مائیکل کے بیٹے سائنٹا۔

کو اسکول بھیج دیا۔ ساشا کے باپ نے نئی شادی رچالی تھی اور سوتیلی ماں نے قدم رکھتے ہی اسے پٹینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ، نانی کی منت سماجت پر نانا اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ ہم مہینے بھر اسکول گئے اور اس مدت میں میرے پتے صرف یہ پڑا کہ اگر میرا خاندانی نام پوچھا جائے تو بجائے ”پشکوف“ کہنے کے مجھے پورا جلد کہنا چاہیے: ”خاکسار کو پشکوف کہتے ہیں“ اور مجھے استاد سے یہ نہ کہنا چاہیے کہ: ”بڑے میاں“ یوں آنکھیں نہ دکھائیے۔ آپ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے!“ پہلے تو مجھے اسکول بالکل نہ بھایا۔ اس کے برعکس ساشا کا جی وہاں بہت بھلا اور اس نے سب سے دوستی پیدا کر لی۔ مگر ایک روز سب کے دوران میں اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند میں چلا اٹھا: ”میں یہ نہ کروں گا!“

وہ چونک پڑا اور بے کہے مئے کلاس سے بھاگ گیا۔ سب لوگ اس کی اس حرکت پر بہت ہنسے۔ دوسرے دن اسکول کے قریب وہ رُک گیا اور بولا: ”تم جاؤ“ — میں نہ آؤں گا — میں تو آج چھٹی مناؤں گا“

وہ پالتی مارکر بیٹھ گیا اور برف کے اندر بستہ چھپا کر چلتا ہوا۔ آسمان دمک رہا تھا اور ہر طرف دھوپ ہی دھوپ تھی۔ میرا بھی جی بہت مچلا مگر میں پتا مارکر اسکول چلا ہی گیا کیوں کہ اماں کو میں ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔ ساشا کی وہ کتابیں پھر نہ ملیں اور اس بہانے اس نے دوسرے دن بھی چھٹی منائی۔ مگر تیسرے دن اس کی غیر حاضری کی رپورٹ نانا جان کو ملی۔ ہم دونوں کی طلبی ہوئی۔ نانا نانی اور

اماں باورچی خانے کی میز پر ہم دونوں سے جرح کرنے لگے۔ مجھے ساشا کے پُر لطف جواب کبھی نہ بھولیں گے۔

”تو اسکول سے کیوں بھاگا؟“

”مجھے اُس کا راستہ یاد نہ رہا“

”کیا کہا؟“

”واقعی میں راستہ بھول گیا۔ بہت ڈھونڈا۔“

”لیکن انکسی تیرے ساتھ تھا۔ اسے تو راستہ یاد تھا۔“

”لیکن اس سے میرا ساتھ چھوٹ گیا۔“

”یہ کیسے؟“

پل بھر سوچ کر ساشا نے کہا: ”وہ برفانی طوفان تھا کہ ہاتھ کو

ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔“

اس پر سب مسکرا پڑے اور میری جان میں جان آئی۔ ساشا نے بھی ڈرتے ڈرتے دانت نکال دیے۔ لیکن نانا نے تیوری چڑھا کر پوچھا: ”لیکن تو نے انکسی کا ہاتھ کیوں نہ پکڑا؟“

”پکڑا تو تھا لیکن ہوا کا وہ جھونکا آیا کہ۔۔۔“

ودست اور دھیمی آواز میں بول رہا تھا اور اس کی اس

دیدہ دلبری اور سفید جھوٹ کو سن کر میں دنگ رہ گیا۔

ہم دونوں کی خوب ٹھکائی ہوئی اور ایک گنجا آگ بھٹیٹا اس

خدمت پر معمور ہوا کہ ہمیں اسکول لے جائے اور ساشا کو علم کی راہ

سے نہ پھٹکنے دے۔ لیکن یہ تدبیر بھی لا حاصل ثابت ہوئی۔ دوسرے

دن پلٹا کے باس پہنچتے ہی ساشا ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک چوٹا

ادھر اور دوسرا اُدھر پھینک دیا اور ننگے پاؤں بگ ٹٹ بھاگ گیا۔ بیچارے بوڑھے سے کچھ نہ بن پڑا اور وہ دونوں جوتے لیے ہوئے ہانپتے کانپتے میرے ساتھ گھر لوٹ آیا۔

نانا، نانی اور اماں دن بھر اس بھگوڑے کو شہر بھر میں ڈھونڈتے پھرے۔ شام کو وہ شراب کی ایک بھٹی میں ناچتا ہوا ملا۔ وہ لوگ اسے گھر پکڑ لائے، مگر اس گھٹے اور سہٹی لڑکے کی مرمت بیکار تھی۔ تندور پر میرے پاس اس طرح لیٹے ہوئے کہ اس کی ٹانگیں جھپٹ پر اٹکی ہوئی تھیں، اس نے آہستہ سے کہا: ”دنیا میں کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ نہ ابا، نہ سوتیلی ماں اور نہ نانا۔ پھر میں اُن کے ساتھ کیوں رہوں؟ میں نانی سے ڈاکوؤں کا پتا پوچھوں گا اور اُنھیں کے پاس چلا جاؤں گا۔ . . . . . تب تم سب کو ہوش آئے گا۔ . . تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں بھاگ چلے؟“

یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ کیوں کہ ان دنوں میں بہت مصروف تھا۔ میں نے افسر بننے کا فیصلہ کر لیا تھا، گھنی ڈاڑھی والا افسر۔ اور اس کے لیے تعلیم از بس ضروری تھی۔ جب میں نے ساسا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی سوچ بچار کے بعد میرا ہم خیال ہو گیا۔ ”اچھا خیال ہے۔ جب تک تم افسر بنو گے میں ڈاکوؤں کا سر دھو جاؤں گا۔ اگر تم مجھے پکڑنے آئے تو یا تو دونوں میں سے ایک کی جان جائے گی یا وہ قید ہوگا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں قتل نہ کروں گا۔“

”میں بھی تمھاری جان نہ لوں گا“

اس معاملے میں ہم میں اختلاف نہ تھا۔

اتنے میں نانی تندور پر چڑھ آئی اور ہم دونوں کو دیکھ کر کہا:

”کیوں رے چو ہو؟ ایس! — اللہ کے ڈلارے یتھو! —“

یوں ہم پر رحم جتا کہ اس نے ساشا کی سوتیلی ماں کو خوب کوسا جو ایک بھٹیاری کی بیٹی تھی۔ جوش میں آکر اس نے سب سوتیلی ماؤں کو کوسنا شروع کیا اور ہمیں حضرت ایونا ولی اللہ اور ان کی سوتیلی ماں کا قصہ سنایا۔ ان کا باپ ایک ماہی گیر تھا:

”یہ عورت دراصل ایک چڑیل تھی۔ اس نے بھانت بھانت کی

نہ ہرلی جڑی بوٹیوں کی شراب بنائی اور جنت منتر پھونک کر اسے اپنے

شوہر کو بلا دیا۔ جب وہ ابد کی نیند سو گیا تو اس نے اُسے پانی میں

ڈال دیا اور بال کھول کر سینہ پیٹنے لگی کہ ہر ہی! میرا سہاگ لٹ

گیا، میرا گھر اُجڑ گیا۔ یہ ماتم سن کر بڑوسی دوڑے اور جادوگرنی

کو دلاسا دینے لگے کہ خدا تجھے تیری وفا کا صلہ دے گا۔ سب کو

یقین آگیا کہ ماہی گیر بھنور میں بھنس کر ڈوب مرا۔ مگر اس کے بیٹے

ایونا، کو اس چڑیل کی باتوں پر اعتبار نہ ہوا۔ اس نے لٹکار کر کہا

کہ اسی فریب کار، دغا باز! دیکھ، ابھی میرا خدا تیرا بھرم کھولتا ہے۔

کوئی شخص چھری اوپر اُچھالے، اگر تو بے گناہ ہے تو چھری مجھے نکلے اور

اگر تو قاتل ہے تو اپنی سزا کو پہنچے۔ یہ سن کر سب تماشاخی گم گم

رہ گئے۔ مگر ایک گیانی نے ہمت باندھ کر اس کے کہے پر عمل کیا

اور چھری آسمان کی طرف اُچھالی۔ دیر تک یہ چھری ہوا میں بیچ د

تاب کھاتی رہی اور پھر یک بیک نیچے آکر جادوگرنی کے کلبے میں دھنس گئی۔

یہ دیکھ کر سب نے اس ننھے ولی کا جوجو کار کیا اور اس کے لیے پہاڑ میں ایک حجرہ بنایا جہاں اس نے مرتے دم تک عبادت کی۔ اس واقعہ کے دوسرے دن میں نیند سے جاگا تو میرے جسم بھر میں لال جتیاں اُبھر آئی تھیں۔ یہ چیچک کا آغاز تھا۔

میں پھوپھوٹے کی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا اور وہاں کئی روز بے حرکت پڑا رہا۔ کیوں کہ میرے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیے گئے تھے۔ ہر رات کو بھیانک پسینے دکھائی دیتے تھے اور ان میں سے ایک میں تو میں مر ہی گیا۔ نانی کے سوا کوئی میرے پاس نہ آتا تھا وہ مجھے چمچے سے کھلاتی تھی اور ہر روز اپنے بے پایاں ذخیرے سے ایک نئی دستان لے کر آتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں بحال ہونے لگا۔ ایک ستام کو میں نانی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ یہ اس کے آنے کا وقت تھا۔ میرے جسم کے بندھن کھل گئے تھے۔ بجز ہاتھ کے تاکہ میں اپنا منہ نہ کھجا ڈالوں۔ نانی کی تاحیز مجھے سراسیمہ کر رہی تھی کہ اچانک اس پر میری نظر پڑی وہ دروازے کے باہر زمین پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی اور چچا پیٹر کی طرح اس کی آدھی گردن ایک گڑھے میں دھنس گئی تھی۔ شفق کے دُھندلکے میں میں نے ایک پتے کو دیکھا جو اپنی لپٹائی ہوئی ہری آنکھوں سے اُسے تاکتا ہوا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں بلنگ سے یوں ہڑپڑا کہ باہر آگن میں برف کی

نالی میں کودا کر میرے ہاتھ پاؤں کھڑکی کے شیشے سے کٹ گئے۔ اُس روز اماں کے یہاں بہت سے مہان آئے تھے اس لیے کسی نے کھڑکی ٹوٹنے کی آواز نہ سنی۔ مجھے کچھ دیر برف میں یوں ہی پڑا رہنا پڑا۔ کوئی ہڈی تو نہ ڈٹی تھی مگر میرا شانہ اتر گیا تھا جسم بھر میں کاپچ کی کڑچیں اتر گئی تھیں اور ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی تھیں۔ چنانچہ تین مہینے تک میں اپاہج بنا صاحبِ فراش رہا۔ بے حرکت پڑے پڑے میں محسوس کرتا تھا کہ مکان بہت شوخاں ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا اور دروازے ہمیشہ کھلتے بند ہوتے رہتے تھے۔

ہماری چھت پر برفانی طوفان شور مچاتے تھے۔ دروازے کے

باہر ہوا کے جھکڑ سناتے تھے اور ہمیں کے اندر کوئی اس جوش سے نوحہ سُنا تا تھا کہ دیواریں کانپ جاتی تھیں۔ دن کو کٹے کانیں کانیں کرتے تھے اور رات کو بھیڑیوں کی ہولناک دھاڑ سنائی دیتی تھی۔ یہ تھی وہ موسیقی جس میں میرے دل کو نشو و نما ملی۔ پھر وہ دن بھی آئے جب مارچ کے سورج کی تابانی کے ساتھ پہاڑنے شرماتے شرماتے دالان میں جھانکا۔ بلیاں ہر طرف شادمانی کے نعرے بلند کرنے لگیں۔ بہار کی انی دیوار کے ایک ایک پتھر میں جا چبھی۔ سنگین برف ریزے بھی پانی ہو کر بہ گئے۔ اور گر جا کے گھٹنوں کی آوازاں اب ویسی صاف نہ رہی جیسی جاڑوں میں تھی۔

اب نالی جب کبھی میرے پاس آتی تو اس کی تقریر دوڑکا شراب کی بو میں بسی ہوتی تھی۔ یہ بوز بوز بروز تیز ہوتی گئی،



اس مدت تک کہ وہ ایک بڑی سی کیتلی لاکر میرے پنگ کے نیچے  
چھپا دیتی اور منت کرتی:

”بیٹے اپنے نانا سے نہ کہیو۔ اچھا؟“

”لیکن تم شراب کیوں پیتی ہو؟“

”اس سے تجھے کیا بحث؟ ان باتوں کو تو بڑا ہو کر سمجھ سکے گا:

کیتلی کھول کر، اپنے ہونٹوں کو آستین سے پونچھتی ہوئی وہ بڑے  
مزے میں مسکرانے لگی:

”کیوں چھوٹے صاحب، آج میں تمہیں کیا سناؤں؟“

”میرے ابا کا حال سناؤ؟“

”کس جگہ سے؟“

جب میں نے یاد دلایا تو اُس کی داستان کسی گنگنا تے  
ہوئے جھرنے کی طرح بہنے لگی۔

ایک روز وہ تھکی ہاری سی آئی تھی اور ذیل کی تہید کے  
بعد خود بخود ابا کے حالات سنانے لگی تھی:

”تیرے باپ کو میں نے خواب میں دیکھا۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے  
کھیتوں میں ٹھل رہا تھا اور ایک کتا زبان نکالے ہوئے اس  
کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے بعد میں عموماً ہر شب کو اُسے  
سننے میں دیکھتی ہوں .... اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس  
کی روح بے قرار ہے۔“

منذ اتر کئی شاموں تک وہ مجھے ابا کے تھتے سنا تی رہی جو  
اس کی دوسری کہانیوں سے کم دل چپ نہ تھے۔

میرا باپ ایک سپاہی کا بیٹا تھا۔ یہ سپاہی ترقی پا کر افسر بن گیا مگر اپنے ماتحتوں پر ظلم کرنے کے جرم میں حبس دوام کی سزا پا کر سائبیریا چلا گیا۔ وہیں میرے باپ کا جنم ہوا۔ اس کی ساری زندگی مصیبتوں میں بسر ہوئی۔ بچپن ہی میں اُسے گھر سے بھاگنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک بار دادا نے اسے پکڑنے کے پے جنگل میں کُتے پیچھے لگا دیے۔ دوسری مرتبہ اسے اس بے دردی سے پٹیا کہ پڑوسیوں کو بیچ بچاؤ کر کے اُسے چھپا دینا پڑا۔

میں نے پوچھا ”کیا بچے ہمیشہ سے پٹتے آئے ہیں؟“

جواب ملا: ”ہاں ہمیشہ سے“

دادی تو ابا کے بچپن ہی میں مر گئی تھیں۔ اب جو وہ نوسال کے ہوئے تو دادا بھی چل بسے۔ ایک صلیب ساز نے اس یتیم کو گود لیا اور اپنا ہنر سکھانا شروع کیا۔ مگر ابا وہاں سے بھی فرار ہو گئے۔ اور میلوں میں اندھوں کی رہبری کر کے اپنا پیٹ پالنے لگے۔ سولہ سال کی عمر میں وہ غنہ آ کر آگن بوٹوں کے ایک مستری کے ہاں کام کرنے لگے اور بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ بڑھی گری اور آرائش کاری کے استاد ہو گئے۔ ان کا کارخانہ تانا کے پڑوس میں تھا۔

نانی نے قہقہہ لگا کر کہا: ”دیواریں اونچی نہ تھیں اور کچھ لوگ تاک جھانک میں ایک ہی مشاق تھے۔ ایک روز میں اپنی بیٹی کے ساتھ باغ میں بیر توڑ رہی تھی کہ تیرے باپ پر نظر پڑی جو دیوار پھاند رہا تھا۔۔۔ میں تو پہلے کئی کئی رہ گئی۔ لیکن یہ

گبرو جوان ننگے پاؤں ننگے سر سفید قمیص اور پتلون پہنے سیب کے  
جھڑٹ کی طرف بڑھا۔ یوں ان لوگوں میں محبت شروع ہوئی۔  
جب اسے میں نے پہلے پہل دیکھا تھا تو دل نے کہا کہ کیسا اچھا  
لڑکا ہے! اب وہ جو میرے روبرو آکھڑا ہوا تو میں نے گھڑکی  
بتائی:

”کیوں جی، تم پڑاتے باغ میں پھانڈنے والے کون ہوتے ہو؟“  
وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے گر پڑا: ”بڑی بی، میں کیا  
کروں..... میں ورشکا کی محبت کا مارا ہوا ہوں۔ خدا ماہم پر  
رحم کھاؤ اور ہماری شادی کرا دو“

یہ سُن کر میری تو گھگھکی بندھ گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا  
تو تیری ماں پیڑ کی آڑ میں لاج کی ماری کھڑی اُسے سِنیاں  
دے رہی تھی۔ مگر ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تیر  
رہے تھے۔

میں نے چلا کر کہا: ”ارے بد معاشو! تم دونوں نے یہ کیا  
پاکنڈ رچایا ہے! اری ورشکا، تیرے اوسان تو خطا نہیں ہو گئے  
... ارے لڑکے، تجھے کیا سوچھی ہے، کیا تو زور دکھانا چاہتا ہے؟“  
اس زمانے میں تیرے تانا مالدار تھے۔ اپنے بیٹوں کو انھوں  
نے حصّہ نہ دیا تھا۔ چار چار مکان اور نقدی الگ۔ ان کے حوصلے  
بھی بہت بلند تھے۔ حال ہی میں برادری کی طرف سے انھیں  
وردی اور تمغہ ملا تھا کیوں کہ لگاتار نو سال تک اُنھوں نے  
چودھری کے فرائض ادا کیے تھے۔ لہذا ان کے مزاج ہی نہ ملتے تھے

میں نے انہیں ہر طرح ڈانٹا ڈپٹا، سمجھایا، سمجھایا، لیکن دل ہی دل میں ان پر بہت ترس آیا کیوں کہ وہ دونوں بہت مایوس ہو گئے تھے۔ آخر حیرے باپ نے کہا: ”میں جانتا ہوں کہ بڑے میاں خوشی خوشی مجھے داماد نہیں بنائیں گے، اس لیے میں اُسے اُڑالے جاؤں گا۔ اس میں آپ میری مدد کیجیے!“

مٹی اس پچھلے کی باتیں! مجھے بہت ہنسی آئی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہنے لگا: ”مچا ہو تو مارو یا جلاؤ۔ میں اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا!“

اتنے میں ورشکا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: شادی کے منصوبے باندھتے باندھتے ہم نے کتنی دیر کر دی — مٹی میں ہی نکاح ہو جاتا تو کیسا اچھا تھا!“

ایں . . . . . یہ کیسے . . . . . اوقہ میرے اللہ!“

اتنا کہ کر تانی مہنی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ پھر تاس سو نگہ کر آنکھیں پونچھتے ہوئے اُس نے اطمینان کی سانس لی: ”تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں . . . . . تو کیا جانے کہ شادی کیا بلا ہے . . . . . لیکن یہ یاد رکھ کہ شادی کے پہلے کسی لڑکی کا ماں بننا سب سے بڑی آفت ہے۔ بڑے ہو کر خبردار جو کسی لڑکی کو اس ڈھڑے پر لایا۔ تیرا تو منہ کالا ہو گا ہی، وہ لڑکی دین و دنیا کہیں کی نہ رہے گی اور بچہ حرامی کہلائے گا۔ میری بات کو گرہ باندھ کر رکھ لے!۔ عورتوں سے مہربانی سے پیش آنا اور ان سے اپنے عیش کے لیے نہیں بلکہ ان کی ذات کی

حاضر محبت کرنا۔ میری نصیحت کو نہ بھولنا۔“  
 چند لمحوں کے لیے وہ کسی خیال میں ڈوب گئی۔ پھر چونک کر  
 اپنا قہقہہ سنانے لگی: ”اس صورت میں کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے  
 تیرے باپ کے ایک تھپڑ لگایا اور ورثہ کا بھی گوشمالی کی۔ مگر  
 لڑکا بھی کہنا گیا: ”محبت تکرار سے یہ گتھی نہ بٹلے گی۔“ اور لڑکی  
 نے کہا: ”پہلے کوئی راہ بتائیے، پھر جا رہے میری بوٹی بوٹی فوج  
 لیجیے۔“

میں نے پوچھا: ”جیب میں کچھ دام بھی ہیں؟“  
 تیرے باپ نے کہا: ”زیادہ نہیں، کیوں کہ ورثہ کا کے لیے  
 انگوٹھی خرید لی۔“

”سب ملا کر کتنے روپے تھے؟“

”یہی کوئی سو روپے۔“

اُن دنوں روپیہ مشکل سے ملتا تھا اور چیزوں کے دام  
 بھی ہینگے تھے۔ میں کبھی ایک کا سنہ تکتی کبھی دوسرے کا اور سچتی  
 کہ یہ دونوں کیسے نادان ہیں۔۔۔۔۔

تیری ماں نے بتایا: ”آپ کے ڈر سے میں نے انگوٹھی چھپا  
 رکھی تھی۔ ہم اسے بیچ دیں گے۔“

وہ دونوں کتنے معصوم تھے۔ کس قدر بھولے!۔ ہم نے  
 اسکیم بنائی کہ ہفتہ بھر میں شادی ہو جانا چاہیے اور میں نے  
 وعدہ کیا کہ پادری کا انتظام میں کر دوں گی۔ کہنے کو تو کہہ دیا مگر  
 میرا دل دھک دھک کرنے لگا کیوں کہ تیرے نانا کی ہیبت تھی

ورثکا بھی خوف کے مارے پبلی پڑ گئی۔ جب بھی ہوا، انتظام پتہ ہو گیا! لیکن تیرے باپ سے ایک کھاری گر کی دشمنی تھی۔ خدا اسے غارت کرے۔ اُسے عرصے سے کچھ سُن گُن مل گئی تھی اور وہ ہم لوگوں کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ روز مقررہ کو میں نے حسب مقدور اپنی اکلوتی بیٹی کو سجایا بنایا اور اسے دروازے تک بولا لائی۔ جہاں ایک گھاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ورثکا اس میں بیٹھ گئی تیرے باپ میکسم نے سیٹی بجائی اور گھاڑی چل پڑی میں روتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی کہ یہ بندہ خدا راہ روک کر کھڑا ہو گیا اور بڑی عاجزی سے بولا: ”بڑی بی“ میرے سینے میں بھی ایک دل ہو اور میں قسمت کے کیے میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ مگر میری زبان بند کرنے کے لئے پچاس روپوں کی ضرورت ہے۔ میرے پاس تو پھوٹی کھڑی بھی نہ تھی۔ مجھے روپیوں کی کوئی جاہت نہ تھی اور نہ میں نے کچھ پس انداز کیا تھا۔ میں نے نادانی یہ کی کہ اس پر اپنا بھانڈا بھوڑ دیا :-

”بھیتا میں خالی ہاتھ ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں دے سکتی“

”مگر تم کوئی وعدہ تو کر سکتی ہو“

”یہ کیسے؟ وعدہ کر بھی لوں تو اسے پورا کرنے کی کیا صورت ہے؟“

اوہو! ایسے مالدار شوہر کی گرہ سے چند رُپے نکال لینا کیا مشکل ہے۔

اگر میرے ہوش ٹھکانے ہوتے تو ضرور اس سے معاملہ کر لیتی۔ لیکن میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اور گھر کے اندر

چلی گئی۔ بس آنگن میں آکر اس نے وہ قیامت برپا کی کہ الامان! آنکھیں بند کر کے نانی مسکرانے لگی: ”اب بھی اپنی اس حرکت کے انجام کا نقشہ میری آنکھوں کے آگے گھوم رہا ہو۔ تیرے نانا شیر کی طرح دھاڑ اُٹھے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا مذاق ہو۔ قسمت کا کھیل کہ انھیں دنوں وہ درخشا کو دیکھ دیکھ کر فخریہ کہتے تھے: ’اس کا بیاہ میں کسی رئیس سے کروں گا۔ مگر اس کے بھاگ میں تو یہ رئیس زادہ لکھا ہوا تھا!۔ حضرت مریم کے سوا کس کو خبر کہ کن کا جوڑا بدا ہوا ہو۔

بڑے میاں آنگن میں یوں جھپٹے گویا تلوے سلگ رہے ہوں اور اپنے دونوں بیٹوں کو طلب کیا۔ اس بد معاش جاسوس کی رائے پر انھوں نے ’کلیمہ‘ کو چبان کو بھی ہمراہ لیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چابک تھا جس کے دستے کو سیسا پلا یا گیا تھا۔ مائیکل نے اپنی بندوق سنبھالی۔ اس زمانے میں ہمارے گھوڑے بڑے چست و چالاک تھے اور گاڑی بھی ہلکی پھلکی تھی۔ یعنی اسباب ایسے تھے کہ ان دونوں بھگوڑے عاشقوں کی گرفتاری یقینی تھی۔ مگر درخشا کے نصیب آڑے آئے اور مجھے ایک ترکیب سوچھ گئی۔ ایک چھری سے میں نے گاڑی کے ہم کی رسی کاٹ دی تاکہ وہ لوگ بیچ راستہ میں رک جائیں ایسا ہی ہوا۔ ہم الگ گھر پڑے اور ان چاروں کی جاں جاتے جاتے بچی۔ اس بھیمیلے میں وقت بھل گیا اور جب تک وہ گرجا گھر پہنچیں، درخشا اور میکسم نکاح کی رسم ختم کر چکے تھے۔

اب ان سب نے میکسم سے جھگڑا شروع کیا لیکن وہ ایک ہی زور آور تھا۔ اس نے مائیکل کو وہ پٹخنی دی کہ بچوں کی ہانہ اکھڑ گئی۔ کوچبان کی بھی یہی گت ہوئی پھر تو بڑے میاں اور ان کے سب گارڈر سٹی بھول گئے۔

غصے میں بھی اسے حفظ مرتبہ کا پاس رہا اور اس نے بڑے میاں سے کہا: ”آپ یوں چابک نہ ہلائیے کیوں کہ میں فطرتاً امن پسند ہوں۔ میں نے صرف وہی لیا جو خدا نے مجھے دیا ہے۔ اور اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی..... اس سے زیادہ میں نہیں کہنا چاہتا۔“

ان لوگوں نے بھی بات نہ بڑھائی۔ بڑے میاں نے گاڑی کا رخ کرتے کرتے کہا: ”ورثکا، الوداع! آج سے تو میری بیٹی نہیں رہی۔ اور خواہ تو زندہ رہے، خواہ ایک ایک دانے کی محتاج ہو کر مرجائے، میں تیرا منہ نہ دیکھوں گا۔“

گھر لوٹ کر انھوں نے مجھے خوب کوسا، خوب پیٹا مگر میں بھی منہ میں گھنگھنیاں بھر کر بیٹھ گئی۔

دن گزر جاتے ہیں یاد رہ جاتی ہے۔

پھر تیرے نانانے کہا: ”سنو جی، یہ بھول جاؤ کہ کبھی تمھاری کوئی بیٹی بھی تھی۔“

مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا: ”اے مکار بس اتنی سی خود فریبی — یہ کیوں نہیں کہتا کہ برف گرم ہوتی ہے؟“

میں کان لگا کر یہ کہانی سنتا رہا۔ اس کے بعض واقعات



میرے لیے حیرت افزا تھے کیوں کہ نانانے اماں کے بیاہ کا ذکر دوسرے پیرایہ میں کیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ اماں نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ تاہم شادی کھلے خزانے ہوئی تھی اور خود یہ حضرت کلیسا میں موجود تھے۔ میں نے نانی سے یہ نہ پوچھا کہ دونوں میں سے سچا کون ہے کیوں کہ بہر حال اس کی کہانی زیادہ دلچسپ تھی اور میں نے اسے ہی ترجیح دی۔

قصہ کہتے وقت وہ متواتر بیتی جاتی تھی گویا کسی ڈونگے میں جھونکے کھا رہی ہو۔ اگر کوئی حسرتناک یا بھیانک واقعہ ہوتا تو وہ زور سے جھولنے لگتی اور یوں ہاتھ چلاتی گویا ہوا میں کسی چیز کو ہٹا رہی ہو۔ اکثر وہ آنکھیں بند کر لیتی اور اس کی بھڑکی بے حرکت ہو جاتیں مگر ایک حلیم و حسین تبسم اس کے پرشکن گالوں میں آچھپتا تھا۔ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد تھا اور کبھی تو اس سے میرا دل بھی بھر آتا تھا۔ لیکن کبھی میں جھلا اٹھتا کہ وہ زیادہ دبدبے اور غصے سے کام کیوں نہیں لیتی۔

دو ہفتے تک تو مجھے ورشکا اور میکسم کی کوئی سُن گُن نہ ملی۔ اس کے بعد ایک غریب لڑکا ان کی خبر لے کر آیا۔ سینیچر کے روز میں انھیں دیکھنے گئی۔ بہانہ تو گر جا گھر کا تھا لیکن پہنچی میں ان کے گھر۔ دور دراز کے کسی مکان کے ایک پہلو میں وہ رہتے تھے اور ان کے سامنے کے آئگن میں کوئی کارخانہ تھا۔ گندگی اور شور و غل کا ٹھکانہ تھا، خاصا مچھلی بازار تھا۔ لیکن انھیں اس کی کیا پروا تھی۔ دو بیویوں کی طرح یہ ہمیشہ غرغر کرتے، کھیلتے اور خوش

رہتے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق میں ان کے لیے سب کچھ لے گئی۔ چائے، شکر، آٹا، مال اور چند رُپڑ جو میں نے بڑے میاں سے جیسے تیسے جھپٹ لیے تھے۔ بیٹے، چوری جائز ہی بشرطیکہ وہ دوسروں کے بھلے کے لیے ہو۔

لیکن تیرے باپ نے یہ سب لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایں، کیا ہمیں کنکال محتاج جانا ہے؟ اور تو اور درشکا نے بھی اس کے سر میں سر ملایا: امی یہ سب کیا ہے؟ اب تو میں نے ان دونوں کی خوب خبر لی: ارے بے وقوفو، کیا میں ایسی برائی ہو گئی؟۔۔۔۔۔ اللہ نے مجھے تم دونوں کی ماں بنایا ہے۔۔۔۔۔ اری بڑ بولی، تو کس کے گوشت پوست سے بنی ہے۔ کیا تم دونوں میرا دل توڑنا چاہتے ہو؟ تمہیں اس کی خبر نہیں کہ جب دنیا میں کوئی اپنی ماں کو دکھ دیتا ہے تو فردوس میں مریم کا کلیجہ پھٹتا ہے۔“

یہ سن کر میکسم نے مجھے گلے لگا لیا اور مجھے کمرے بھر میں نچا تا بھرا۔ وہ کتنا طاقت ور تھا، ریچھ تھا ریچھ!۔ اور اس اٹھڑ درشکا کو دیکھو، وہ مورنی کی مانند اپنے میاں پر ناز کر رہی تھی اور اسے یوں تک رہی ممتی گویا وہ کوئی نیا کڈا ہے۔ گھر گھرستی کے معاملات پر وہ اس ٹھٹے سے باتیں کرنے لگی گویا اس نے اپنی عمر اسی دھندے میں گزاری ہے۔ اس کی لنترائی کتنی مضحکہ خیز تھی۔ چائے کے ساتھ اس نے ہمیں جو کیک دیا اسے توڑنے کے لیے بھیڑیے کے دانتوں کی ضرورت تھی اور

دہی پر گرد کی موٹی سی تہ چڑھی ہوئی تھی۔

عرصے تک حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور تیری پیدائش کے دن سربر آگئے۔ تاہم بڑے میاں کی زبان پر ٹانکا لگا رہا — ہمارا مڈھا اپنی ہٹ کا پکا ہر! میں چھپ کر انھیں دیکھنے جاتی تھی اور بڑے میاں یہ راز بھانپ گئے تھے مگر ایسے بن گئے گویا کچھ پتا ہی نہیں۔ گھر بھر کو درشکا کا نام لینے کی ممانعت تھی، اس وجہ سے بھول کر بھی اس کا ذکر نہ آتا تھا۔ میں بھی پتی جاتی تھی لیکن یہ خوب جانتی تھی کہ آخر باپ کا دل موم کا ہوتا ہے۔ سو ایک دن یہ بند ٹوٹ ہی گیا۔ رات کا وقت اور برف کا طوفان — بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھڑکی کے پاس ریچھ دھاڑ رہے ہیں۔ چمنی کے اندر ہوا پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ مختصر یہ کہ قیامت کا سماں تھا۔ ہم دونوں پلنگ پر تھے لیکن آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

میں نے یوں سلسلہ چھیڑا! ایسی رات غریبوں کے لیے کیسی مصیبت ناک ہوتی ہے۔ اور ان سے زیادہ ان کی مصیبت ہے جن کے دلوں میں سکون نہیں!

بڑے میاں نے بک بیک پوچھا: ان کا کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے؟  
”تم کن کی خیریت پوچھ رہے ہو؟ اپنی بیٹی ورشکا اور داماد میکسم کی؟“

”تھیں اس کا گمان کیسے ہوا؟“

”بڑے میاں، بس لہجی کرو۔ کب تک یوں چشم پوشی کرتے رہو گے۔“

اس میں تمہیں کیا مزہ ملتا ہے؟“

سانس کھینچ کر وہ بولے: ”ہاں رسی چڑیل۔۔۔ اری ڈھقو! ڈھقو!“

گھڑی بھر بعد پوچھنے لگے: سب کہتے ہیں کہ وہ ربیعہ میکم) نرا بے وقوف ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

میں نے جواب دیا: ”بے وقوف وہ ہے جو خود کام نہیں کرتا اور دوسروں کا دست نگر رہتا ہے۔ مثلاً اپنے مائیکل اور جاکوف۔ ان سے بڑھ کر بدھو اور کہاں ملیں گے۔ اس گھر کا پالمن بار کون ہے؟ کون سب کو روٹی دیتا ہے؟ تم! ان سے تو تمہارا ہاتھ بھی نہیں بنایا جاتا۔“

یہ سن کر بڑے میاں نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی — گدھی ہے اجاہل ہے، غرض کہ اناپ ثنا پ سب سنا ڈالی۔ میں دم سادھے پڑی رہی۔

”جس آدمی کے آگے سچے کی کسی کو خبر نہ ہو، اس کی تعریف تم کیوں کرتی ہو۔“

جب وہ بولتے بولتے تھک گئے تو میں یوں مخاطب ہوئی: ”تمہیں خود جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہ کیسی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔“

اس پر بڑے میاں بولے: ”وہ اس عزت کے مستحق نہیں۔“

انہیں خود یہاں آنا چاہیے۔“

یہ سنتے ہی خوشی کے مارے میں رونے لگی۔ اور بڑے میاں میرے بال چھوڑ کر رانہیں میرے بالوں سے کھیلنے میں مزا ملتا تھا)

بڑا بڑا لگے : ”باگل کہیں کی کیا میرے سینے میں دل نہیں ہو؟“  
 سچ جانو کہ طبیعتاً وہ بڑے نیک تھے۔ لیکن جیسے ہی انھیں  
 یہ محسوس ہوتا تھا کہ دنیا بھر میں سب سے دانا فرزند ہیں کہ  
 ان کا دماغ پھر جاتا تھا اور وہ حاسد اور اجڑ بن جاتے تھے۔

تب کہیں ایک تیوہار کے دن تیرے ماں باپ ہمارے گھر  
 آئے۔ دونوں خوب بنے ٹھٹھے ہوئے تھے۔ میکیم تیرے نانا کے  
 آگے کھڑا تھا اور ان کے ہاتھ اس کے کاندھے پر تھے۔ اس نے کہا۔  
 ”قبلہ آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ میں جہیز طلب کرنے آیا ہوں۔  
 میں تو فقط اپنی بیوی کے باپ کو سلام کرنے آیا ہوں۔“  
 یہ جملہ بڑے میاں کو بہت پسند آیا، انھوں نے زور کا قہقہہ  
 لگایا۔

”ابے لڑا کے — ڈاکو کہیں کے! — خیر، ایک مرتبہ  
 درگزر کرتا ہوں۔ تم دونوں ہمارے ساتھ آ رہو۔“  
 میکیم کے ماتھے پر بل آئے : ”یہ ورثہ کی مرضی پر منحصر  
 ہے۔ میرے لیے تو سب برا برابر ہے۔“

اصل داستان مکمل اب شروع ہوئی۔ سسر اور داماد  
 ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے۔ کسی طرح ان کے دل نہ ملتے تھے۔  
 میں اکثر میکیم کو آنکھیں دکھاتی اور میز کی آڑ میں چٹکی لیتی  
 لیکن اس سے کچھ نہ بنتا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اڑا رہتا اور اس  
 سے مس نہ ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں بلا کی خوبصورت بہت  
 شفاف اور روشن تھیں۔ بھویں کالی تھیں اور وہ جب انھیں

سکیڑ لینا تو آنکھیں اندر چھپ جاتیں اور چہرے پر سرکشی اور سختی آجاتی تھی۔ میرے سوا وہ کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ میں اپنی سگی اولاد سے زیادہ اسے چاہتی تھی۔ وہ بھی یہ جانتا تھا اور مجھے مانتا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے جھٹ جاتا اور سارے کمرے میں مجھے ہلا ڈلا کر کہنے لگتا: دھرتی ماتا کی طرح تم بھی میری ماں ہو۔ ورثکا سے زیادہ تم سے مجھے محبت ہو۔ اور تیری ماں (جب وہ خوش ہوتی تو بڑی نٹ کھٹ بن جاتی) اس سے اُجھ جاتی: شریر کہیں کے، تو نے یہ کیا کہا! پھر تو ہم تینوں خوب اودھم چوکر لی جچاتے تھے۔ آہ وہ دن بھی کیسے سکھ چین کے تھے۔ ناچ میں اسے کمال حاصل تھا۔ اور اسے کیسے اچھے اچھے گیت یاد تھے۔ یہ گیت اس نے اندھوں سے سیکھے تھے۔ کیونکہ اندھوں سے بہتر گویے کہیں نہیں ملتے۔

باغ والی بنکلیا انھیں رہنے کو دی گئی۔ اور وہیں تو بھری دوپہر یا میں پیدا ہوا۔ تیرا باپ کھانا کھانے گھر آیا تو تو اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا اور اس نے تیری ماں کو دن کر ڈالا۔ اس بے خبر کو اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ بچہ جننا کیسی ٹیڑھی کھیر ہو۔ مجھے کاندھے پر لاد کر وہ آنگن پار کر گیا اور بڑے میاں کو تو اسے کی پیدائش کی خوش خبری جاسنائی۔ انھوں نے مہنس کر کہا: ”اے میکسم، تو تو جن ہو جن!“

لیکن وہ تیرے ماموؤں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

وہ شراب نہ پیتا تھا اور بڑا زبان دراز تھا۔ اسے ہر قسم کے شعبدے آتے تھے — اور یہ اسے ہنگے پڑتے تھے۔ مثلاً، ایک روز جب تیز ہوا چل رہی تھی، ایک بیک سارا مکان دہشت ناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ ہم سب بھوپکے رہ گئے یہ کیا مصیبت آئی؟ بڑے میاں بھی سہم گئے اور گھر بھر میں چراغاں کرنے کا حکم دے کر بیچ پڑے؛ ہم سب کو بیک زبان دعا پڑھنی چاہیے۔“

مگر اسی وقت وہ شور مچم گیا — اب تو ہمارا ہراس دوچند ہو گیا۔ مگر جاکوٹ کی سمجھ میں یہ معصوم آگیا۔ یہ میکم کی کرتوت معلوم ہوتی ہو! بعد ازاں میکم نے خود ہی قبول کیا کہ اس نے درجنوں بوتلیں اور برتن کھڑکی سے لٹکا دیے تھے اور ہوا ان کے اندر سننا کر یہ آواز پیدا کر رہی تھی۔ نانا نے جھلا کر کہا: ”یہی رفتار رہی تو ایک نہ ایک زور تو ضرور سائیبریا کی ہوا کھائے گا۔“

ایک سال غضب کا پالا پڑا اور بھیڑیوں کے غول شہر میں گھس آئے۔ انھوں نے کتوں کو پھاڑ ڈالا۔ متوالے چوکیداروں کو کھا ڈالا اور شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ مگر تیرے باپ نے بندوق اٹھائی اور دو بھیڑیوں کو بھون ڈالا۔ ان کی کھال اتار کر اس نے ان کا سر صاف کیا اور کالج کی آنکھیں بٹھائیں — بھی انھیں بہروپ پہنایا۔ مائیکل کسی کام سے غلام گردش میں گیا اور اگلے پاؤں اس بد حالی میں لوٹا کہ روٹ گئے

کھڑے تھے، آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں، گھٹکی بندھ گئی تھی، شکل تمام اس نے کہا: ”بیٹریا!“ پھر تو جس کے ہاتھ جو اوزار پڑا وہ لیے ہوئے قندیل کے ساتھ غلام گردش کی طرف لپکا۔ واقعی ایک بھڑیے کا سر اندر جھانک رہا تھا۔ اسے خوب ٹھونکا۔ گولیاں چلائیں — اور جانتے ہو یہ کیا تھا۔ غور سے دیکھا تو یہ بھس بھری کھال تھی اور اس کے پنجے تختے میں ٹھونک دیے گئے تھے۔ اس مرتبہ بڑے میاں میکم سے سخت خفا ہوئے۔

بھلا جاکوف ان شرارتوں میں کیسے شامل نہ ہوتا۔ میکم دفعتی کا سر کاٹ کر اس پر منہ آنکھ بناتا اور بال کی جگہ سن کی جٹا چپکا دیتا۔ دونوں سالے بہنوی اسے لیے ہوئے سڑک پر جاتے اور کسی کھڑکی کے اندر یہ مہیب شکل ڈال دیتے ڈر کے مارے لوگوں کا دم ٹکل جاتا اور وہ چنچ کر بھاگ جاتے۔ دوسری مرتبہ یہ لوگ سرتاپا چادروں میں لپٹے ہوئے پادری کے گھر لکھس گئے اور وہ ڈر کر سنتری گاہ میں جا چھپا۔ اور سنتری بھی ایسا گھبرایا کہ پولیس کو بلا لایا۔ غرض یہ دونوں نڈر نت نئے کھیل کھیلتے اور کوئی ان کا ہاتھ نہ روک سکتا تھا۔ میں نے اور ورشکا نے انھیں بہت منع کیا مگر وہ کب کسی کی سنتے تھے۔ میکم تو ہماری بات پر ہنس دیا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ لوگوں کو ذرا سے مذاق پر سراسیمہ ہو کر گرتے بھاگتے ہوئے دیکھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ذرا چل کر انھیں تسلی تو دینیجی!

یہ سب کیا دھرا اس کے سر پڑا اور وہ مرتے مرتے بچا۔



مائیکل نے جو ایک ہی بدخو اور کینہ جو تھا ، تیرے باپ کو مارنے کی سازش کی ۔ سرما کا آغاز تھا اور یہ تینوں ایک پادری کے ساتھ — جو بعد میں ایک کو چپان کے قتل کے شبہ میں برطرف کر دیا گیا — کسی دوست کے گھر سے واپس آرہے تھے ۔ ان لوگوں نے بیچ راہ میں بہانہ کیا کہ آؤ بیاؤلی کی طرف سے چلیں اور وہاں اسکیٹنگ کریں ۔ برف پر بچوں کی طرح پھلتے پھلتے انھوں نے میکسم کو برف کے ایک گرٹھے میں دھکیں دیا — مگر میں یہ واقعہ تجھے سنا چکی ہوں ۔

”تانی جان ، میرے ماموں اتنے بُرے کیوں ہیں ؟“

نانی نے ناس سونگھ کر دل جمعی سے جواب دیا : برے تو نہیں البتہ وہ بے وقوف ضرور ہیں ۔ مائیکل نا سمجھ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی کانیاں ہر ، مگر جاکوٹ فی الجہ نیک دل ہو ۔ خیر جب انھوں نے میکسم کو گرٹھے میں دھکیلا تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے برف کے تودے کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ لیا ۔ ان ظالموں نے اس کی کلائیوں کو جوتے کے تلوں سے ایسا کچلا کہ اس کی انگلیاں چور چور ہو گئیں ۔ خدا کی کرنی کہ اور سب تو متوالے تھے لیکن اس کے حواس درست تھے ۔ جوں توں کر کے اس نے اپنا دھڑ برف کے بار سے نکالا اور گرٹھے کے بیچ میں سر اٹھائے ٹھہرا رہا تاکہ سانس تو لے سکے ۔ جب یہ جلا د کسی طرح اسے گرفت میں نہ لاسکے تو اُسے گلے گلے برف میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر بے نیل مرام اپنی راہ سدھارے ۔ میکسم باہر

نکل کر کوتوالی کی طرف بھاگا — وہی جو بازار کے قریب ہو۔  
 کوتوال اسے اور ہمارے گھرانے کو خوب پہچانتا تھا۔ سو اس نے  
 سوال کیا: ”یہ کیا ماجرا ہو؟“

نانی نے صلیب کا نشان بنا کر تشکر آمیز لہجہ میں کہا:  
 ”خدا بخشنے، میکسم کن کن خوبوں کا آدمی تھا۔ پولیس کے آگے  
 جو وہ زبان پر حرف شکایت لایا کبھی ہو۔ جواب دیا کہ یہ میری غلطی تھی۔  
 نشہ کے جھونکے میں میں بادلی کی طرف جا پہنچا اور برف کے گڑھے  
 میں گر گیا۔ کوتوال اس بھلائے میں نہ آیا: یہ صریح جھوٹ ہو  
 کیونکہ تم نے شراب نہیں پی ہو۔“

قصہ کوتاہ یہ کہ انھوں نے برانڈی سے میکسم کے جسم  
 کی مالش کی، اسے سوکھے کپڑے پہنائے اور کبل میں پیٹ کر  
 گھر لائے۔ کوتوال صاحب بنفس نفیس ساتھ آئے۔ مائیکل اور  
 جاگوں ہنوز نہ لوٹے تھے۔ جن منانے کے لیے وہ کسی میکس  
 میں ڈٹے ہوئے تھے۔ میں اور تیری ماں میکسم کو دیکھتی کے  
 دیکھتی رہ گئیں۔ اس گھمڑی وہ قطعاً بدل گیا تھا۔ چہرہ زرد  
 انگلیاں لہو لہان اور ان پر خون جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ بالوں  
 کی لٹوں میں برف کی پٹری جو اب تک نہ پگھلی تھی۔ اور چہرے پر  
 مردنی چھا گئی تھی۔

ورثہ کا جین پڑی ”ان کم عتوں نے تمہاری کیا گت بنا دی ہو؟“

اب جا کر کوتوال پر اصل بھید کھلا اور اس نے اپنی جرح شروع  
 کی۔ میں دل میں بھانپ گئی کہ معاملہ سنگین ہو۔ ورثہ کو کوتوال

کے پیچھے لگا کر میں نے چپکے چپکے میکسم سے پوچھا کہ آخر یہ کیا معنہ ہو اس نے میرے کان میں کہا: سب سے پہلے مائیکل اور جاکوف کی تاک میں رہو۔ انھیں اپنے بیان میں یہ کہنا ہو کہ بادی کے ٹکڑے پر وہ مجھے چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تھے۔ زیادہ گورکھ دھندا مچایا تو پھر پولیس کے ہاتھوں ہلکان ہونا پڑے گا۔

میں نے بڑے میاں سے کہا: ”تم کو تو ال کو باتوں میں لگاؤ۔ میں ان ناہنجار بیٹوں کو سنا آؤں کہ گھر پر کیا ستم ٹوٹا ہو۔ کپڑے بدلتے ہوئے وہ کانپنے اور بڑبڑانے لگے: میں جانتا تھا کہ یہ ہوگا! مجھے اسی کا اندیشہ تھا!

یہ تو خیر ان کی باتیں تھیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ اپنے بیٹوں کو دیکھتے ہی میں نے ہتیلی سے اپنا منہ چھپا لیا۔ مارے ہراس کے میاں مائیکل کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اد وہ لونڈا جاکوف گھٹکیا نے لگا: ”قسم لے لےجیہ جو مجھے کچھ بھی معلوم ہو۔ یہ مائیکل کے کرتوت ہیں۔ وہی ہم سب میں سیانے تھے۔ ہر حال ہم نے کو تو ال کو پرچا لیا۔ وہ بھلا مانس تھا۔ چلتے چلتے وہ یہ تاکید کر گیا: آئندہ کے لیے تمہارے کان ہو جائیں، اگر تمہارے گھر میں کوئی فوجداری ہوئی، تو مجرم کا نام میں ابھی بتا سکتا ہوں۔“

بڑے میاں میکسم کے پاس جا کر بولے: خدا تمہیں اس کا اجر دے! تمہاری جگہ اور کوئی ہوتا تو ہرگز یہ شرافت نہ برتتا۔ اور بیٹی آفریں ہو تجھ پر کہ ایسے فرشتہ صفت انسان کو ہمارے

خاندان میں لائی۔ جب وہ سوج میں ہوتے تو ایسے ہی میٹھے بول بولتے تھے۔ مگر جب وہ حماقت پر اتر آتے تھے تو ان کے دل پر گویا بھاری سی سل لد جاتی تھی۔

جب ہم تینوں اکیلے رہ گئے تو میکسم بلک بلک کر رونے لگا۔ انھوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟۔ ماما۔۔۔۔۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟۔ وہ مجھے مشکا نہیں بلکہ بچوں کی طرح ماما کہا کرتا تھا۔۔۔۔۔ اور حقیقتاً اس میں بچپن کا بھولا پن تھا۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ وہ یہی سوال کرتا رہا۔

میں رونے لگی۔۔۔۔۔ اور اس کے سوا میرے بس میں کیا تھا۔ اپنے بیٹوں کی وجہ سے میں کتنی نادم تھی۔ تیری ماں نے کڑی کے سارے بٹن توڑ ڈالے۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ کر آئی ہو۔ وہ سنوآ تر ہی کہے جاتی تھی: میکسم ہم اس گھر میں ایک بن نہ رہیں گے۔ یہ بھائی ہمارے خون کے پیا سے ہیں۔ میں ان سے ڈرتی رہتی ہوں۔ اب اس گھر میں ہمارا گزر نہیں۔ اسے چپ کرنے کو میں بولی: ارے جلتی آگ میں تیل کیوں چھسٹکتی ہے۔ گھریوں ہی دھنوں سے بھرا ہوا ہو۔

بڑے میاں کی کھوپڑی تو اوندھی رہتی ہی ہے۔ آپ نے اسی گھر ہی ان دونوں موزیوں کو گناہ بخشانے کے لیے بھیجا۔ ورشکا تو مائیکل پر ٹوٹ پڑی اور اس کے منہ پر دو ہنڈر رسید

کر دیا :- یہ ہر تھاری معافی ! تیرے باپ نے کہا : 'بھائی' تمہیں اس کا حیاؤ کیسے ہوا ؟ میرے ہاتھ توڑنے میں تم نے کیا کسر رکھی تھی ۔ ٹولانجا ہو کر میں ساری عمر کے لیے بے کار ہو جاتا !

بہر کیف ان دونوں میں میل ہو گیا ۔ تیرا باپ یوں پہلے ہی سے ناساز تھا ۔ چنانچہ سات ہفتے وہ مچھلی کی طرح بستر پر تڑپتا رہا ۔ اس کی زبان پر ایک ہی ورد تھا : ماما، اس جگہ سے میں اکتا گیا ہوں ، چلو کسی دوسری نگری کو آباد کریں ۔

کچھ عرصے بعد اُسے استراخاں میں کچھ کام مل گیا ۔ گرمیوں میں وہاں بادشاہ کی سواری آنے والی تھی ۔ اس سلسلہ میں میکسم کو ایک آرائشی محراب بنانے کا حکم ہوا ۔ وہ دونوں پہلی کشتی سے روانہ ہو گئے ۔ ان کی جدائی کا غم میرے لیے سوہاں روح تھا ۔ میکسم کو بھی اس کا قلق تھا ۔ اور وہ یہی ضد کیے جاتا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلی چلو ۔ لیکن ورشکا کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا اور وہ بے دھڑک اس کا اظہار کر رہی تھی ۔ چڑیل کہیں کی ! یہ ان کی الوداع تھی .... "

شراب کا ایک گھونٹ پی کر اور ناس کی ایک چٹکی سونگھ کر نانی نے کھڑکی سے نیلے آسمان کو تاکتے ہوئے کہا :

"گو مجھ میں اور میکسم میں خون کا رشتہ نہ تھا لیکن ہم دونوں کی ارواح ہم آہنگ تھیں ۔"

اس داستان کے دوران میں گاہ گاہ نانا جان ادھر آنکلتے تھے اور اپنی تیز ناک سے ہوا کو سونگھ کر شبہ آمیز انداز سے

نانی کی باتیں سنتے اور کہہ اٹھتے :

”یہ جھوٹ ہے ! یہ غلط ہے !“

اور پھر یک بیک پوچھ بیٹھتے : ’الکسی ! کیا یہ برانڈی پنی رہی تھی ؟‘

’جی نہیں !‘

ابے مکار میں نے اپنی آنکھوں سے ابھی ابھی دیکھا ہے !

یہ کہہ کر اسی حیس و بیص کے عالم میں وہ چل دیتے -

بیٹھ پھرتے ہی نانی ان کی طرف آنکھ مار کر کوئی کہاوت

سناتی : لال بھکڑ جانا ہے تو جا مگر گھوڑوں کو نہ بھڑکانا ! -

ایک روز کمرے کے فرش پر ٹکلی لگائے ہوئے نانائے نرمی سے

کہا : ’بڑی بی !‘

’جی ؟‘

’دیکھتی ہو کیا ہو رہا ہے ؟‘

’ہاں، بہت اچھی طرح !‘

’اُس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے ؟‘

’بیاباہ رچے گا اور کیا - یاد ہے کہ تم کس شوق سے کسی شریف

زادے کا ذکر کیا کرتے تھے ؟‘

’خوب یاد ہے !‘

’اب تو تمہاری مراد برآئی ؟‘

’لیکن یہ تو نرا کنگال ہے !‘

’یہ ورشکا کی پسند ہے !‘

جب نانا باہر چلا گیا تو میں نے بے قرار ہو کر پوچھا:  
”یہ کس کا ذکر ہو رہا تھا؟“

نانی نے میرے تلوے سہلا کر جھڑک دیا: ”ارے تجھ میں اتنی اُدھیڑ بن کیوں ہو؟ اگر ایسی عمر میں تو سب کچھ سیکھ لے گا تو بڑھاپے کے لیے کیا رہ جائے گا۔“ ہنستے ہوئے وہ اپنا سر ہلانے لگی۔

”واہ جی بڑے میاں! خدا کی نظر میں تم خاک کے پتلے سے زیادہ کیا حقیقت رکھتے ہو۔ بیٹے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ ہم بالکل دیوالیے ہو گئے۔ انھوں نے کسی نہتو خیرے کو اپنی جمع پونجی قرض میں دی اور اس نے ٹاٹ الٹ دیا۔“

سکراتے ہوئے نانی کسی خیال میں غرق ہو گئی اور دیر تک گم سم بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے بادل چھا گئے۔

”تم کس سوچ میں ہو؟“

اس نے چونک کر جواب دیا: میں سوچ رہی تھی کہ تجھے کون سا قصہ سناؤں؟۔ پادری یوستینا کی کہانی تجھے پسند ہے؟۔ اچھا تو سن:

|                       |                              |
|-----------------------|------------------------------|
| ایک تھے پادری یوستینا | چھوٹے سے اور موٹے سے         |
| چھب زباں اور شیخی مار | سارے زمانہ کے لقمان          |
| بین میخ میں پائیں مزا | ”وہ ہی بُرا اور یہ ہی بُرا!“ |
| یہ گر جا ہی چھوٹا سا  | یہ رستہ ہی ٹیڑھا سا          |
| سیب ہی کیسا پیلا سا   | سوکھا سا اور ہچکا سا         |

مجھ سے گر کوئی لبوں صلاح      ہرگز ہو وے نہ وہ گمراہ  
 دنیا میں ہوں میں ہی ایک      یہ تھی اس مرغ کی ٹیک  
 ایک رات کچھ بھوت پریت      ان کے گھر میں گھس آئے  
 ”خیر تو ہر اے مولانا      کرا ہر کیوں ٹھنڈا سا  
 دوزخ میں ہر آگ بھری      وہاں کہاں ایسی سردی  
 چلیے وہاں کی سیر کریں      پادری صاحب آگے بڑھیں۔  
 دوزخ میں یہ بڑے میاں      تپا کیے اور جلا کیے  
 ہر جب پوچھا کسی نے کیوں      آپ کے ہیں اب کیسے مزاج  
 اینٹھ کے بولا یہ گمراہ —      اتنی آگ اور اتنا دھنواں!

جہنمی کا پر نام نہیں      ہر یہ کیا اوجھڑ پن!!!  
 قصہ ختم کرتے وقت اس کی آواز سست اور نحیف پڑ گئی  
 اور لہجہ بدل گیا۔ زیر لب مہنتی ہوئی وہ بولی: ”اس یوستینا کے  
 مرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی اور بڑے میاں کی طرح وہ اپنی ہی  
 ٹیک پر اڑا رہتا تھا۔۔۔۔۔ خیر بہت ہوا بجا سونے کا وقت ہو گیا۔“  
 اماں شانہ و تادر مجھے دیکھنے کو آتی تھی اور یہ بھی پسند  
 ساعت کے لیے۔ وہ ایسی ہڑبڑا ہٹ سے بولتی تھی گویا جلدی  
 میں ہو۔ اس کا رنگ روپ روز بروز کھلتا جاتا تھا۔ اور اس  
 کے لباس کی شان بھی دو بالا ہوتی جاتی تھی۔ لیکن مجھے محسوس  
 ہونے لگا کہ اس میں اور نانی میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ میں سمجھ  
 گیا کہ مجھ سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے — اور میں اسی کی  
 کرید میں رہنے لگا۔



اب نانی کی کہانیوں میں مجھے وہ لطف نہ آتا تھا — حتیٰ کہ اپنے بابا کے واقعات بھی میرے لیے کچھ غیر دلچسپ ہو گئے۔ ان سے اس روز افزوں جذبہ ہراس کو تسکین نہ ملتی تھی جو قطعاً ناقابل فہم تھا۔ نانی سے میں نے پوچھا : ”ابا کی روح بے چین کیوں رہتی ہے؟“ آنکھیں بند کر کے وہ بولی : میں کیا جانوں ؟ - یہ خدا کا معاملہ ہے۔۔۔ سرحدِ ادراک سے پرے۔۔۔ یہ راز ہم سے پوشیدہ ہے۔“ راتوں کو جب میری بے خواب آنکھیں ان ستاروں کو دیکھتیں جو آسمان میں چہل قدمی کرتے ہوتے تھے تو میرے دل میں آپ ہی آپ یہ غم انگیز وسوسہ اٹھتا کہ اُس دنیا میں میرا باپ تنہا آوارہ گردی کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے اور ایک کتا اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔

---

## باب ۱۲

ایک مرتبہ دن کے تیسرے پہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو یکایک محسوس ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں بھی جاگ گئی ہیں۔ جب انھیں باہر نکالا تو وہ پھر سُن ہو گئیں۔ تاہم یہ واقعہ تھا کہ اب وہ اچھی ہو گئی تھیں اور میں چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ یہ ایسی خوش خبری تھی کہ میں مسرت کے مارے چنچ اُٹھا اور فرش پر پیروں کے بل کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو میں گر گیا مگر گھٹنوں کے بل دروازے سے ہو کر سیڑھیاں اتر گیا اور سوچتا رہا کہ مجھے دیکھ کر ہر سیڑھی کو کیسی حیرت ہو گی۔

یاد نہیں پڑتا کہ گھٹتے ہوئے میں کیوں کر اپنی ماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں کئی اجنبی موجود تھے اور ان میں ایک سوکھی ساکھی سبز پوش بڑھیا نے کرخت آواز میں کہا:

”بھل کا عرق پلا کر اس کا سر ڈھک دو۔“

وہ سرماتا پاز سبز تھی۔ اس کی پوشاک، ٹوپی اور چہرہ تک ہرا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے متھے تھے اور ان متوں کے رونیں تک گھاس کی طرح ہرے تھے۔ نچلا ہونٹ چبا کر اور بالائی ہونٹ اوپر اٹھا کر اس نے اپنے سبز دانتوں سے مجھے گھورا اور سیاہ

دستانوں سے آنکھیں ڈھک لیں ۔

سہم کر میں نے پوچھا : ”یہ کون ہے؟“

نانا نے خشک آواز میں کہا : ”یہ تیری دوسری نانی ہیں ۔“  
اماں ہنستی ہوئی یوجن میکسوف کو میرے قریب لائی ۔

”اور یہ تمہارے ابا ہیں!“

اس نے تیزی سے کچھ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا اور یوجن نے  
اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں میری طرف جھکا کر کہا :

”میں تمہیں انعام میں کچھ تصویریں دوں گا۔“

کمر روشنی کے مارے جگمگا رہا تھا ۔ میز پر کئی شمع دان صوفشاں  
تھے اور ان کے بیچ میں نانا کا ایک محبوب شہ نشین رکھا ہوا تھا ۔

اس میں بڑے ہوئے موتی رہ رہ کر جھلجھلا اٹھتے اور مورت کا زرب  
تاج دمک اٹھتا ۔ گلگلوں کے سے بھرے بھرے گول مٹول چہرے  
باہر سے کھڑکی کے شیشے کے پاس آتے اور ان کی ناکیں اس پر  
چورس ہو جاتیں ۔ میری آنکھوں کے آگے ہر چیز ناچنے لگی ۔ اس  
ہری بھری بڑھیا نے اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے میرے کانوں کو چھو کر کہا :  
”بیشک ! بیشک !“

”وہ بیہوش ہو رہا ہے!“ یہ کہہ کر نانی مجھے گود میں لیے ہوئے  
دروازے کی طرف چلی ۔

لیکن میرے ہوش سلامت تھے ۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں اور  
جب وہ جوں توں کر کے مجھے سیڑھی کے اوپر لے آئی تو میں نے  
پوچھا : ”مجھ سے یہ بات چھپانے کی وجہ؟“

”بس بھی کر۔۔۔۔۔ چپ رہتا ہو یا نہیں!“

”تم سب دھوکے باز ہو۔۔۔۔۔ سب کے سب۔“

مجھے پلنگ پر لٹا کر تانی نے تکیہ میں منہ چھپا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا:

”تو روتا کیوں نہیں“

میراجی رونے کو نہ چاہا۔ ہماری کوٹھڑی میں شفق کا اُجالا آ رہا تھا۔ خاصی سردی تھی۔ میں کانپ اٹھا اور پلنگ چرچرانے لگا۔ اُس بڑھیا سبز پری کی مورت میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی۔ میں نے جھوٹ موٹ آنکھیں نیچ لیں تو تانی چلی گئی۔

کئی خالی ازدواجیات دن کسی پھلے جھرنے کی مانند گزر گئے۔ شادی کے بعد اماں کہیں چلی گئی تھی اور گھر بھر میں اُٹو کا عالم تھا۔ ایک روز نانا چھینی لیے ہوئے آیا اور کوٹھڑی کی کھڑکی کے آس پاس کی سینٹ اُکھاڑنے لگا۔ جب تانی پانی کا تسلا اور جھاڑن لیے ہوئے آئی تو نانا نے آہستہ سے پوچھا:

”بڑی بی اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہو؟“

”میری سمجھ میں تمہاری بات نہ آئی۔“

”تم اب بھی خوش ہو یا نہیں؟“

تانی نے وہی جلد دُہرایا جو اس نے میٹرھی پر مجھ سے کہا تھا:

”بس بھی کرو!“

ان سیدھے سادے الفاظ میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ تھا۔

اور میں سمجھ گیا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور غم انگیز واقعہ کو چھپا رہے ہیں، جسے سب جانتے ہیں مگر کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

کھڑکی کے چوکھٹے کو لیے ہوئے نانا باہر چلا گیا اور نانی ہوا خوری کرنے لگی۔ باغ میں چنڈول گا رہا تھا، گوریاں چھپا رہی تھیں اور بھیگی ہوئی زمین کی محمور کن خوشبو کمرے میں سما رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ تندور کی نیلی اینٹیں حیرانی سے زرد پڑ گئی ہیں۔ ان پر نظر گڑانا گویا جاڑے کو پاس بلانا تھا۔ میں تو پلنگ سے فرش پر اتر آیا۔

نانی نے آواز لگائی: ”تو ننکے پاؤں اتر کر تو دیکھ!“

”میں باغ ہی میں تو جا رہا ہوں۔“

”وہ بھی نرا سیلا پڑا ہے۔ زرا ٹھہر جا۔“

لیکن میں نے اس کے کہے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بڑی عمر کے لوگوں سے مجھے کچھ جڑ سی ہو گئی تھی۔ باغ میں دوب کی ہری بھری کوئیل سر نکال رہی تھی۔ سیب کے پیڑوں میں اکھوے بھوٹ رہے تھے۔ ’پرونا‘ کے بھونپڑے کی چھت پر جمی ہوئی کائی بہت لمبا رہی تھی۔ چاروں طرف پرندوں کا زمزمہ تھا اور تازی تازی مداتی ہوا ایک عجیب خوشگوار کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ اس کھائی کے پاس جہاں چچا پیٹرس نے جام شہات پیا تھا، لبنی لبنی گھاس لہلہا رہی تھی۔ اس کا رنگ سرخ تھا اور وہ پگھلی ہوئی برف سے گتھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھائی کیونکہ یہ بہار کا رنگ نہ تھا۔ سیاہ چمنی اُداس

انداز میں تنی کھڑی تھی اور یہ پوری کھائی میرے لیے آشوب چشم بن گئی تھی۔ میرا دل غصے کے مارے میں اٹھا کہ اس بھٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں اور یہ سارا کوڑا کرکٹ صاف کر کے اپنے لیے گڑھے میں ایک صاف ستھری جھونپڑی بناؤں اور بڑے بوڑھوں سے الگ تھلگ گرمیوں بھر اسی میں رہوں۔

یہ خیال اٹھتے ہی میں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ اور اس مصروفیت سے گھر کے معاملات سے میرا دھیان بٹ گیا۔ اب میں اسی ادھیڑ بن میں رہنے لگا اور گو کہ پریشانی کے مختلف اسباب پیدا ہوا کیے لیکن ان کی اہمیت دن بدن کم ہونے لگی۔

نانی اور اماں پوچھا کرتیں: تو کس بات پر ڈٹھا ہوا ہے؟

اس کا جواب کٹھن تھا۔ کیونکہ میں ان سے خفا نہ تھا — بلکہ گھر کا ہر آدمی اب مجھے اجنبی نظر آتا تھا۔ کھانا کھانے کا وقت ہو یا چائے کا — وہ بوڑھی سبزر پری اکثر آدھکتی تھی۔ وہ کسی باڑی کی سٹری ہوئی ٹھہنی معلوم ہونے لگی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں غیر مرئی دھاگے سے چہرے پر ٹانک دی گئی ہیں جب وہ انھیں تیزی سے دائیں بائیں گھما کر ہر شے کا جائزہ لینے لگتی۔ خدا کے ذکر کے وقت انھیں اوپر اٹھانی اور گھر بار کے تذکرے کے موقعہ پر انھیں ناک سے بھڑا لیتی —

تو ڈر لگتا کہ اس کے دیدے اپنے خانوں سے لڑھک نہ پڑیں۔ اس نے بھویں بھی ایسی پائی تھیں گویا کاٹ کر گوند سے چپکا دی گئی ہوں مضحکہ خیز انداز سے کہنی موڑ کر اور آخری انگلی اٹھا کر وہ منہ میں جو

کچھ ٹھونس لیتی اسے وہ آگے نکلا ہوا دانت خاموشی سے چبایا کرتا۔ اس اثنا میں اس کی کپٹی کسی گیند کی طرح اچھلنے لگتی، چہرے کے سبز روئیں یوں حرکت کرنے لگتے گویا اس کی کمریہ صاف ستھری جھڑی دار جلد پر رینگ رہے ہوں۔

وہ اپنے بیٹے کی طرح اتنی صاف شفاف تھی— کہ اس کے پاس جاتے گھن آتی تھی۔ پہلے ہی دن جب اس نے اپنا مُردار ہاتھ میرے ہونٹوں سے لگایا تو اس سے صابن اور ابُن کی ایسی تیز مہک آئی کہ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ اکثر اپنے بیٹے کو بتایا کرتی اس لڑکے کو تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ جانیا، سنا یا نہیں؟“

سر کی جنبش سے فرماں برداری جتا کر وہ ناک بھوس پڑھاتا اور چپ ہو جاتا تھا۔ اس ہری بڑھیا کے سامنے شخص کے ماتھے پر شکن رہتی تھی۔

اس بڑھیا اور اس کے بیٹے سے میں انتہا کی نفرت کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر میری گوشمالی ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ شب کے کھانے پر اس نے نہایت بیہودگی سے آنکھیں مٹا کر کہا:

”لڑکے، کھانے میں اتنی جلدی کیوں کرتا ہے؟ اور اتنی بُری بوٹیاں کیوں کاٹتا ہے۔ لاڈلے، لایہ لکڑا مجھے دے دے۔“

میں نے اپنے منہ کی بوٹی نکال کر کانٹے میں اٹکائی اور اس کی طرف بڑھا کر کہا: ”بیجیے— مگر کہیں منہ نہ جل جائے۔“

اماں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا۔ نانی بھی میرے پیچھے پیچھے آئی اور سنہی روکنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”خدا تجھ سے سمجھے رہے بندر!“

اس کی یہ ادا مجھے بالکل نہ بھائی اور میں بھاگ کر پھٹ پر چڑھ گیا اور دیر تک چپنی کے پاس بیٹھا رہا۔ بیشک میں گستاخ ہو کر ان سب کو سخت سُست سنانا چاہتا تھا۔ اس جذبہ کو دبانا مشکل تھا۔ تاہم اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

ایک دن میں نے ان ہونے والے ناتے داروں کی کرسیوں پر گوند کا وہ لپ لگایا کہ یہ دونوں چپکے کے چپکے رہ گئے۔ یہ تماشا از حد مضحکہ خیز تھا۔ جب نانا جان میری مرست کر چکے تو اماں میری کوٹھڑی میں آئی اور مجھے گود میں اٹھا کر کہا : ”ایک بات سنو!۔ آخر تم ایسے بد دماغ کیوں ہو گئے ہو؟ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھے اس کا کتنا صدمہ ہوا!“ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو ڈبڈبانے لگے اور وہ اپنا سر میرے گالوں سے ملنے لگی۔

اس سے میرے دل کو چوٹ لگی۔ کاش اس کی بجائے اس نے مجھے بھونکا ہوتا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہ اپنے آنسو پی لے تو میں آئندہ کبھی ان ماں بیٹوں پر منہ نہ آؤں گا۔

اس نے نرمی سے میری پیٹھ ٹھونکی: ”دیکھو، اب ڈھٹائی نہ برتنا۔ بہت جلدی ہماری شادی ہونے والی ہے جس کے بعد ہم ماسکو چلے جائیں گے۔ جب واپس لوٹیں تو تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ ’یوجین‘ بڑے بھلے مانس ہیں اور تم دونوں میں خوب نبھے گی۔ تم اسکول جانے لگو گے اور بعد ازاں کالج۔ ان کی طرح پھر تم ڈاکٹر



یا جو چاہو بن سکتے ہو۔ اپنے شعبے کا انتخاب تم خود ہی کرو گے۔  
اچھا، جاؤ، اب کھیلو۔

’بند ازاں‘ اور ’پھر‘ کی اس بھرمار پر مجھے کسی سیڑھی کا  
گمان ہوتا تھا جو اماں سے دور کسی تنگ و تاریک مقام میں  
جا کر ختم ہوتی ہو۔ ایک ایسی سیڑھی جو مجھے پسند نہ تھی۔

میرا جی چاہا کہ اماں سے کہوں: ”آپ شادی وادی کے  
بھیلے میں نہ پڑیں۔ آپ کے لیے میں محنت مزدوری کرنے کو تیار  
ہوں۔“ مگر یہ الفاظ کبھی میری زبان تک نہ آئے۔ وہ ہمیشہ میرے  
دل میں محبت کے جذبات پیدا کرتی تھی گو میں ان کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔  
میں نے باغ میں جو ہم شروع کی تھی اس کی تکمیل ہونے لگی  
تھی۔ گھاس پھوس کو اکھاڑنے اور کاٹنے کے بعد میں نے خندق  
کے کنارے اینٹوں سے ایک چبوترا بنا ڈالا۔ یہ اتنا چوڑا تھا  
کہ اس پر میں لیٹ سکتا تھا۔ میں نے رنگین شیشے اور ٹوٹے  
ہوئے برتنوں کے ٹکڑے جمع کیے اور انھیں اینٹ کے جوڑوں  
کے بیچ میں بٹھایا۔ جب سورج کی کرنیں وہاں تک پہنچیں تو اس  
سے قوس قزح کی جھلک آتی جیسی کلیسا کی محرابوں میں ہوتی ہو۔

ایک روز ناتا نے میری کارگزاری کا معائنہ کر کے فرمایا: بھئی  
خوب سوچھی! مگر شیشے توڑنے اور گھاس کی جڑوں کو یوں چھوڑ  
دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی کدال دے تو میں اسے کھود کر  
ٹھیک کر دوں۔“

میں نے اپنی پسلی کدال اس کے حوالے کی۔ اس نے ہاتھوں کو

تھوک سے نرم کر کے بطخ کی سی آواز نکالی اور کدال کو پیر سے دبا کر مٹی میں دھنسا دیا۔

”بڑوں کو پھینک آ۔ پھر کبھی یہاں سورج کبھی کے پودے اور بیری کے پیڑ لگا دوں گا۔ تب تو یہ جگہ بڑی سہانی ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر کدال پر جھک کر وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی ذہن آنکھوں سے آنسو کی بزل بوند میں زمین پر ٹپک رہی تھیں۔

”نانا جان، یہ کیا ہو؟“

چونک کر اس نے ہتھیلی سے اپنا منہ پونچھا اور بے نور نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”میں پینے پینے ہو گیا تھا۔“ افوہ کتنے کوڑے ہیں!

اس نے دوبارہ کھودنا شروع کیا اور دم بھر بعد یکایک بول اٹھا۔ ”میرے بیٹے تو نے فضول یہ جتن کیا۔ میں اس مکان کو بیچنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ برسات سے پہلے اسے نکال ہی دینا ہو۔ تیری ماں کے جہیز کے لیے مجھے روپیوں کی ضرورت ہو اب سمجھا۔ خدا کرے کہ اسے خوشی نصیب ہو۔“

کدال پھینک کر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے وہ دھوبی گھر کی طرف چلا گیا جہاں اس کی آرام کرسی پڑی رہتی تھی۔ میں نے کھودنا شروع ہی کیا تھا کہ کدال میرے انگوٹھے پر آگری۔

اس سانحہ کی وجہ سے میں اماں کی شادی میں کلیسا نہ جا سکا۔ گھر کے دروازے سے میں نے دیکھا کہ وہ سر جھکائے ’میکسٹون‘

کی بانہہ تھامے ہوئے ہو۔ سبزہ زار اور فرش پر وہ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی گویا کانٹوں پر چل رہی ہو۔  
شادی نہایت خاموشی سے ختم ہو گئی۔ گر جاگھر سے لوٹ کر سب نے اداسی سے چائے پی اور اماں فوراً کپڑے بدلنے اور سامان باندھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا سوتیلا باپ قریب آ بیٹھا اور کہنے لگا: ”میں نے تمہیں تصویریں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس شہر میں اچھی تصویریں دستیاب نہیں ہو سکیں، اور اپنے پاس کی تمہیں دینے سے رہا لیکن میں ماسکو سے خرید لاؤں گا۔“

”لیکن میں انہیں لے کر کیا کروں گا۔“

”کیوں، کیا تمہیں مصوری پسند نہیں؟“

”مجھ سے تو سیدھی لکیر بھی کھینچی نہیں جاتی۔“

”کوئی ہرج نہیں، میں تمہارے لیے کوئی اور تحفہ لاؤں گا۔“

اتنے میں اماں اندر آئی: ”ہم جلد لوٹ آئیں گے۔ تمہارے

ابا کو امتحان دینا ہو۔ جیسے ہی وہ کامیاب ہو جائیں گے، ہم دونوں یہاں آجائیں گے۔“

یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مجھ سے برابری والوں کا سا

برتاؤ کر رہے تھے۔ لیکن مجھے یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک

ڈڑھیل بھی طالب علم ہو سکتا ہے۔

میں نے پوچھا: ”آپ کیا سیکھ رہے ہیں؟“

”پیمائش“



نانا نے کہا: ”ارے تو اندھا تو نہیں ہو گیا؟ اس کی مدد کیوں نہیں کرتا؟“

لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ میں آپ اپنے غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ میرا سوتیلا باپ ٹانگیں ٹکیر کر گاڑی میں دھنس گیا اور نانی نے اس کے ہاتھ میں کچھ پلندے تھما دیے۔ انہیں اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اور ٹھڈی دبا کر اس نے یہ الاپ لگائی: ”بس بہت ہوا آ آ!“

تھکاوٹ کے مارے اس کے چہرے پر جھڑیاں پڑ گئی تھیں۔ دوسری گاڑی میں سبز پری اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رونق افرا تھی جو تلوار کے دستے سے ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے جا ہی لے رہا تھا۔

نانا نے پوچھا: ”کیا آپ لڑائی کے لیے جا رہے ہیں؟“

”جی ہاں، مجبوری ہے۔“

”یہ تو کارنیک ہے۔۔۔ ہمیں ترکوں کی خبر لینی چاہیے“ وہ سب چلے گئے۔ اماں نے کئی بار مرکر رومال ہلایا۔

نانی آنسوؤں میں شرابور، دیوار کا سہارا لیے ہوئے ہاتھ ہلاتی رہی۔ نانا نے آنسو پونچھ کر بھڑائی ہوئی آواز میں کہا:

”مجھے تو اس کا انجام اچھا نظر نہیں — آتا۔“

پھانک کے ستون پر بیٹھے بیٹھے میں گاڑی کے دھچکولے بازی کا تماشا دیکھتا رہا۔ مگر جیسے ہی وہ کونے میں جا کر آنکھ اوھل ہوئی گویا میرے دل کا جھروکا یکایک بند ہو گیا۔ ابھی پو پھٹی تھی، مکانوں کی کھڑکیاں کھلی نہ تھیں اور سڑک سنان تھی۔ میں نے کبھی زندگی کا ایسا فقدان نہ دیکھا تھا۔ دور کہیں گڈ ریا کوئی بے ہنگام

سُرا لاپ رہا تھا۔

نانا نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا: ”جِل آ، ناشتہ کریں۔ تیری قسمت میں میرا ہی ساتھ ہوا ہے۔ جیسے اینٹ پر آگ کا اثر ہوتا ہے ویسے ہی تو مجھ پر اثر ڈال رہا ہے۔“

صبح سے شام تک ہم دونوں باغ میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ کیا ریاں لگاتا، قلم بندی کرتا اور کیڑوں کا قتل عام کرتا تھا۔ اور میں اپنے محل کی آرائش میں مصروف رہتا تھا۔ نانا نے ایک جِلے ہوئے شہتیر کو کاٹ کر کھچیاں زمین میں نصب کیں اور میں نے ان میں چڑیوں کے پنجرے ٹانگ دیے۔ پھر میں نے سوکھی ہوئی گھاس کا گھنا جال بُنا اور دھوپ اور اوس سے بچنے کے لیے اسے اپنے چبوترے پر شامیانے کی طرح تان دیا۔ اپنے ارادے میں مجھے کامیابی ہوئی۔

نانا نے کہا: ”اگر تجھے چیزوں کا بہترین استعمال کرنا آگیا تو یہ تیرے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔“

اس کی نصیحتوں کو میں بہت قیمتی سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میرے چبوترے پر لیٹ جاتا جس پر میں نے گھاس بچھا دی تھی۔ ہر ہر لفظ کو یوں تول کر گویا وہ بدقت تمام انھیں تلاش کر سکا ہے، کہنے لگتا: ”اب تو اپنی ماں سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ اس کے گھر اور بچے ہوں گے اور وہ ان سے زیادہ محبت کرے گی اور تیری نانی۔ اب اسے پینے کی عادت بڑھ گئی ہے۔“

دیر تک وہ یوں چپ رہا گویا کسی کی باتیں سن رہا ہو پھر

بادل ناخواستہ یہ دل شکن کلمے زبان پر لایا۔

”یہ دوسری مرتبہ ہو کہ وہ شراب پینے لگی ہو۔ جب مائیکل فوج میں بھرتی ہوا تو اس نے یہی علت پال لی تھی۔ اور اس احمق کی منت پر میں نے اسے فوج سے رہائی دلائی۔ اگر وہ سپاہی ہوتا تو کیا عجب کہ بدل جاتا.... بہشت... دھت!... میں جلد مر جاؤں گا۔ اور تو اکیلا رہ جائے گا۔ تجھے اپنی روٹیاں کمائی ہوں گی۔ سمجھتا ہو یا نہیں؟ - - - - شاہاش!... تجھے خود جفاکشی کی عادت ڈالنی چاہیے - - - - اور دوسروں سے دب کر نہ رہنا۔ زندگی خاموشی، امن اور ایمانداری سے گزارنا سیکھو۔ دوسروں کا کہا سنو لیکن کرو وہی جسے اپنے لیے بہتر سمجھتے ہو!“

ان دنوں کو چھوڑ کر جب موسم خراب ہوتا، میں نے ساری گرمیاں باغ میں گزاریں۔ اگر رات کو گرمی پڑتی، تو میں وہیں موم جامہ کے ایک ٹکڑے پر سوتا جو نانی نے مجھے دیا تھا۔ گاہ گاہ وہ بھی باغ میں سوتی۔ گھاس کی توشک بچھا کر وہ میرے پاس لیٹ جاتی اور دیر تک کہانیاں سنایا کرتی۔ بیچ بیچ میں ٹک کر وہ اس قسم کی بے موقعہ رائے زنی کرنے لگتی تھی۔

”دیکھو! - - - - ایک ستارا گر رہا ہو!۔ یعنی کوئی مظلوم

روح درد میں مبتلا ہو۔ - - - - یا کوئی ماں اس دنیا کی یاد کر رہی ہو! اس کا مطلب یہ ہو کہ اسی گھڑی کسی نیک مرد یا عورت کا جنم

ہوا ہو!“

یا وہ اُنھی سے دکھا کر کہتی:

”ایک نیا تارا جلمگانے لگا۔ دیکھ، وہ کسی بڑی سی آنکھ سے  
مشابہ ہے۔۔۔۔۔ قربان جاؤں تجھ پر امی آسماں کے روشن دان!  
۔۔۔۔۔ امی خدا کے مقدس زیور۔۔۔۔۔“

نانا جان کرک اٹھتے: ”امی پاگل، تجھے زکام ہو جائے گا۔  
جب مرگی کا دورہ اٹھے گا تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ڈاکو آکر  
تجھے قتل کر جائیں گے۔“

کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں نور کی ندیاں  
بہنے لگتیں اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہو۔ باغ کے  
مغلی سبزہ پھر آتش پاروں کی بارش سی ہونے لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ  
ہر شے ایک گونہ تاریک ہو کر وسیع تر ہو جاتی — بھول سی جاتی۔  
یہ اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہو جاتی تھی۔ دھوپ میں  
جلس کر پٹیاں مرجھا جاتیں اور گھاس کے تینکے سر جھکا لیتے تھے۔  
سہ چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی اور ایسی ہنک پھیلاتی جو موسیقی  
کی طرح خوش گوار ہوتی تھی۔ اور موسیقی کی ترنگیں کھیتوں سے اٹھ کر  
آئیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے۔

رات آتی۔ اور اس کے ساتھ دل میں ماں کے پیار کی سی شگفتگی  
اور حیات آفرینی پیدا ہونے لگتی۔ سنائے نے اپنے گرم وگداز  
ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی۔ اور سارے گرد و غبار کو دھو کر  
وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے۔ چت لیٹے ہوئے  
آسمان کی نامحدود گہرائی — ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں  
ستاروں کی ایک نئی محض سجاتی ہے — ستاروں کی چمک دمک



کے تپاڑے میں کیسا مزا ملتا تھا۔ اور اس موقع پر اگر زمین پر قدم رکھو تو گمان ہوتا ہے کہ یا تو دنیا سمٹ گئی ہے یا تم بہت بڑے ہو گئے ہو اور اپنے ماحول میں سمائے جا رہے ہو۔ لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے۔ تاہم نہایت ہی دھیمی اور ناقابل احساس آوازوں کا سلسلہ سا جاری رہتا ہے۔ اور ہر آواز — خواہ وہ کسی بیل خوابیدہ کا تڑانہ نیم شب ہو یا کسی خرگوش کا سراسیمہ خرام یا کسی انسان کی دیرِ لب گفتگو — دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ ایک خاص نرالا پن اس کے حواس سکون کے نیچے چھپا رہتا ہے۔

کہیں ہارمونیم بج رہا ہے۔ کوئی عورت تہقہ لگا رہی ہے۔ کوئی تلوار سڑک کے روڑوں سے ٹکرا رہی ہے۔ کوئی گتا بھونک رہا ہے۔ مگر یہ آوازیں صدائے بازگشت ہیں، اُن پتیوں کی دم واپس کی جو صبح کھل کر شام کو مرجھا گئی تھیں۔

کبھی سڑک یا کھیت سے کسی متوالے کی چیخ یا بھگدڑ کا شور سنائی دیتا۔ مگر یہ ایسا معمولی واقعہ تھا کہ ہر طرف توجہ جاتی ہی نہ تھی۔ نانی کی نیند کچی تھی۔ میری طرف سے ذرا بھی اشارہ ملتے ہی وہ قصۂ خوانی شروع کر دیتی تھی اور اس کی ذرا بھی پروا نہ کرتی کہ میں صحن رہا ہوں یا نہیں۔ وہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کرتی جو میرے لیے رات کو زیادہ محبوب اور دلکش بنا دیتی تھیں۔

اس کے میٹھے بولوں کی روانی مجھے نیند کی ندی میں بہلے جاتی اور میں چڑیلوں کے چہچہے کے ساتھ جاگتا۔ سورج مجھے چشمک زنی

کرتا ہوتا اور اس کی کرلوں میں تپ کر نسیم صبح ہوئے ہوئے چلنے لگتی۔  
سیب کے پیڑوں کی پتیاں ادس کی بوندوں کو جھٹک دیتیں۔ سبزہ  
ایسا تروتازہ ہو جاتا کہ پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ وہ آب رواں کی  
طرح شفاف ہوتا اور اس پر ایک ہلکا سا کُہرا منڈلانے لگتا۔ حد نظر  
سے دور آسمان کے قریب ایک چکور تان چھڑ دیتی تھی۔ شبنم کے  
ابھارے ہوئے سب رنگ اور گہمت ایک راحت افزا ولولہ پیدا  
کرتے اور یہ خواہش ہوتی کہ جھٹ پٹ اکٹھ کر کسی کام میں لگ  
جائیے اور سب جانداروں سے پیت کی پینک بڑھائیے

میری پوری زندگی میں یہ سب سے بُرا استعزاق اور پر اس  
زمانہ تھا۔ اس کے دوران میں مجھ میں اپنی طاقت کا احساس مضبوط  
ہوا اور پروان چڑھا۔ میں جھیپو اور نالمنسار ہونے لگا۔ اور  
بڑوس کے بچوں کی بکار میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہی جب  
چچا زاد بھائی ہمارے گھر آئے تو میں ان سے برہم ہوا اور مجھے  
ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں وہ باغ میں میرے چبوترے کو توڑ  
نہ دیں — وہ میری زندگی کا پہلا کارنامہ تھا۔

نانا کی بات جیت اب میرے لیے بالکل غیر دلچسپ ہو گئی تھی  
کیونکہ وہ روز بروز زیادہ روکھی بھکی چڑ چڑی اور دکھ بھری ہوتی  
جاتی تھی۔ وہ اکثر نانی سے تکرار کرتا اور اگر وہ کبھی اپنے بیٹوں  
سے ملنے چلی جاتی تو اسے گھر سے لکال دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ  
کئی دن کے لیے غائب ہو گئی اور ان حضرت کو چو لھا سنبھالنا پڑا۔  
ہاتھ جلا کر وہ درد سے رچلا اٹھا اور عُصّے میں برتن توڑ دیے۔

اب اس کی حرص بڑھتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ میری جھونپڑی میں آکر سبز پوش چبوترے پر آرام سے دراز ہو جاتا اور تھوڑی دیر چپ چاپ مجھ پر نظریں گڑانے کے بعد پوچھ بیٹھتا۔

”تو یوں چپ کیوں ہو؟“

”بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں؟“

اب اس کا دغظ شروع ہوتا:

ہمارا شمار شریفوں میں نہیں ہو۔ کوئی ہمیں مشورہ دینے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ ہمیں آپ اپنی محنت سے علم حاصل کرنا ہو شریفوں کے لیے کتابیں اور مدرسے ہیں۔ مگر ہمارے لیے کون وقت برباد کرتا ہو۔ ہمیں آپ اپنی راہ تلاش کرنا ہو۔“

پھر وہ کسی دھیان میں لگن ہو گیا اور یوں بے حرکتی اور خود فراموشی کے عالم میں کھو گیا کہ اس کی موجودگی ناگوار گزرنے لگی۔

ایام برسات میں اس نے مکان بیچ دیا۔ اس واقعہ کے چند روز قبل ایک صبح چائے پیتے پیتے اس نے یک بیک اعلان کیا۔

”بڑی بی، میں نے بہت عرصہ تمھاری پرورش کی۔ مگر اب تمھیں آپ اپنی روٹی کمانی ہوگی۔ سنا؟“

نانی نے ایسے اطمینان سے یہ اعلان سنا گویا عرصہ دراز سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے ناس کی ایک چٹکی اپنی پیللی ناگ میں بھری اور کہا:

”کوئی ہرج نہیں۔ تمھاری یہ مرضی ہو تو مجھے بھی انکار نہیں۔“

اب نانا نے ایک ٹیلے کے نیچے کسی وقیانوسی مکان کے تہ خانہ

میں دو اندھیرے کمرے کرائے پر لیے۔

جب ہم نے اپنے نئے ٹھکانے میں قدم رکھا تو نانی نے ایک پرانی جوتی تندور کے اندر رکھ کر گھر کے بھوت کا منتر جگایا :

”گھر کے بھوت، گھرانے کے بھوت! یہ رہی تیری سواری۔  
ہمارے نئے گھر میں آ۔ اور سوئی ہوئی قسمت کو جگا!“

نانا نے آنگن سے یہ نظارہ دیکھتے ہی آواز لگائی۔

”اے کافر، میں تیرے حواس درست کر دوں گا! تجھے کچھ میری عزت کا خیال ہو یا نہیں!“

نانی نے سنجیدگی سے جواب دیا: ”اوئی بڑے میاں ایسی باتوں سے تمھارا بھلا نہ ہوگا۔“ لیکن نانا کا غصہ نہ تھا اور اس نے دُکھ کے بھوت کی نیاز کی ممانعت کر دی

فرنیچر اور باقی سامان اس نے ایک تاتار کباڑیے کے ہاتھ بیچ دیا۔ تین دن ان دونوں نے مول بھاؤ اور گالی گلوچ میں گزارے۔ نانی کھڑکی سے منہ نکال کر کبھی روتی کبھی ہنستی اور زیر لب بڑبڑاتی جاتی: ”ان کا یہی حشر ہونا تھا! توڑ دو، پھینک دو!“ اپنے باغ اور جھونپڑے کے غم میں میں بھی روٹتا ہوا رہا تھا۔

دو چھگڑوں میں لد کر ہم اپنے نئے گھر میں آئے۔ میں برتنوں کے بیچ میں اٹا ہوا تھا اور چھکڑائیوں بے تحاشہ دھچکے کھا رہا تھا۔ گویا مجھے ابھی سامان کے ساتھ باہر پٹک دے گا۔ اس دن کے بعد دو سال تک یعنی ماں کے انتقال تک مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی گویا میں سڑک پر پھینک دیا گیا ہوں۔ اس نقل مکان کے چند

روز بعد ہی اماں کی آمد ہوئی۔ وہ دُہلی اور پیلی پڑ گئی تھی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک آگئی تھی۔ وہ ہم تینوں کو ہنسی لگا کر دیکھنے لگی گویا پہلی بار دیکھا ہو۔ زبان سے وہ کچھ نہ بولی۔ میرا سوتیلہ باپ آہستہ سے سیٹی بجاتے اور کھکھارتے ہوئے کمرے میں ٹپٹپٹ لگا۔ اس کے ہاتھ پیچھے پر تھے اور انگلیاں پھڑک رہی تھیں۔

اماں نے میرے گالوں کو اپنی گرم انگلیوں سے دبا کر کہا: "مٹاؤ اللہ! تو کیسا لمترنگ ہو گیا۔" وہ ایک غیر دلکش بھورا گاؤں پہنچے ہوئے تھی اور اس کا پیٹ تنا ہٹوا تھا۔

سوتیلے باپ نے ہاتھ بڑھا کر کہا: "کہو میاں کیسے ہو؟" پھر ناک چڑھا کر بولا: "جانتے ہو یہاں کس قدر سہلین ہو؟"

وہ دونوں ایسے ماندے پڑ گئے تھے گویا دور سے پیدل چل کر آئے ہوں۔ ان کے کپڑے گرد آلود ہو رہے تھے اور وہ لیٹ کر سو جانا چاہتے تھے۔ جب وہ قہراً دھیراً چائے پینے لگے تو ناتا نے دھلی دھلائی کھڑکی کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"تو گویا آتش زنی میں آپ کا سارا مال متاع جل گیا؟"

سوتیلے باپ نے بے دھڑک جواب دیا: "وہ تو کہیے کہ ہماری جان بچ گئی۔"

"افوہ!۔۔۔۔۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔"

ناتی کی طرف جھک کر اماں نے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ یوں چُندھیا گئی گویا کوئٹا لپک گیا ہو۔ اب ماحول زیادہ

بے لطف ہونے لگا۔

اتنے میں نانا نے تیکھی مگر صاف آواز میں کہا:

”جناب یوجین صاحب، گستاخی معاف، سننے میں یہ آیا ہو کہ یہ آگ واگ رزا ڈھکوسلا ہو۔ آپ کا دیوالہ کسی جوئے گھر میں نکلا ہو۔“

اب تو موت کا سا سناٹا چھا گیا اور سمادر کی سرسراہٹ اور پانی کی بوندوں کی شپ شپا ہٹ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ بالآخر اماں نے نہایت دل نشیں انداز میں کہا:

”اباجان————“

اب تو نانا جان گلا بھاڑ کر چیخ اٹھے: ”کیا کہنا ہو اباجان ہے! کیا میں نے تجھے سمبھایا نہ تھا کہ تیس سال کی گائے کا جوڑ بیس سال کے بھڑے سے نہیں مل سکتا؟۔۔۔ اب اپنے کیے کی سزا بھگتو۔۔۔ اور یہ ہو وہ لچا! بڑا شریف زادہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ بیٹی اب مزاج درست ہوئے؟“

وہ چاروں زور زور سے شور مچانے لگے اور ان میں میرے سوتیلے باپ کی غراہٹ سب سے زیادہ زور دار تھی۔ میں برساتی میں جا کر کڑیوں کی ڈھیر میں بیٹھ گیا۔ اماں میں یہ قیامت کی تبدیلی دیکھ کر میں بھوچکا رہ گیا۔ کمرے کے اندر اس تغیر کا مجھ پر وہ اثر نہ ہوا تھا جو باہر شفق میں اس خیال سے پیدا ہوا۔

یہاں سے ہم ’سور موفا‘ کے ایک نئے مکان میں کیوں منتقل ہوئے، اس سلسلے کے واقعات اب میں بھول گیا ہوں۔ اس کی

دیواریں ننگی تھیں اور شہتیروں کی دراڑوں میں گھاس اُگ رہی تھی اور ان میں تل چٹے بھرے ہوئے تھے۔ میرا سوتیلا باپ اماں کے ساتھ دو کمروں میں رہتا تھا، جن کی کھڑکیوں کا رُخ سڑک کی طرف تھا۔ میں نانی کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا جس کا جھروکا چھت سے ملا ہوا تھا۔ چھت کے مقابل کسی کارخانے کی چمنیاں تھیں جو ہمیشہ دھنوں کے بادل اڑایا کرتی تھیں۔ جاڑوں کی تیز ہوا اس دھنوں کو سارے گانوں میں پھیلا دیتی تھی اور ہمارے سر دُکروں سے ہمیشہ جلانہ کی بو آیا کرتی تھی۔ تڑکے میں بھیرپوں کی غراہٹ سنائی دیتی تھی۔

اسٹوں پر کھڑے ہو کر میں بالائی جھروکے سے کارخانے کے پھانک کو دیکھ سکتا تھا جسے کسی بوڑھے بھکاری کے کالے اور پوپے منہ کی طرح ادھ کھلی لالٹیں اجالتی ہوتی تھیں اور انسانوں کا گروہ اس کے اندر اُتاجاتا تھا۔ دوپہر کو پھانک کا سیاہ دھانہ دوبارہ کھلتا اور کارخانہ ادھ چبائے مزدوروں کو باہر اُگل دیتا یہ لوگ ایک کالی تالی کی مانند سڑک پر بہنے جاتے تھے حتیٰ کہ برقی ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں مکانوں کے اندر دھکیں دیتا۔ شاذ و نادر ہی آسمان دکھائی دیتا ہو، ورنہ مکانوں کی چھتوں اور دُود آلود برف کی تہوں پر ایک بھورا اور مٹ سیلا گنبد کھڑا رہتا تھا جو تنہا کو کھل کر اپنی بے انتہا گیرنگی سے اندھیرا سا پیدا کر دیتا تھا۔

شام کے وقت کارخانے پر ایک ہلکی سی سرفی چھا جاتی اور

چمنیوں کو روشن کر دیتی۔ اس گھڑی یہ گمان ہوتا کہ چمنیاں زمین سے نکل کر آسمان کی طرف نہیں اٹھی ہیں بلکہ دھنویں کی چادر سے پیدا ہو کر زمین کی طرف جھک رہی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا کہ گرتے گرتے وہ آگ بھوک رہی ہیں اور گرج رہی ہیں۔

یہ تماشا مجھے اتنا دیتا تھا اور اس کی بے رنگی میرے دل پر بارسا دلا دیتی تھی۔ نانی گویا سارے گھر کی نوکرائی تھی۔ وہ صبح سے شام تک کھانا پکاتی، جھاڑو دیتی لکڑی کاٹتی یا پانی بھرتی رہتی تھی۔ جب وہ پلنگ پر لیٹی تو تھکاوٹ کے بارے پر چور ہو جاتی تھی اور لبنی لبنی سانسیں بھر کر بڑبڑانے لگتی تھی۔ کبھی کبھی کھانا پکا کر وہ اپنی اوئی انگلیا پہنتی اور سائے کو اوپر چڑھا کر شہر کی راہ پکڑتی۔

”جا کر بڑے میاں کو دیکھ آؤں کہ ان پر کیا گزر رہی ہو۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں تو اکڑ جائے گا۔ دیکھتا نہیں کیسی برف پڑ رہی ہو۔“

اور وہ سڑکوں یا برف پوش کھیتوں سے ہوتی ہوئی پانچ میل

چل کر وہاں جاتی۔

میری ماں جو حاملہ تھی، پیلی اور جاڑے میں کانپتی ہوئی ایک

پھٹی ہوئی شال اوڑھے رہتی تھی جس میں کناری ٹنکی ہوئی تھی۔

مجھے اس شال سے نفرت تھی کیونکہ وہ اس کے سڈول جسم

کو بد نما بنا دیتی تھی۔ مجھے شال کی کناری سے چڑھتی اور میں نے

اسے پھاڑ ڈالا۔ مجھے اس مکان سے، کارخانے سے، گاؤ سے۔



ہر چیز سے نفرت تھی۔ اماں بھٹی ہوئی جوتیاں پہنے رہتی تھی۔ جب وہ چلتی تو اس کا بے ڈؤل پیٹ ہلنے لگتا۔ اور اس کی بھوری نیلی آنکھوں میں ایک سخت چمک آ جاتی۔ اکثر وہ دیوار سے لگ کر دیر تک یوں بے حرکت کھڑی رہتی گویا اس میں جن دی گئی ہو۔ کبھی کبھی وہ گھنٹوں کھڑکی سے سڑک کو تاکا کرتی اور یہ سڑک اس جڑے کی مانند تھی جس کے آدھے دانت بڑھا پے کی وجہ سے سڑ گئے ہوں اور بدل گئے ہوں اور باقی آدھے کالے پڑ گئے ہوں۔

میں نے پوچھا: ”آخر ہم نے یہ جگہ رہنے کے لیے کیوں چُنی؟“  
 ”افوہ!۔۔۔۔۔ تو نے پھر بک بک شروع کی۔ چپ رہتا ہوں یا نہیں؟“  
 وہ مجھ سے بہت کم باتیں کرتی تھی۔ اگر کبھی کچھ کہا بھی تو کسی کام کے سلسلے میں: ”یہاں آ۔۔۔۔۔ وہاں جا۔۔۔۔۔ یہ لا!“

مجھے باہر جانے کی اجازت اکثر نہ ملتی تھی۔ اور میں باہر سے ہمیشہ زخم خوردہ واپس آتا تھا۔ کیونکہ مار پیٹ میری تنہا دیکھی تھی اور میں جی کھول کر اس کھیل میں حصہ لیتا تھا۔ اس کی وجہ سے اماں مجھے اپنے کمرپے سے کھٹونکا کرتی تھی۔ مگر یہ سزا مجھے اور بھی برہم کرتی اور میں دوسری مرتبہ زیادہ جوش سے لڑتا۔ اسی مقدار سے اماں کی پٹائی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ یہ مقابلہ جاری رہا حتیٰ کہ ایک روز میں نے اسے ابھی طرح جتا دیا کہ اگر اس نے مجھے پینا بند نہ کیا تو میں اسے کاٹ کھاؤں گا اور گھر سے بھاگ کر برف میں دب مروں گا۔ یہ سن کر وہ حیرت سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مجھے دھکیں کر وہ تھکاوٹ کے مارے ہانپتی ہوئی

کمرے میں ٹہنے لگی اور بولی :

”ارے تو تو وحشی جانور ہوا جا رہا ہو!“

اب وہ جذبہ جے محبت کہتے ہیں میرے دل میں قوس قزح کی مانند تھر تھرانے لگا۔ کسی دودکش کی سیاہ لپٹ کی مانند ہر آدمی کے خلاف میرا غصہ بڑھنے لگا اور میرے سینے پر چڑچڑے پن کی وجہ سے بوجھ سا رہنے لگا۔ اس بے معنی و بے رنگ ماحول میں اکیلے پن کا احساس مجھے ستانے لگا۔

سوتیلا باپ مجھ سے سختی کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ اماں سے شاید ہی کبھی بولتا ہو۔ یا تو وہ سیٹی بجاتا یا کھانتا رہتا اور کھانے کے بعد آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اپنے نکلے ہوئے دانت کو تنکے سے کرید کرتا تھا۔ اماں سے اس کے جھگڑے بڑھنے لگے اور وہ غصے میں تو کی بجائے اسے ’تم‘ سے مخاطب کرتا۔ اور یہ عادت مجھے حد سے زیادہ ناپسند تھی۔ تکرار شروع ہوتے ہی وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کر دیتا تاکہ میں اس کی باتیں نہ سن سکوں مگر اس کی کرخت آواز کو میں صاف سن سکتا تھا۔ ایک دن وہ پیر پنگ کر چلا اٹھا:

”چونکہ اپنی حماقت کی وجہ سے تم گاجن ہو گئی ہو، میں کسی یار دوست کو گھر نہیں بلا سکتا! گائے کہیں کی!“

مجھے ایسا تعجب ہوا اور میں اس قدر بھرا کہ اوپر اچھل کر چھت سے ٹکرا پڑا اور اتنے زور سے زبان کاٹی کہ لہو نکلنے لگا۔ سینچر کے دن مزدور دس دس کی ٹولی بنا کر میرے سونیلے

باپ کے ہاتھ 'نخوراکی کے ٹکٹ' بیچنے کی غرض سے آتے تھے۔  
 قاعدے کے مطابق انھیں یہ ٹکٹ کارخانے کے بھٹیہا رخانے میں  
 صرف کرنا چاہیے تھے۔ میرا سوتیلا باپ انھیں آدھے داموں میں  
 خرید لیتا تھا۔ باورچی خانے میں وہ بڑی اکڑ سے بیٹھ جاتا اور مزدوروں  
 کے ٹکٹ دیکھ دیکھ کر کہا کرتا: "ڈیڑھ روپے!"  
 "یوہین صاحب، لٹہ۔۔۔۔۔"

"بس کہ دیا ڈیڑھ روپے!"

شکر ہو کہ اماں کی زچگی کے وقت یہ آشوب ختم ہو گیا کیونکہ  
 میں ناتا کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ 'کنوں' کے ایک دو منزلہ  
 مکان کی ایک تنگ سی کوٹھڑی میں رہنے لگا تھا۔ کوٹھڑی ایک  
 کچی سڑک کی طرف کھلتی تھی جس کا ڈانڈا اگر جاگھر سے ملا ہوا تھا۔  
 کوٹھڑی میں ایک تندور تھا اور اس کی دونوں کھڑکیاں آنگن کی  
 طرف کھلتی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی مہنی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گیا:

"بھئی یہ کیا مذاق ہو!۔ اب تک تو یہی سننے میں آیا تھا کہ ماں  
 سے بڑا ریت کوئی نہیں۔ مگر اب ثابت ہوا کہ بھتے ناتا کے سوا  
 کوئی دوست نہیں۔ ہشت۔۔۔۔۔ دھت!"

ابھی میں اپنے نئے مکان کا معائنہ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ ناتا  
 اماں اور بچے کو لیے ہوئے آدھکی۔ مزدوروں کی گرہ کاٹنے کے  
 جرم میں میرا سوتیلا باپ برطرف کر دیا گیا تھا۔ اب وہ کسی نئی  
 ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اسٹیشن کے ٹکٹ گھر میں

اسے فوراً کام مل بھی گیا۔ ایک طویل بے لطف زمانے کے بعد میں دوبارہ اماں کے ساتھ کسی گودام کے نہ خانے میں رہنے لگا۔ مہلت ملتے ہی اماں نے مجھے اسکول روانہ کیا۔ اور اول دن سے ہی مجھے اس ادارے سے نفرت ہو گئی۔

میری دج یہ تھی کہ پیروں میں اماں کی جوتی، نانی کی انگلیا کا بنا ہوا کوٹ زیب تن اور اس کے نیچے ایک پیلا کرتا اور پانجام جس کے پائینچے لمبے کر دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس پوشاک کی وجہ سے سب میرا مذاق اڑانے لگے۔ اور پیلے کرتے کی وجہ سے مجھے اینٹ کے رکتے کا لقب ملا۔

لڑکوں سے جلد میری دوستی ہو گئی۔ مگر ماسٹر اور پادری کو میں ایک آنکھ نہ بھایا۔

ماسٹر کا چہرہ زرد اور سر گنجا تھا اور اس کی ناک سے ہمیشہ خون بہا کرتا تھا۔ جب وہ کلاس میں آتا تو اس کی ناک میں روئی ٹھنسی ہوتی تھی۔ اور کرسی پر بیٹھ کر منمنی آواز میں سوال پوچھتے پوچھتے کسی جملے کے بیچ میں اچانک رُک کر وہ نکتوں سے روئی نکالتا اور اسے دیکھ کر سر ہلانے لگتا تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور روکھا تھا اور اس کی جھڑیوں میں سبزی کی بھلک تھی۔ مگر سب سے زیادہ مہیب چیز اس کی آنکھیں تھیں جن کا رنگ جست کا سا تھا اور وہ ایسے کریمہ انداز سے مجھے گھورا کرتی تھیں کہ مجھے محسوس ہوتا کہ اپنے گال کو نوچے بغیر ان نگاہوں سے بچ نہیں سکتا۔

کئی روز کلاس میں میرا نمبر اول رہا اور مجھے ماسٹر کی میز کے قریب بیٹھنا پڑا۔ یہ مصیبت ناقابل برداشت تھی کیونکہ بظاہر وہ میرے سوا اور کسی کو نہ دیکھتا تھا اور ہمیشہ میایا کرتا تھا۔

”پیشکوف، تم صاف قمیص کیوں نہیں پہنتے۔ پیشکوف پانٹو کیوں پٹک رہے ہو۔ پیشکوف جوتے کے بند کیوں نہیں باندھتے۔“ لیکن اس بدسلوکی کا مزہ بھی ان حضرات کو چکھنا پڑا۔ ایک روز میں نے تربوز کے آدھے حصے کا کھوکھل لیا اور اسے دروازے کی چرخی سے باندھ دیا۔ جب دروازہ کھلا تو تربوز اوپر اٹھ گیا مگر جب ماسٹر نے اسے بند کیا تو تربوز ٹوپی کی مانند اس کی گنجی کھوپری میں کھٹ سے بیٹھ گیا۔ چیراسی شکایت نامہ کے ساتھ مجھے ہیڈ ماسٹر کے گھر لے گیا اور اس شرارت کی پاداش میں میری خوب گندی ہوئی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس کی میز پر ناس چھڑک دی اور وہ چھینکتے چھینکتے ایسا تنگ آیا کہ کلاس جھوڑ کر بھاگا اور اپنے عوض اپنے سالے کو بھیج دیا۔ یہ ایک حולدار تھا اور اس نے ”ہیں زندہ باو شاہِ زار!“ اور ”آزادی اور آزادی!“ کے ترانے الاپنے کا حکم دیا۔ جو لڑکے سُر نہ ملا سکے اس نے ان کی کھوپریوں پر اپنے ڈنڈے سے وہ گت بجائی کہ ایک کھوکھلی سی آواز آئی اور اچھی خاصی چوٹ لگی۔

پادری ایک گھبرو جوان تھا اور اس کے بال بے بے تھے۔

وہ مجھے پسند نہ کرتا تھا کیونکہ ایک تو میرے پاس انہیں نہ تھی، دوسرے میں اس کے انداز تقریر کی نقل اُڑاتا تھا۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ پوچھتا:

”پیشکوف، تم وہ کتاب لائے یا نہیں؟ ہاں، ہاں، کتاب!“  
 ”جی نہیں، میں کتاب نہ لاسکا۔ ہاں، ہاں۔“  
 تمھاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں یا نہیں؟  
 ”نہیں“

تو پھر یہاں سے تشریف لے جائیے۔ ہاں، میں آپ کو سبق نہیں دینا چاہتا۔ ہاں، اس سے کیا فائدہ؟  
 بھلا اس سے میرا کیا بگڑتا تھا۔ اس سبق کے دوران میں میں گانوں کی گندی سڑکوں پر قلا بانیاں کھاتا پھرتا اور وہاں کی پُربہنگامہ زندگی کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔

اس پادری نے عیسیٰ کا سا حسین مکھڑا پایا تھا، آنکھوں میں زنانہ بھیل پن تھا اور اس کے ننھے ہاتھ نازک تھے۔ اس کی ہر ادا میں نفاست تھی۔ وہ جو بھی چیز اٹھاتا — خواہ وہ قلم ہو یا کتاب — اسے نفاست سے برتنا گویا اس میں جان ہی اور اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ گویا اس سے اسے محبت ہی اور ڈرتا ہی کہ کہیں یہ رؤف نہ جائے۔ وہ طالب علموں سے کچھ بہت اچھا سلوک نہ کرتا تھا تاہم یہ سب اسے چاہتے تھے۔

اس کے باوجود کہ میں ذہین اور محنتی تھا، مجھے کچھ عرصے بعد ہی تاکید کر دی گئی کہ یہودہ روی کے جرم میں میں اسکول سے

نکال دیا جاؤں گا۔ یہ سن کر میرے چھلکے چھوٹ گئے کیونکہ اس کا انجام میرے سامنے تھا۔ اماں کی بد دماغی روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور وہ مجھے بُری طرح پیٹا کرتی تھی۔

مگر میری نجات کے اسباب نکل آئے۔ پادری 'خرزناٹ' ایک دن بے اطلاع ہمارے اسکول کی طرف نکل آیا۔ اس کا قد ٹھنکنا تھا اور اگر میں بھولتا نہیں تو وہ کُبرا تھا۔ بس کوئی جادوگر معلوم پڑتا تھا۔

وہ میز پر بیٹھ گیا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں اور بھی چھوٹا معلوم ہونے لگا اور اس کی مضحکہ خیز ٹوپی بالٹی کی طرح اس کے سر پر جمی ہوئی تھی۔ آستینوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اس نے کہا: "بھو، آؤ، ہم کچھ گپ شپ کریں۔"

کمرے میں گرمی سی آگئی اور ایک نرالا خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا۔ کئی لڑکوں کے بعد اس نے مجھے میز کے پاس طلب کیا اور سنجیدگی سے پوچھا:

"تمہاری عمر کیا ہے؟ ایس، ایس اتنی! لیکن تم کتنے اونچے پورے ہو! میرا خیال ہے کہ تم نے اکثر بارش کے پانی میں اٹھنا کیا ہے۔ کیوں؟" ایک سوکھا سا ہاتھ جس کے ناخن لمبے اور تیز تھے، میز پر رکھ کر اور دوسرے سے اپنی چھدری ڈاڑھی کو کھاتے ہوئے وہ اپنی مہربان آنکھیں میرے قریب لایا:

۳۰۵ یہ کئی مشہور کتابوں کا مصنف تھا 'نحوت و شادی' پریس نے ایک پر مغز مقالہ لکھا تھا

جس کا جوانی میں مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ - (گوری)

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں انجیل کا کون سا قصہ پسند ہے؟“ جب میں نے کہا کہ میرے پاس انجیل نہیں ہے اور میں اس علم سے بے بہرہ ہوں تو وہ اپنے کنسٹپ کو کھینچ کر بولا :

”یہ کیا ماجرا ہے؟۔ یہ تمہارا پہلا فرض ہے۔ لیکن شاید تم نے دوسروں کی زبانی سن سن کر کچھ سیکھا ہے۔ تمہیں مناجات یاد ہے؟ شاباش! اور دعائیں بھی؟۔۔۔۔۔ تو اور کیا چاہیے!۔ اولیا کے حالات بھی؟۔۔۔ اور نظم میں؟۔۔۔۔۔ ارے تو تو اس مضمون میں بہت ہوشیار ہے۔“

اسی وقت ہمارے پادری صاحب ہانپتے کانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے پادری نے اسے دعا دی لیکن جب اس نے میری بابت اپنی چونچ کھولی تو بڑے میاں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا :

”بھئی، معاف کرنا۔۔۔ ایک منٹ کے لیے؟۔۔۔ ہاں امیساں، وہ الکی علیہ الرحمۃ کا قصہ کیا ہے؟“

جب یہ نظم سناتے سناتے اگلا بند بھول کر میں چپ ہو گیا تو بڑے پادری نے کہا :

”مزے کی نظم ہے۔ اچھا اب کچھ اور سناؤ۔ حضرت داؤد کا قصہ؟۔۔۔ ہاں ہاں میں غور سے سن رہا ہوں۔“

وہ دراصل کان لگا کر سن رہا تھا اور یہ نظمیں اسے پسند آئیں۔ دیر تک مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

”یہ مناجاتیں تمہیں کس نے سکھائیں؟ تمہارے نانا بڑے



بھلے مانس ہوں گے؟“ ”نہیں؟“ ”ایں بُرے ہیں! یہ کیا کہہ رہے ہو؟  
۔۔۔ تم ضرور بڑے شریر ہو گے۔“

پہلے تو میں جھجکا مگر بالآخر قبولنا ہی پڑا: ”جی ہاں۔“ ماسٹر اور  
پادری نے فوراً میرے اعتراف کی دلی تائید کی۔ بڑا پادری  
سر جھکائے اس فرد جرم کو منتا رہا اور پھر لنبی سانس بھر کر بولا:  
”مٹا، تمہارے بارے میں ان کی رائے کیا ہے؟ یہاں آؤ۔“  
اپنا ہاتھ، جس سے سرو کی لکڑی کی بو آرہی تھی میرے سر پر  
پھیر کر اس نے پوچھا:

”تم اس قدر شریر کیوں ہو؟“

”پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔“

بیٹے، یہ نہ کہو۔ اگر تم نے جی نہ لگایا تو علم نہ آئے گا کیونکہ  
تمہارے استادوں کی رائے ہو کہ تم بہت ذہین ہو۔ یہ کیوں نہیں  
کہتے کہ تمہاری شرارتوں کا سبب کچھ اور ہے۔“  
جیب سے ایک نوٹ بک نکال کر وہ اس میں کچھ لکھنے لگا:

”الکسی پیشکوف۔۔۔ میرے بچے، ضبط سے کام لینا اور ضرورت  
سے زیادہ شرارت نہ کرنا۔۔۔ تھوڑی بہت شرارت ہیں منظور  
ہو۔ لیکن لوگوں کی جان پر اور کیا مصیبتیں کم ہیں کہ ان میں اضافہ  
کیا جائے۔ بچو۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟“

کئی لڑکوں نے ہنستے ہوئے کہا: ”جی نہیں“

”میرا خیال ہے کہ تم سب زیادہ اودھم نہیں مچاتے۔ کیوں؟“  
لڑکوں نے ایک فراموشی قہقہہ لگا کر جواب دیا:

”ہم بھی بڑے شریر ہیں۔“  
 بڑے پادری نے کرسی کا ٹیکالے کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔  
 اور یہ سن کر ہم سب کو اچنبھا ہوا حتیٰ کہ ماسٹر اور پادری بھی  
 منہ ہی نہ روک سکے :

”دوستو، یہ حقیقت ہے کہ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو تم سے  
 زیادہ شریر تھا۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

وہ بچوں سے پیچیدہ سوال پوچھنے لگا اور وہ گڑ بڑا کر ایک  
 دوسرے سے الجھنے لگے جس سے لطف دو بالا ہو گیا۔ آخر کار وہ  
 جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹو، تمہاری صحبت نہایت پُر لطف ہے لیکن مجھے اب رخصت  
 ہونا چاہیے۔“

اپنی آستین ہٹا کر اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور ہم سب پر صلیب  
 کا نشان بنا کر دعا دی :

”خدا، بیٹے اور روح القدس کے نام پر میں تمہاری برکت کی  
 دعا مانگتا ہوں۔ اچھا، خدا حافظ۔“

ہم سب بیک آواز چنچ پڑے :  
 ”خدا حافظ۔ حضرت، جلد بوٹے گا۔“

اپنا کنٹوپ ہلا کر وہ بولا :

”میں جلد آؤں گا اور تمہارے لیے کتابیں لاؤں گا۔“

باہر جاتے جاتے وہ ماسٹر سے کہتا گیا۔ ”اب انھیں چھٹی دے دیجیے۔“  
 میرا ہاتھ تھامے تھامے وہ باہر آیا اور جھک کر بولا :

”اب تم آپ سے باہر نہ ہو گے۔ کیوں؟۔۔۔ یہ وعدہ رہا۔ میں تمہاری شرارتوں کی وجہ سمجھ گیا۔۔۔ بیٹے، خدا حافظ۔“

میں سخت اشتعال کے عالم میں تھا۔ میرے دل میں عجیب وسوسے اٹھ رہے تھے۔ اور جب ماسٹر سب کو چھٹی دے کر مجھے سمجھانے لگا کہ آئندہ مجھے برف کی مانند سرد اور گھاس کی مانند نرم رہنا چاہیے تو میں غور سے فرماں برداروں کی طرح اس کی تقریر سنتا رہا۔

پادری نے لبادہ اوڑھتے ہوئے اس کے سر میں سر ملایا: اور آج سے تمہیں میری کلاس میں آنا ہوگا۔ ہاں ہاں۔ اور اب تم گڑ بڑ نہیں کر سکتے۔ ہاں ہاں۔

ادھر اسکول میں معاملات سلجھ رہے تھے کہ گھر میں ایک بد مزہ واقعہ پیش آیا۔ میں نے اماں کا ایک روبل روپیہ چُرا لیا۔ یہ گناہ بلا ارادہ سرزد ہوا تھا۔ ایک شام کو بچہ اور گھر کی دیکھ ریکھ میرے سپرد کر کے اماں کہیں باہر گئیں۔ دل بہلانے کے لیے میں سوتیلے باپ کی ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کے اوراق کے بیچ میں دو نوٹ نظر آئے، ایک دس روبل کا۔ دوسرا ایک روبل کا۔ کتاب میری سمجھ میں خاک نہ آئی اور میں نے اسے بند کر کے رکھ دیا۔ لیکن ایک بیک یہ خیال دل میں آیا کہ اگر ایک روبل میرے ہاتھ لگ جائے تو میں انہیں کے علاوہ ”دوبل سن کرو سو“ کی داستان بھی خرید سکتا ہوں۔ اس کتاب کے وجود کا علم مجھے کچھ روز پہلے اسکول میں ہوا تھا۔ دوپہر کی چھٹی کے وقت میں ہم جولین

کو بھوت پریت کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ اتنے میں ان میں سے ایک نے حقارت سے کہا:

”تم نے یہ کیا طوطا کہانی نکالی ہو! مجھے تو بس روبن سن پسند ہو کیونکہ وہ ایک سچا واقعہ ہو۔“

جب میں نے یہ دیکھا کہ اور بھی کئی دوست یہ کتاب پڑھ چکے ہیں اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو مجھے سخت غصہ آیا کہ یہ نانی کی کہانیوں کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ روبن سن پڑھ کر انھیں بتاؤں گا کہ یہ کیسی طوطا کہانی ہو!

دوسرے دن میں انجیل اور اینڈرسن کی کہانیوں کی دو پھٹی ہوئی جلدیں خرید کر اسکول لے گیا۔ ساتھ ساتھ تین موٹے موٹے پراٹھے اور آدھ سیر قیمہ بھی تھا۔ گر جاگھر کے پاس ایک چھوٹی سی دوکان میں روبن سن کی داستان بھی تھی — ایک چھوٹی سی کتاب جس کا سرورق زرد تھا اور اس پر ایک ڈڑھیل آدمی کی تصویر تھی جس کے جسم پر کسی جانور کی کھال پڑی ہوئی تھی۔ مجھے کتاب کی ظاہری شان پسند نہ آئی۔ اس کے برعکس اینڈرسن کی کہانیاں گو بھیٹی پرانی تھیں تاہم اس روپ میں بھی بھی لگتی تھیں۔

کبھی کے گھنٹے میں میں نے پراٹھے اور قیمہ کی دعوت رجائی اور پھر ہم سب مل کر وہ لاجواب کہانی ”ببل“ پڑھنے لگے جس نے ہمارے دلوں کو موہ لیا۔

”چین میں چینوں کے سوا کوئی نہیں رہتا، یہاں تک کہ ان کا بادشاہ بھی ایک چینی ہو!“ مجھے یاد ہو کہ اس سیدھے سادے سیلے

جُملے نے مجھے کتنا متاثر کیا۔ اس قصے میں اور بھی خوبیاں تھیں۔  
لیکن اسکول میں ان قصوں کو پڑھنے کی فرصت کب تھی۔ جب  
میں گھر لوٹا تو اتناں نے کڑھائی اٹھا کر جس میں وہ انڈے تل  
رہی تھی، ایک عجیب انداز میں پوچھا۔

”کیا تم نے وہ روپے نکالا تھا؟“

”جی ہاں — اس کتاب کے اندر مجھے ملا۔“

اتناں نے کڑھائی سے مجھے تابڑ توڑ ٹھونکا اور سب سے  
بڑی سزا یہ دی کہ اینڈرسن کی کتابوں کو کسی ایسی جگہ چھپا دیا کہ  
پھر وہ میرے ہاتھ نہ لگیں۔

میں کئی روز اسکول نہ گیا۔ اس اثنا میں میرے سوتیلے باپ  
نے ضرور اپنے کسی دوست کو یہ واقعہ سُنا یا ہوگا اور اس کے بچے  
یہ خبر اسکول میں پھیل آئے۔ چنانچہ وہاں میرا درود ہوتے ہی سب  
نے ”تجور چور!“ کے نعروں سے میرا استقبال کیا۔

یہ تعریف نہایت جامع اور واضح تھی۔ لیکن یہ مجھ پر صادق  
نہ آتی تھی کیونکہ میں نے فوراً اس امر کا اقرار کر لیا تھا۔ میں نے انھیں  
قائل کرنا چاہا مگر وہ کب مجھ پر اعتبار کرنے لگے تھے۔ سو گھر لوٹتے  
ہی میں نے اتناں کو نوٹس دے دیا کہ میں آئندہ اسکول نہ جاؤں گا۔

وہ دوبارہ حاملہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں آزرده اور چہرہ  
غمگین تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے میرے بھائی سا شاکو  
دودھ پلا رہی تھی۔ میری دھکی سنتے ہی اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔  
”تمہارا شبہ غلط ہے۔ کسی غیر کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم نے

روبل تک لاکھا۔“

”آپ خود چل کر ان سے پوچھ لیجیے۔“

”تم نے خود اپنا بھانڈا بھوڑا ہو گا۔ کیوں یہی بات کرنا؟۔  
دیکھو، میں معلوم کر کے رہوں گی کہ اسکول میں کس نے یہ خبر پھیلائی؟“  
جب میں نے اس ہجولی کا نام سنایا تو اماں کا چہرہ پیلا پڑ گیا  
اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

باورچی خانے میں جا کر میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ یعنی  
ایک بڑا سا صندوق جو تندور کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ لیٹے لیٹے  
میں اماں کی کراہ سن سکتا تھا۔ ”اللہ، اللہ، میرے اللہ!“  
دھو کر سکھائی ہوئی جھاڑنوں کی مکروہ بدبو ناقابل برداشت  
تھی اور میں اُٹھ کر آنگن کی طرف جا رہا تھا کہ اماں نے مجھے  
آواز دی :

”کہاں جا رہے ہو؟ میری بات سنو۔ یہاں آؤ۔“  
ہم فرش پر بیٹھ گئے، ننھا، ساشا، اماں کی گود میں لیٹے لیٹے اپنے  
بٹن سے کھیلنے اور اپنی توتلی زبان میں ”بٹن بٹن“ چلانے لگا۔  
میں اماں سے لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے جھوم کر کہا:  
”ہم۔۔۔ غریب ہیں۔۔۔ اور ایک ایک چھدام۔۔۔“ وہ  
یہ جملہ ختم نہ کر سکی اور اپنے گرم بازوؤں میں مجھے لپیٹ لیا۔  
”مہل۔۔۔ نعو!“ وہ یکا یک چنچ اٹھی۔ پہلے بھی میں یہ الفاظ  
اس کی زبان سے سُن چکا تھا۔  
ساشا دُہرانے لگا: ”لگو!“

یہ بھی ایک ہی اچنبھے کا بچہ تھا۔ بالکل گڈوُل تھا۔ اس کا سر بڑا تھا اور وہ اپنی خوبصورت نیلی کالی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتا اور چپ چپ یوں مسکراتا گویا کسی کا انتظار کر رہا ہو۔

خلاف معمول وہ بہت جلدی باتیں کرنے لگا تھا اور ہمیشہ ایک خاموش اطمینان کی کیفیت میں رہتا تھا۔ وہ کمزور تھا اور بمشکل رینگ سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھتا اور میری گود میں آنے کے لیے مچلنے لگتا۔ اپنی نرم نرم انگلیوں میں میرے کانوں کو اٹھ کر وہ خاص طور پر خوش ہوتا۔ معلوم نہیں کیوں اس کی انگلیوں سے نرگس کے پھولوں کی مہک آتی تھی۔ اس کی موت اچانک ہوئی کیونکہ وہ پہلے سے بیمار نہ تھا۔ صبح وہ حسبِ عادت خوش خوش اُٹھا اور شام کو قبر میں سلا دیا گیا۔ یہ واقعہ دوسرے بچہ نکولائی کی پیدائش کے بعد ہی پیش آیا۔ اماں نے اپنے وعدے کے مطابق اسکول میں میری مشکلات کو آسان کر دیا تھا۔ لیکن اسی دوران میں میں ایک دوسری مصیبت میں جا پھنسا۔

شام کی چائے کے وقت میں آنگن سے ہو کر یا ورچی خانے میں داخل ہو رہا تھا کہ اماں کی پُر حسرت آواز سنی :

”یوجین، میں تمہارے پائو پڑتی ہوں۔“

سو تیلے باپ نے گھڑک کر کہا: ”بک بک نہ کرو۔“

”لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اس عورت سے ملنے جا رہے ہو“

”ہاں، تو کیا ہوا؟“

گھڑی بھر وہ دونوں چپ رہے۔ پھر اماں نے کھانتے ہوئے کہا:

”تم کتنے مہل اور کینے ہو۔“

میں نے صاف مٹا کہ اس نے اماں پر وار کیا۔ کمرے میں دوڑ کر دیکھا کہ اماں گھٹنوں کے بل یوں گر پڑی تھ کہ اس کی پیٹھ کرسی سے لگی ہو، سینہ باہر نکلا ہو، گلا خرخر کر رہا ہو اور آنکھیں شیرینی کی طرح چمک رہی ہیں۔ اور یہ حیوان صاف سترے کپڑوں میں ملبوس اسے پڑ در پڑ ٹھوکر میں مار رہا تھا۔ میں نے میز سے وہ چھری اٹھائی جو میرے مرحوم باپ کی تنہا یادگار تھی اور جس سے روٹی کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کی پسلی میں گھسیڑ دی۔ خوبی قسمت کہ اماں نے اسے گھسیٹ لیا اور چھری اس کی کھال سے اُچھل کر اور کوٹ کو بھاڑ کر رہ گئی۔ سوتیلا باپ پسلی پکڑے ہوئے باہر بھاگا اور اماں نے ہانپتے ہوئے مجھے اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ اتنے میں سوتیلا باپ اندر آیا اور مجھے اس کے پنجے سے نکال لے گیا۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی مہم پر جانے سے نہ چوکا۔ اماں تندور کے پیچھے میرے قریب آئی اور مجھے گود میں لے کر چومتی ہوئی رونے لگی: ”بیٹے معاف کرنا یہ میرا گناہ تھا! دلارے تجھے کیا سوچھی تھی؟۔۔۔ اور وہ چھری۔۔۔“

مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں سوتیلے باپ کا اور اپنا خون ایک کر دوں گا۔ میں ضرور یہ کر گزرتا، کم از کم کوشش تو کرتا ہی۔ اب تک چیت پانچا مے میں پھنسی ہوئی وہ قابل نفرت ٹانگ میری آنکھوں کے آگے آ جاتی ہے جو ہوا میں



اچھل کر ایک دکھاری عورت کے سینے پر بھٹو کر مار رہی تھی۔ کئی سال بعد یہ بدنصیب انسان میری آنکھوں کے آگے ایک اسپتال میں مر گیا۔ اس زمانے میں میں اسے چاہنے لگا تھا۔ اور جب میں نے اس کی حسین آنکھوں کی جوت کو بھٹتے ہوئے دیکھا تو اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ تاہم گو میرا دل اس آن غم سے بسج رہا تھا، میں ہرگز یہ نہ بھول سکا کہ اس شخص نے میری ماں کو ٹھکرایا تھا۔

جب روس کی اس وحشیانہ زندگی کی ہیتوں کا خیال آتا ہے تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیوں کیا جائے۔ مگر مجھے یہ جواب ملتا ہے: ”یہ ذکر جائز ہے کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہے اور یہ غمناک حقیقت آج بھی باقی ہے۔ یہ وہ پس کا پیڑ ہے جس کی جڑ نیک ہمیں پہنچا ہے، اسے لوگوں کی روحوں اور ذہنوں سے نکالنا اور اپنی مکروہ و تاریک زندگی سے مٹانا ہے۔“

ان ہیتناک واقعات کی بازخوانی کی ایک اہم ترویج اور ہے۔ حالانکہ یہ حالات ہمیں کچلتے اور بہت سی نیک ہستیوں کو برباد کرتے ہیں۔ لیکن روس میں رہنے والوں کا دل اتنا شباب پرور اور صالح ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بلند ہے۔ ہماری اس عجیب و غریب زندگی میں صرف فطرت کے حیوانی پہلوؤں کو ہی فروغ نہیں ملا بلکہ اس برہنہ کے باوجود ایک تخلیقی اور تعمیری شہ پروان چڑھ رہی ہے۔ ایسی انسانیت جو ہمیں اپنی نوزندگی کا مژدہ سناتی ہے اور اس دور مستقبل کے گیت گاتی ہے جب ہم سب امن چین سے انسانوں کی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔

## باب - ۱۳

ایک مرتبہ بھر میں نے اپنے کو نانا کے گھر میں پایا۔  
 ”کیوں بے چور، یہاں کیا کرنے آیا ہو؟“ ان الفاظ سے اس  
 نے میرا استقبال کیا۔ میز پر انگلیاں چٹاتے ہوئے وہ بولا۔ ”میں  
 تجھے گھر بٹھا کر روٹیاں دینے سے رہا۔ تیری نانی چاہے تو تجھے پالے۔“  
 ”بیشک بیشک“ نانی نے کہا۔ ”ہائے ہمارے نصیب بھوٹ گئے۔“  
 نانا چلا اٹھا: ”اری، جب دوزخ بھرنا ہوگا تو پتا چلے گا۔“ جب  
 وہ کچھ ٹھنڈا پڑا تو مجھے سمجھانے لگا۔

”ہم دونوں اب الگ الگ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے  
 کوئی واسطہ نہیں۔“ نانی بیٹھی ہوئی یس بُن رہی تھی۔ تکی میٹھے سروا  
 میں گا رہی تھی اور کشیدہ کی صندوقچی دھوپ میں جگہ مگر کر رہی  
 تھی۔ نانی تانبے کی مورت معلوم ہو رہی تھی اور اس مدت میں  
 زرا بھی نہ بدلی تھی۔ البتہ نانا کی جھڑیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔  
 اور اس کے بھورے بال اب سفید ہو گئے تھے۔ سرد مہسری  
 اور اکڑفوں کی جگہ ایک قسم کی مستقل بے قراری نے لے لی تھی۔  
 اس کی ہری آنکھیں دھندلی پڑ گئی تھیں اور ان میں شک و شبہ  
 بھرا ہوا تھا۔ نانی نے ہنستے ہنستے مجھے سنایا کہ تانا نے مال و متاع

کا بیٹوارا کس طرح کیا تھا۔ نانی کو برتن بھانڈے اور ہانڈیاں دے کر ان حضرت نے فرمایا:

”یہ رہا تمہارا حصہ۔ اور اب مجھ سے تم ایک حصہ بھی نہیں مانگ سکتیں۔“

اس کے بدلے اس نے نانی کے تمام پرانے کپڑے ہتیا لیے اور انھیں سات سو روپے میں بیچ کر یہ رقم اپنے منہ بولے بیٹے یہودی پھلوں کے بیوپاری کو سود پر قرض دے دی۔ اب وہ ایسا لالچی ہو گیا تھا کہ اپنی آبرو کوڑیوں کے دام بیچتا پھرتا تھا۔ اپنے پرانے دوستوں اور ہم کاروں کے آگے — جو سب امیر تاجر تھے — وہ یہ ڈکھڑا رویا کرتا کہ میری اولاد نے مجھے تباہ کر دیا۔ اور وہ ان سے امداد کا طالب ہوتا۔ وہ سب اسے مانتے تھے اور جی کھول کر اس کی جھولی بھرتے تھے۔ وہ یہ نوٹ بڑی شیخی سے نانی کو دکھاتا اور بچوں کی طرح اسے طعنہ دیتا۔

”اری آلو، تجھے کوئی اس کا عشر عشر بھی تو دے دے“

یہ کمائی بھی وہ سود میں اپنے ایک نئے دوست کو جوتاڑ کی طرح اونچا اور گنجا تھا اور اس کی دکان دار بہن کو دے دیتا۔ یہ عورت موٹی تازی تھی۔ اس کے گال لال اور آنکھیں بھوری تھیں اور وہ خود شہد کی مانند میٹھی تھی۔

گھر کے خرچ کا پیسہ پیسہ آدھوں آدھ بنٹا ہوا تھا۔ ایک روز نانی اپنے پیسوں سے سودا لاکر کھانا پکاتی اور دوسرے دن نانا کی باری آتی۔ ان کے لائے ہوئے سامان کا کھانا کبھی اچھا نہ ہوتا تھا۔

نانی بڑا اچھا گوشت خریدتی لیکن نانا پھپھروں اور ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہ لاتا۔ دونوں اپنی چائے شکر الگ الگ رکھتے تھے مگر چائے دان ایک ہی تھا۔ نانا بڑے تردد سے کہتا:

”ٹھہرنا۔۔۔ ٹھہرنا تو سہی!۔۔۔ کتنی چائے ڈالی ہے؟“  
چائے کی پتی ہاتھ میں لے کر بڑی احتیاط سے اسے تول کر وہ بولتا:  
”تمھاری چائے ٹبکتی ہے اور میری چائے کی پتی بڑی ہے۔ لہذا میں کم چائے ڈالوں گا۔“

اُسے اس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ دونوں کی چائے یکساں تیز ہو اور نانی ایک آدھ گھونٹ زیادہ نہ پی لے۔

شہ نشین کے چراغ تک کے لیے تیل الگ الگ آتا تھا!—  
اور یہ سب پچاس سال کی مشترکہ زندگی کے بعد!!!  
نانا کی ان حرکتوں پر مجھے کبھی ہنسی اور کبھی جڑ آتی تھی۔ مگر نانی کے لیے وہ محض مضحکہ خیز تھیں۔

مجھے بچپن کا رکر وہ سمجھاتی: ”تو تماشا تو دیکھ! اس سے اپنا کیا بگڑتا ہے؟ یہ سٹھیا گئے ہیں اور اب ان کے حواس ٹھکانے نہیں۔ زیادہ نہیں تو اب ان کی عمر میں کم سو کی تو ہوگی ہی۔ اگر یہ خطی بن کر ہی خوش ہیں تو اپنی بلا سے۔ اپنے اور تیرے لیے میں تھوڑی بہت محنت کر سکتی ہوں۔“

میں بھی چند پیسے کمانے لگا۔ چھٹی کے دن صبح سویرے میں ٹوکرا لیے ہوئے نکل جاتا اور سڑکوں اور گلیوں میں کترن، ہڈیاں، کیلیں وغیرہ چٹا کرتا۔ آدھ من لوہے، کاغذ یا کترن کے لیے کباڑیا مجھے

چوٹی اور آدھ من ہڈی کے لیے دوٹی دیتا۔ اسکوں کے بعد شام کو بھی میں یہ کام کرتا اور سینچر کو ایک آدھ روپیہ کا کباڑ بیچ آتا۔ نانی یہ پیسے جھٹ اپنی گرہ میں چھپا کر میری بلائیں لیتی۔

”خدا تیری عمر میں برکت دے میرے لاڈلے! اس سے آج گھر بھر کی روٹیاں نکل آئیں گی۔۔۔ تو نے یہ بڑا کام کیا۔“

ایک روز میرے ہاتھ سے اکٹی لے کر وہ چپ چپ رونے لگی اور میں نے دیکھا کہ آنسو کا ایک میلا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپک کر ناک کے نیچے ٹھہر گیا ہے۔

کوڑا کرکٹ بٹورنے سے زیادہ مفید مشغلہ ندی کنارے کے ساگوان کے گوداموں سے تختوں اور شہتیروں کی چوری تھی۔ یہاں جب میلا لگتا تو لوہے کی بکری کے لیے عارضی دوکانیں کھڑی کی جاتیں۔ میلے کے بعد دوکانیں اٹھا دی جاتیں اور تختے اور شہتیر گوداموں میں ڈال دیے جاتے۔ ایک مضبوط تختہ دوٹی میں بک جاتا تھا اور دن بھر میں آسانی سے دو تختے چرائے جاسکتے تھے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن تھا جب موسم خراب ہو۔ کیونکہ برف کے طوفان یا موسلا دھار برکھا میں چوکیدار ادھر ادھر چلے جاتے تھے۔

اس مشغلے کے لیے مجھے کچھ ساکتی بھی مل گئے۔ ایک بھکاری

کا دس سالہ بیٹا ’سنگا‘ جو بڑا نرم مزاج اور من مو جی تھا، ’ہیتم کو سترم‘ جو ڈبلا اور لمبا تھا اور صرف ۱۳ سال کی عمر میں دو بطنوں کی چوری کے جرم میں جیل کی ہوا کھا آیا تھا، بارہ سالہ ناتار ’خابی‘ جو سیدھا سادہ ہونے کے باوجود بلا کا زور آور تھا،

گورکن کا آٹھ سالہ بیٹا 'یاز' جو بہت ہی کم سخن تھا اور مرگی کے مرض میں مبتلا تھا اور ہم میں سب سے اونچا ایک رنڈوے دزدی کا بیٹا 'گرشکا چرکا' جو سمجھدار ہونے کے ساتھ غضب کا لڑاکا تھا۔ ہم سب ایک ہی سڑک پر رہتے تھے۔

ہمارے گاؤ میں چوری کا شمار کسی جرم میں نہ ہوتا تھا۔ یہ ایک رسم عام تھی اور غریب دیہاتیوں کے لیے اس کے سوا روٹی کمانے کا کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ میلا صرف ڈیڑھ ماہ کے لیے بھرتا تھا اور اس میں سال بھر کی روزی نہیں نکل سکتی تھی۔ کئی مشریف ندی میں شکار کھیلا کرتے — یعنی لہروں میں بہ کر کنارے آگے ہوئے شہتیروں کو ایک ایک دودو کر کے اٹھالے جاتے۔ لیکن اس کارگزاری کی اصل شکل یہ تھی کہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا میں گشت لگاتے پھرتے اور موقع ملتے ہی دوسروں کا مال چُرالے جاتے تھے۔ معمر لوگ اتوار کو اپنی کامیابیوں کی داستان سناتے اور جھوٹے اسے سن کر تجربہ حاصل کرتے تھے۔

موسم بہار میں میلے سے چند روز پہلے گاؤ کی سڑکیں شرابی مزدوروں سے بھر جاتیں اور دیہاتی لڑکے ان کی جیب کترا کرتے۔ یہ شغل ناجائز نہ سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے بڑوں کی آنکھوں دیکھتے یہ حرکت کیا کرتے تھے۔ بڑھئی کے اؤزار، گاڑی کے چاک یا گھوڑے کی لگام تک چرانے سے وہ باز نہ آتے تھے۔ لیکن ہماری ٹولی اس قسم کی چوری نہ کیا کرتی تھی۔ ایک دن 'چرکا' نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا :

”اب میں کبھی چوری نہ کروں گا۔ اماں کو یہ پسند نہیں ہے۔“  
 خابی نے بھی اس کی تائید کی: ”اور مجھے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا  
 ہے۔“ ”کو سترم“ کو کم عمر چوروں سے سخت نفرت تھی۔ چور کے  
 لفظ پر وہ بڑا زور دیتا تھا۔ جب وہ بچوں کو شرابیوں کی  
 گرہ کاٹتے دیکھتا تو انھیں بھگا دیتا تھا اور اگر کوئی پکڑ میں آجاتا  
 تو اس کی خوب ٹھکاٹی کرتا۔ یہ دراز چشم اور سدا اُداس لڑکا  
 اپنے کو کوئی بزرگ تصور کرنے لگا تھا۔ وہ ایک دربان کی  
 طرح اکڑ کر چلتا، جان بوجھ کر اپنی آواز کو کرخت بنانے کی  
 کوشش کرتا اور کسی بڈھے کی طرح سنجیدہ اور متین بنا رہتا۔  
 میاں ”سنگا“ ایک سرے سے ہر قسم کی چوری کے خلاف تھے۔  
 لیکن لاوارث تختوں اور شہتیروں کو اٹھا لے جانا  
 چوری نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کام سے ہم زرا نہ جھجکتے تھے اور  
 ایسا جتن کرتے تھے کہ راہ میں کوئی دشواری نہ پیدا ہوتی تھی،  
 شام کو جب اندھیرا ہوتا، یا دن کو جب موسم خراب ہوتا،  
 دولڑکے ندی کی کھاڑی پار کر جاتے تھے۔ وہ سامنے سے  
 ہو کر جاتے تھے تاکہ چوکیداروں کا دھیان ان پر لگا رہے۔  
 باقی یار الگ الگ چھپ کر اس پار جا لگتے تھے۔ چوکیدار ہمارے  
 دونوں ساتھیوں کے پیچھے لگے رہتے اور ادھر ہم گودام میں  
 جا کر مال غنیمت پر ہاتھ مارتے اور چمپت ہو جاتے۔ اس  
 اثنا میں ہمارے دونوں پھرتیلے دوست چوکیداروں کو ادھر  
 اُدھر نچاتے رہتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک

رستی اور مڑی ہوئی کیں ہوتی جے ہم تختے یا لٹھے میں باندھ دیتے اور اسے برف یا پانی میں کھینچتے ہوئے لے جاتے۔ شاید ہی کبھی چوکیداروں کی نظر ہم پر پڑتی، مگر پکڑنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

لوٹ کے ماں کو بیچ کر ہم یہ رقم چھ مساوی حصوں میں تقسیم کرتے اور کبھی کبھی ایک ایک حصے میں ڈیڑھ دو آنے تک پڑ جاتے۔ اتنے پیسوں میں مزے سے دن بھر گزارہ ہو جاتا تھا۔ اگر 'سنگا' ہر روز اپنی ماں کو ایک ادھے کا دام نہ لے جا کر دیتا تو وہ اسے پیٹتی تھی۔ 'کو سترم' اپنے پیسے اس ارادے سے جمع کر رہا تھا کہ کبوتر خانہ بنائے گا۔ 'چُرکا' کی ماں بیمار تھی اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا تھا۔ 'خابی' کا خواب یہ تھا کہ گھر واپس جانے کا کرایہ مل جائے، جہاں سے بچپن میں اس کا چچا اسے لے آیا تھا اور خود کسی ندی میں ڈوب مرا تھا۔ خابی کو اپنے شہر کا نام تک یاد نہ تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ دریائے وولگا کے کنارے 'کاما' کے پاس بسا ہوا ہے۔ ہم سب اس کانے تاتار کو چڑانے کے لیے یہ گاکا کر اس بے نام شہر کا مذاق اڑاتے تھے۔

'کاما' میں ہے ایک شہر نام ہے اس کا یوں ہی سا آنکھ نہ اس کو دیکھ سکے پانو نہ اس پر کوئی رکھے

پہلے تو خابی 'بھٹا اُٹھتا تھا۔ ایک روز 'سنگا' نے چمکا کر کہا: "تم دیوانے تو نہیں ہو؟ کوئی اپنے دوستوں سے یوں خفا ہوتا ہے۔" تاتار جھینپ گیا اور آئندہ اس گیت میں ہماری ہم نوائی



کرنے لگا۔

خیر جو کچھ بھی ہو، تختوں کی چوری پر ہم ہر حال میں کوڑے کرکٹ کی چنائی کو ترجیح دیتے تھے۔ برت پھل جانے کے بعد بہار میں جب بارش سڑکوں کو غسل دے چکتی تو یہ کام خصوصاً دلچسپ ہو جاتا۔ جہاں میلا بھرا کرتا تھا وہاں کے ناب دانوں میں لوہے کی چیزوں کی بہتات تھی اور گاہے گاہے تانبے یا چاندی کے سکے بھی نکل آتے تھے۔ کہیں چوکیدار ہمیں بھگا نہ دے یا ہمارے تھیلے نہ چھین لے، اس ڈر سے ہمیں اسے چند پیسے دینے ہوتے تھے اور اس کی خوشامد میں لگا رہنا ہوتا تھا۔ پیسے کمانا آسان نہ تھا تاہم عارضی ٹکراؤں کے باوجود ہم سب میں بڑا بھائی چارا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم ایک بار بھی سچ مچ لڑے ہوں۔

ہمارا صلح کار 'سنگا' تھا جو ہر موقع کے لیے چکنے چڑے جملوں کے ساتھ تیار رہتا تھا، جنھیں سن کر ہم سب کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور ہم حیرت میں رہ جاتے۔ وہ خود بھی تعجب کے انداز میں بچاؤ کرتا اور 'باز' کی جھڑکی یا پھبتی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کی رائے میں ہر بڑی بات غیر ضروری تھی اور وہ قطعی طور پر اس کی تردید کر دیتا تھا۔

اس کا سوال یہ ہوتا تھا: "آخر اس سے حاصل کیا؟" اور

ہم بھی مان جاتے تھے کہ دراصل یہ لا حاصل ہے۔

وہ اپنی ماں کو 'قزاقن' کہا کرتا اور ہم اس پر کبھی نہ ہنستے تھے۔ اپنی سنہری آنکھوں سے مسکرا کر وہ مٹاتا: "شام کو میری

قزاقن نشہ میں چور گھر آئی۔ اور دروازہ کھول کر چوکھٹ پر بیٹھ کر مرغیوں کی طرح گانے لگی۔

”وہ گیت کیا تھا؟“ چُرکا نے پوچھا۔ اسے باضابطگی بہت پسند تھی۔ اپنی ران پر طبلہ بجاتے ہوئے سنکا وہ گیت دُہرانے لگا۔

”گڈریے کھول دے اپنی کھڑکیا

بچی بھاگیں جگل جگل

بنسی بجا اور سب کو لے چل

اوٹ میں چھپ کر تان اٹا

سارے جگ کے من کو بھا!

اُسے صد ہا گیت یاد تھے اور اس کی آوازیں بڑا رس تھا۔

”گاتے گاتے وہ چوکھٹ پر سو گئی۔ ادھر کمر اٹھڑا برن ہو گیا۔

اور خدا جانے میں اکڑ کر مرنے سے کیسے بچا۔ صبح میں نے پوچھا:

آخر تم اتنی شراب کیوں پیتی ہو؟ جواب ملا: اس سے نقصان کیا؟

تھوڑی مدت اور میرا بوجھ اٹھالے، میں زیادہ نہیں جینے کی۔“

چُرکا نے سنجیدگی سے رائے زنی کی: ”وہ ٹھیک کہتی ہے۔ اُسے

’استسقا‘ کی بیماری لگ گئی ہے۔“

”اس کی موت پر تم رنجیدہ ہو گے؟“ میں نے پوچھا۔

سنکا نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا: ”کیوں نہیں۔ وہ مجھے

چاہتی ہے۔“ اور گو ہم جانتے تھے کہ ’قزاقن‘ اسے بیرحمی سے

ٹھوکتی ہے مگر اس کے کہے پر یقین کرنے لگے۔ اگر کبھی ہماری

کمای بہت کم ہوتی تو چُرکا کہتا:

”ہم سب مل کر ’سنگا‘ کی ماں کے لیے شراب خرید دیں ورنہ وہ بے چارے پٹے گا۔“

اس منڈلی میں صرف میں اور ’چُرکا‘ بڑھ لکھ سکتے تھے۔ ’سنگا‘ ہم سے رشک کرتا اور اپنے چوہوں کے سے کان ہلا کر کہا کرتا: ”اماں کے مرتے ہی میں اسکول جانے لگوں گا۔ میں ماسٹر کے پیر پڑوں گا کہ مجھے اپنی جماعت میں داخل کر لے۔ تعلیم ختم کر کے میں استفت اعظم یا کیا عجب کہ بادشاہ کا مالی ہو جاؤں۔“

ایک دن قزاقن ’گر جاگھر کے بوڑھے جمعدار کے ساتھ شراب پیتے پیتے لکڑی کے گٹھے کے نیچے کچل گئی۔ جب وہ اسپتال پہنچا دی گئی تو دانشمند ’چُرکا‘ نے سنگا سے کہا:

”تم میرے گھر آ رہو۔ میری ماں تمہیں پڑھنا لکھنا بھی سکھائے گی۔“  
تھوڑے ہی عرصے میں میاں ’سنگا‘ ’سراٹھا کر دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے لگے۔ جب وہ مودی کی دکان کو ’بالا کینا‘ پڑھتا تو ’چُرکا‘ اسے سدھارتا:

”ارے بھائی یہ ’بقا لینا‘ ہے۔“

”ہاں ہاں۔ لیکن حروف میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتے ہیں۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑتے ہیں کہ انہیں کوئی پڑھ رہا ہے۔“

پیٹر پودوں سے وہ ایسی محبت کرتا تھا کہ ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ گاٹو کی زمین ریتیلی تھی جس کی وجہ سے یہاں سبزہ کی کمی تھی۔ اگے دُگے مکانوں میں ایک آدھ ٹھٹھ ہو تو ہو اور کسی کوئے کھد رے میں گھاس کے چند تیکے چھپے چھپائے مل جاتے تھے۔

اگر ہم میں سے کوئی ان پر بیٹھ جاتا تو 'سنگا' غصے سے چنچ اٹھتا،  
 ”کیا تم نے گھاس پر ہی بیٹھنے کی قسم کھائی ہے؟ زمین پر بیٹھنے  
 میں تمھاری ہتک تو نہیں ہوتی۔“

اس کی رائے میں کسی پیڑ کی ٹہنی توڑنا یا پھول نوچنا گناہ  
 تھا خواہ یہ شاخ سڑ گئی ہو اور پھول مڑھ گیا ہو۔ جب کبھی ہم کو  
 وہ یہ کرتے دیکھتا تو محو حیرت ہو کر پکارنے لگتا:  
 ”آخر تمھیں ہر شے کو توڑنے پھوڑنے میں کیا ملتا ہے؟ بدعاشو  
 تم نے یہ کیا ستم کیا؟“ اور اس کے افسوس کا یہ عالم ہوتا کہ ہم  
 سب کو خفت ہوتی۔

سینچر کے دن کے لیے ہم نے ایک بڑا مزیدار کھیل ایجاد  
 کیا تھا۔ ہفتہ بھر ہم پھٹی پڑائی جوتیاں جمع کرتے اور انھیں کونوں  
 میں چھپا دیتے۔ سینچر کی شام کو حیب تاتا رقتی سائیریا کے بندرگاہوں  
 سے گھر لوٹتے تو ہم دورا ہوں پر مورچہ بنا کر جم جاتے اور تاتاروں  
 پر جوتوں کی بوچھاڑ کرنے لگتے۔

اول اول تو وہ سخت ناراض ہوئے اور گالیاں بکتے ہوئے  
 ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ لیکن کچھ روز بعد انھیں بھی اس کھیل میں مزا  
 ملنے لگا۔ جب وہ میدان جنگ میں آتے تو پڑانے جوتوں کا گٹھڑ  
 ساتھ لاتے۔ اور تو اور، وہ ہمارے اسلحہ خانہ کی ٹوہ لے کر سامنے  
 جوتے چرا لے جاتے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ یہ بھی کوئی کھیل میں  
 کھیں ہے؟ اس کے بعد لڑنے سے پہلے ہم سارے جوتے آدھوں  
 آدھ بانٹنے لگے۔ اکثر وہ چوک کے بچوں بیچ کھڑے ہو جاتے اور

ہم سب لونڈے چیتے ہوئے انھیں گھیر کر جوتے پھینکنا شروع کرتے تھے۔ وہ بھی نعرے لگاتے اور اگر ہم میں سے کوئی ٹانگ میں جوتا پھنس جانے کے سبب سے ریت میں منہ کے بل گر پڑتا تو پھر تو ان کا قہقہہ کان کے پردے پھاڑ دیتا تھا۔

بڑے جوش و خروش سے دیر تک اس کھیل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی کبھی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ دیہات کی ساری آبادی تماشا دیکھنے آتی اور ہمیں بڑھاوا دیتی تھی کیونکہ اس کی نظر میں یہ بھی ایک کمال تھا!۔ جوتے کوؤں کی طرح بھیگی ہوا میں سننایا کرتے تھے۔ کبھی ایک آدھ کو زور کی چوٹ بھی آ جاتی تھی۔ لیکن کھیل اتنا دلچسپ تھا کہ چھوٹی موٹی خراش پر کسی کی توجہ نہ جاتی تھی۔

تاتاروں کو ہم سے کم مزہ نہ آتا تھا۔ اکثر کھیل کے بعد وہ ہمیں ایک قہوہ خانے میں لے جاتے اور ایک قسم کے مرتبے سے ہماری تواضع کرتے۔ کھانے کے بعد عمدہ چائے اور مٹھائی ہمیں دی جاتی۔ ہمیں یہ قد آور ہابلی تاتار بہت بھاتے تھے۔ وہ دل کے بڑے صاف اور بچوں جیسے بھولے تھے۔ مجھ پر ان کی ملنساری، نیکی اور باہمی رواداری نے گہرا اثر کیا۔

وہ جی کھول کر اس قدر ہنستے تھے کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ ان میں ایک نکتا اپنی طاقت کے لیے سارے علاقے میں مشہور تھا۔ ایک مرتبہ وہ تیرہ من وزنی گھنٹا کنارے سے اٹھا کر اسٹیمر کے اندر لے گیا اور برابر ہنستا رہا۔

ایک روز سنا، کو ہتیلی پر بٹھا کر اس نے سر سے اوپر اٹھا لیا اور پوچھا: ”میاں اب کس دنیا میں رہتے ہو؟“

اگر موسم بُرا ہوتا تو ہم ’یاز‘ کے مکان میں جمع ہوتے۔ یہ مکان قبرستان میں واقع تھا۔ اس کا باپ ڈیڑھ پسی کا آدمی تھا۔ بے لمبے بازو اور جھوٹی سی کھوپڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی پتلے سے ڈنٹھل پر گول سا بھول رکھا ہے۔ اپنی پسی آنکھوں کو کچھ بند کر کے وہ مضحکہ خیز انداز میں تیزی سے بڑبڑایا کرتا:

”بھج مولا چھپن کر وڑ کی چوتھائی — اوخ!“

ہم چائے شکر اور ڈبل روٹی خرید لاتے۔ ’یاز‘ کے باپ کے لیے شراب لانا بھی ہم نہ بھولتے تھے۔ چرکا اسے ٹپٹ کر حکم دیتا: ”اے کاہل گنوار اب تک چائے کا پانی نہیں رکھا؟“ کسان ہنس کر پانی رکھنے لگتا، اور جب چائے کے انتظار میں ہم اپنی تجارت پر بحث کرتے تو وہ پرانا گھاگہ ہمیں نئے نئے منکتے سُبھاتا:

”سنو لڑکو! پرسوں زمیندار ’ترو سوف‘ کے گھر دعوت ہے۔۔۔۔۔“

ہڈیاں بٹورنے کا اچھا موقع ہے۔“

لیکن ہمہ دان چرکا نے سر ہلا کر کہا:

”اس کا خانساں ایک ہڈی نہیں پھینکتا۔“

سنا نے کھڑکی سے سر نکال کر قبرستان کو دیکھتے ہوئے کہا:

”بہت جلد ہم باہر جنگلوں میں جاسکیں گے۔“

’یاز‘ سدا خاموش رہتا اور اپنی پُر حسرت آنکھوں سے ہمیں

تاکا کرتا۔ بغیر کچھ کہے وہ ہمیں اپنے کھلونے دکھانے لگا۔  
چوہی سپاہی جو اُسے کسی ناب دان میں مل گئے تھے، یا شکستہ گھوڑے،  
تانے کے ٹکڑے اور بٹن۔

اس کے باپ نے میز لگائی اور بھانت بھانت کی کٹوریوں  
کے ساتھ کیتلی لاکر رکھ دی۔ اپنی شراب ختم کر کے وہ خود تندور  
پر اُچک گیا اور اپنی تلی گریڈن نکال کر کھنے لگا:  
”اوہو! تم لوگ تو بڑے بوڑھوں کی طرح آرام طلب ہوئے جا رہے ہو!  
کیوں! چور کہیں کے۔۔۔ بیچ مولا چھپن کروڑ کی چوتھائی!“  
’سنگا‘ نے جواب دیا: ”واہ ہم چور کیوں ہونے لگے؟“  
”اچھا چور نہیں تو ٹھگ سہی!“

اگر ناز کا باپ زیادہ کرکری کرتا تو چڑکا اسے ڈانٹ پلاتا:  
”چپ رہتا ہی یا نہیں بے زبان دراز دیہاتی!“

’سنگا‘ چڑکا، اور مجھے اس شخص کی اس عادت سے انتہائی نفرت  
تھی کہ وہ گالوں کے تمام پیاروں کا حساب لگایا کرتا اور اُن آدمیوں کے  
نام گنایا کرتا جو جلد مرجانے والے تھے۔ وہ نہایت اطمینان اور سردہری سے  
اپنا حساب جاری رکھتا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہمیں یہ حرکت سخت  
نا پسند ہے وہ قصداً ہمیں سُنایا کرتا:

”جی ہاں، نواب صاحب، آپ کو ڈر لگتا ہے؟ بہت خوب! تاہم  
چند روز کے اندر ایک مرد جوان موت سے نہیں بچ سکتا۔ اور قبر میں اس کی  
ایک ایک ہڈی گل جائے گی!“

ہم نے اس کا منہ بند کرنا چاہا لیکن وہ چپ نہ ہوا:

”اور تم سب کو ایک دن مرنا ہے۔ اس سڑان میں کون زندہ رہ سکتا ہے؟“  
’سنگا‘ نے جواب دیا: ”ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہم سب کو فرشتوں کا مرتبہ ملے گا۔“

یاز کے باپ نے چونک کر سانس روک لی: ”کیا کہا؟ فرشتے؟ اور تم؟“ قہقہہ لگا کر وہ پھر ہمیں چڑانے کے لیے مُردوں کے قصے سُنانے لگا۔

کبھی کبھی یہ شخص پُر اسرار لہجے میں یوں سرگوشی کرنے لگتا۔  
”بچو! کان لگا کر سُنو! پیرسوں انھوں نے ایک عورت کو دفن کیا۔۔۔۔۔ اور مجھے اس کی زندگی معلوم ہے۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو وہ کون تھی؟“  
وہ اکثر عورتوں کا ذکر کرتا تھا اور از حد فحش انداز میں۔ تاہم اس کی کہانیوں میں تھوڑا سا درد چھپا ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ہمیں اپنے خیالات سنانے کے لیے بیتاب ہے۔ اور ہم کان لگا کر اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اس کے بولنے کا انداز جاہلانہ ہوتا اور بیچ بیچ میں بے محل سوال کیا کرتا۔ لیکن یہ کہانیاں حافظے پر ایک ہیجانی نقش چھوڑ جاتی تھیں۔

”اس عورت سے پوچھا گیا: گھر میں آگ کس نے لگائی۔ اس نے فوراً اس جرم کا اقبال کر لیا! اری بد بخت تو تو اسپتال میں بیمار پڑی تھی، وہاں سے اپنے گھر کس طرح آئی؟ لیکن وہ ایک ہی رٹ لگائے گئی۔ کیوں؟۔۔۔ اوف! بیچ مولا چھپن کر وڑکی چوتھائی!“  
اس اجاڑ سنان قبرستان میں اس نے جتنی عورتوں کو دفن کیا تھا اُن میں سے ایک ایک کی زندگی سے واقف تھا۔ یہ معلوم



ہوتا تھا کہ وہ پرانے گھروں کے کواڑ کھول کر ہمیں دکھا رہا تھا کہ ان کے  
 لیکن کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سے ہم ایک قسم کی متانت  
 اور اہمیت محسوس کرنے لگے۔ وہ رات بھر ایسے واقعات سُنا سکتا تھا۔  
 لیکن جیسے ہی شفق پھولتی اور جھپٹے کا سماں ہوتا چُرکا ' اٹھ کھڑا  
 ہوتا اور پوچھتا: "اب میں گھر جاؤں ورنہ اماں پریشان ہوں گی۔  
 میرے ساتھ کون آتا ہے؟"

ہم سب باہر آجاتے تھے۔ یازہیں باڑی تک پہنچانے آتا۔  
 اور پچھلک اندر سے بند کر کے اور منہ لکال کر بھڑائی ہوئی آواز  
 میں "خدا حافظ" کہتا۔ ہم سب 'شب بخیر' پکار کر چل پڑتے تھے۔  
 اس اکیلی جان کو قبرستان میں چھوڑ آنا ہمیں بُرا لگتا تھا۔ 'کوسٹرم'  
 نے ایک روز پیچھے لوٹ کر کہا: "کیا عجب کہ کل جب ہم لوٹیں  
 تو یہ مرا ہوا ملے۔"

'چُرکا' اکثر کہا کرتا کہ یاز کی زندگی ہم سب سے زیادہ کٹھن ہے۔  
 مگر 'سنگا' اس کی تردید کرتا: "ہم سب اسی حال میں خوش ہیں۔"  
 اب جو میں اس زمانہ کا تجزیہ کرتا ہوں تو ماننا پڑتا ہے کہ ہم سب  
 اسی حالت میں گن تھے۔ یہ آزاد زندگی جو اصداد سے مرکب  
 تھی، اپنے میں دیکھیوں کا ایک جہان رکھتی تھی۔ میرے یہ ہمدم  
 میرے دل میں ہمیشہ بھلائی اور نیکی کے جذبات پیدا کرتے تھے۔  
 اسکول میں مجھے پھر گونا گوں دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔  
 میرے ساتھی مجھے "بھنگی" اور "آوارہ" کہ کر پکارنے لگے۔ اور ایک  
 دن بڑی تو تو میں میں کے بعد انھوں نے ماسٹر سے شکایت کی کہ

اس کے جسم سے سٹری ہوئی نالی کی سی بدبو آتی ہی اور وہ میرے پاس نہیں بیٹھ سکتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس الزام نے مجھے کیسا صدمہ پہنچایا۔ اس کے بعد اسکول جانا میرے لیے ناممکن سا ہو گیا۔ یہ الزام قطعاً بے بنیاد تھا، کیونکہ ہر صبح میں اچھی طرح نہاتا دھوتا اور وہ کپڑے کبھی نہ پہنتا تھا جنہیں کوڑا کرکٹ جمع کرتے وقت استعمال کرنا ہوتا تھا۔

خدا خدا کر کے میں نے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا۔ انعام میں مجھے انجیل کے علاوہ قصوں کی دو کتابیں اور ایک سند بھی ملی۔ ان تحفوں کو دیکھ کر نانا بہت خوش ہوا اور فی الفور اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ یہ کتابیں اس کی صندوقچی میں بند رہیں گی۔ مگر نانی کئی دن سے بیمار تھی اور اس کے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔ نانا برابر اسے دھمکایا کرتا: ”آری تو مجھے پھر برباد کر کے رہے گی۔۔۔۔۔ ہشت! دھت!“ اس لیے میں کتابیں بارہ آنے میں بیچ آیا اور یہ رقم نانی کو دے دی۔ اسناد پر کچھ اناب شناپ لکھ کر میں نے نانا کو دیا اور اس نے بے دیکھے انہیں کہیں ڈال دیا۔ اس کا انجام مجھے بعد میں بھگتنا پڑا۔ اسکول بند ہو چکا تھا اور میں از سر نو کوچہ گردی کرنے لگا۔ اس مرتبہ اس زندگی میں نیا لطف ملا۔

یہ وسط بہار کا زمانہ تھا اور ہمارا روزگار آسان ہو گیا تھا۔ اتوار کو ہم سب کھیتوں یا جھاڑیوں میں سیر کرتے، جہاں پیڑ پودوں نے نئی پوشاک پہن لی تھی۔ ہم صبح جاتے اور شام کو

جب لوٹتے تو جسم میں ایک خوشگوار کس کساہٹ سی ہوتی اور ہمارا باہمی اخلاص زیادہ بڑھ جاتا۔

لیکن یہ دن جلد بیت گئے۔ میرا سوتیلا باپ قرض لینے کے جرم میں نوکری سے برطرف کر دیا گیا اور دوبارہ غائب ہو گیا۔ اماں اپنے چھوٹے بیٹے نکولائی کو لیے ہوئے نانا کے گھر آئی اور نانی کی غیر حاضری میں اس کی خدمت میرے ذمے پڑی۔ نانی اب شہر میں ایک امیر سوداگر کے گھر رہتی اور کفن سینے کا کام کیا کرتی تھی۔

اماں اس قدر کمزور پڑ گئی تھی کہ چلنا اس کے لیے دو بھر تھا اور اس کی نگاہیں بھٹکی بھٹکی پھرتی تھیں۔ میرے بھائی کو خنازیر کا روگ لگ گیا تھا اور اس کا بدن زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ نقاہت کے مارے وہ زور سے رو بھی نہ سکتا تھا اور صرف اس وقت کراہتا جب بھوکا ہوتا۔ دودھ پیتے ہی وہ سو جاتا اور اس کے گلے سے چھوٹی سی بلی کی غرغراہٹ کی سی آواز نکلتی۔ اسے غور سے دیکھ کر نانا نے کہا۔

”اُسے عمدہ غذا کی ضرورت ہے۔ اور میرے پاس تم سب کو پالنے کے لیے سرمایہ نہیں۔“

بستر پر ٹکے ٹکے اماں نے ایک گہری سانس لی اور جواب دیا۔

”اُس ننھی سی جان کے لیے ایک مٹھی اناج بس ہے۔“

”ایک ایک مٹھی کر کے بڑی سی ڈھیری بن جاتی ہے۔“

پھر میری طرف مڑ کر اس نے حکم دیا۔

”نکولائی کو دھوپ میں ریت میں سونا چاہیے۔“

نانا کے فرمان کے مطابق میں نے ریت کی ایک بوری دھوپ میں پھیلا کر اپنے بھائی کو اس میں گلے گلے گاڑ دیا۔ اس جھوٹے سے بچے کو ریت کا بچھونا بہت پسند تھا۔ بڑے مزے میں غول غول کرتے ہوئے۔ وہ اپنی روشن آنکھوں سے مجھے تاکا کرتا۔ ان آنکھوں میں کیسی موسمی تھی اور سفیدی کا نام نہ تھا، نیلی پتلیوں کے ارد گرد جگمگاتے ہوئے ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

اپنے جھوٹے بھائی سے مجھے لگاؤ سا ہو گیا۔ جب میں ریت پر لیٹ کر اپنے نانا کی یہ بیدرد نصیحت سنا کرتا تو محسوس ہوتا کہ نکولائی میرے خیالات کی رو سے ہم آہنگ ہے:

”بیٹی اگر یہ بچہ مرجائے — اور اسے اس مرحلہ میں کوئی تکلیف نہ ہوگی — تو تیری جان بچ جائے گی۔“

اس کے جواب میں اماں دیر تک کھانستی رہتی تھی۔

اپنے ہاتھ باہر نکال کر یہ بچہ میری طرف پھیلا دیتا اور اپنا زردا سا سفید سر ہلانے لگتا۔ اس کے سر میں بہت کم بال تھے اور جو تھے وہ بالکل بھورے۔ اس کے چہرے پر بزرگی اور دانشمندی کی علامت تھی۔ اگر ہمارے قریب کوئی مرغی یا بلی آتی تو اسے دیر تک دیکھ کر نکولائی میری طرف نظر پھرتا اور ایک پُر معنی انداز میں مسکراتا اس کی یہ مسکراہٹ مجھے بیچین کر دیتی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے ساتھ رہتے رہتے میں تنگ آگیا تھا اور باہر بھاگ کر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے

بیاب ہو رہا تھا؟۔

آنگن تنگ تاریک اور گندہ تھا۔ پھاٹک سے لے کر دھو بی گھر تک مختلف کوٹھڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ پرانی کشتیوں کے تختوں سے چھتیں بنائی گئی تھیں۔ جب ندی میں سیلاب آتا یا برون پگھلتی تو گاؤ کے باشندے لکڑی کے یہ گندے چرا لاتے تھے۔ پورا آنگن بھانت بھانت کے لکڑوں سے پٹا پڑا تھا اور ایک بد نما ہیولا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پانی میں سیلے ہوئے یہ لکڑ جب دھوپ کھاتے تو ایک سٹری ہوئی بدبو پھیل جاتی تھی۔

پڑوس میں ایک مذبح تھا۔ صبح صبح وہاں سے بچھڑوں اور بھیرٹوں کا شیون اٹھتا تھا۔ اور کبھی کبھی خون کی بڑا تنی تیز ہو جاتی کہ مجھے محسوس ہوتا کہ ایک شفاف سرخ چادر کی شکل میں یہ خون ہوا میں تیر رہا ہے۔

کلھاڑی سر پہ پڑتے ہی جانور ایک دردناک چیخ مارتے اور نکولائی چونک کر یوں منہ بناتا گویا ان کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ زیر لب او ف کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتا . . . . . دوپہر کو کھڑکی سے سر نکال کر نانا آواز لگاتا:

”کھانا تیار ہے؟“

بچے کو گھٹنے پر بٹھا کر وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا۔ نکولائی کے منہ میں روٹی اور آلو بھرتے ہوئے وہ اس کے سارے منہ کو سان دیتا۔ چند نوالے کھلا کر نانا اس بچے کے پھولے ہوئے پیٹ کو انگلی سے ٹٹولتا اور آپ اپنے سے پوچھنے لگتا:

”بس کروں؟ یا چند نوالے اور کھلاؤں؟“  
 اتنے میں اماں اپنے اندھیرے کونے سے پکار کر کہتی:  
 ”دیکھو وہ روٹی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔“  
 ”اُتو کا پٹھا! اسے اپنے پیٹ کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے!“  
 پھر وہ نکولائی کے منہ میں کچھ اور بھر دیتا۔  
 یہ نظارہ کتنا شرمناک تھا! میرا گلا رُندھ جاتا اور جی متلانے  
 لگتا تھا۔

بالآخر نانا کا ارشاد ہوتا: ”بہت ہو گیا۔ اسے اس کی ماں کے  
 پاس لے جا۔“

میں بچے کو گود میں اٹھا لیتا۔ وہ رو رو کر میز کی طرف ہاتھ پھیلانے  
 لگتا۔ اماں بشکل اٹھ کر میرے قریب آتی اور اپنے بازو پھیلا دیتی —  
 وہ بازو جو کسی مرجھائے ہوئے پیٹر کی ٹہنی کی طرح سوکھے سلکھے تھے۔  
 وہ تقریباً بے زبان ہو گئی تھی۔ اس کی وہ گونج دار آواز اب کہاں  
 چلی گئی تھی! اپنے کونے میں دن بھر چپ چاپ بے حرکت پڑی ہوئی وہ  
 ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھتی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ موت کے قریب ہے۔ اور  
 نانا اکثر اپنے اکتا دینے والے انداز میں موت کا ذکر کیا کرتا —  
 عموماً شام کے وقت جب آنگن میں اندھیرا پھیلنے لگتا اور بھیڑ کی اوں  
 کی سی گرم و نرم سٹرانڈ کمرے کے اندر گھسنے لگتی تھی۔

نانا کی کھڑکی شہ نشین کے نیچے تھی اور وہ اس کے نیچے پڑے  
 پڑے اندھیرے میں دیر تک گنگنا یا کرتا:

”اب ہماری موت سر پہ کھڑی ہوئی ہے۔ خدا کے آگے ہم کیا

لے کر جائیں گے؟ اسے ہم کیا جواب دیں گے؟۔ تمام عمر ہم نے کشمکش میں گزاری۔ لیکن اس کا کیا انجام ملا؟ اور کس غرض سے ہم یہ جدوجہد کرتے رہے ہیں؟۔“

میں زمین پر کھڑکی اور تندور کے بیچ میں سویا کرتا تھا۔ کافی جگہ نہ ہونے کے سبب سے مجھے اپنے پیرتندور کے اندر پھیلانے ہوتے اور تیل چنے ان پر رینگا کرتے۔ تھوڑا بہت لطف اس وقت آتا جب نانا جان کھانا پکانا شروع کرتے اور ہر مرتبہ تندور کی کریدنی سے کھڑکی کو توڑ بیٹھتے۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آتی اور حیرت بھی ہوتی کہ نانا جیسا مرد وانا کریدنی کی موٹھ کیوں نہیں اتار لیتا۔

ایک دن ہانڈی میں کوئی چیز اُبل رہی تھی۔ جلدی میں اس نے کریدنی اس زور سے کھینچی کہ کھڑکی چوکھٹ سے اُتر گئی۔ اس کے شیشے ٹوٹ گئے اور ہانڈی الٹ کر ٹوٹ گئی۔ بڑھا غصے سے بلبلا اٹھا اور زمین پر گر کر بلک بلک کر رونے لگا۔

”ہائے اللہ! اب میں کیا کروں۔“

اس کے باہر جاتے ہی میں نے چہرے سے کریدنی کی موٹھ کاٹ دی۔ مگر جب نانا نے میری کارگزاری ملاحظہ فرمائی تو بگڑ کر کہا: ”ابے شیطان کے بچے! اسے آری سے کاٹنا تھا۔ ارے ہم اس لکڑی کے بیلن بنا کر بیچ سکتے تھے!۔ نالائق! گدھے۔“

پانگوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ کمرے سے چلا گیا اور آٹا نے مجھے نصیحت کی: ”تمہیں ان کے معاملوں میں دخل دینے کی ضرورت کیا؟“

گت کے مہینے میں کسی اتوار کی دوپہر کو اس کا دم نکلا۔ میرا سوتیلا باپ ایک نئی ملازمت حاصل کر کے حال ہی میں اپنے سفر سے لوٹا تھا۔ نانا، نکولائی کو اس کے فلیٹ میں لے گیا تھا جو اسٹیشن کے قریب واقع تھا۔ چند روز میں اماں بھی وہاں پہنچائی جانے والی تھی۔

اتوار کی صبح کو اس نے دھیمی مگر ایسی ہلکی اور صاف آواز میں جو کچھ عرصے سے میں نے نہیں سنی تھی، کہا:

”اپنے آبا کے ہاں دوڑے جاؤ اور انھیں یہاں بلا لاؤ۔“

دیوار کا ٹیکا لگا کر وہ بولی۔ ”فوراً دوڑے جاؤ۔“

مجھے ایسا لگا کہ وہ مسکرا رہی ہو اور اس کی آنکھیں ایک نئی

روشنی سے جگمگا رہی ہیں۔

میرا سوتیلا باپ گر جا گھر میں تھا۔ ادھر نانی نے مجھے ناس لانے کے لیے بھیج دیا۔ ناس تیار نہ تھی۔ اس لیے دوکاندار نے مجھے ٹھہرنے کو کہا۔

اس کے بعد جب میں گھر لوٹا تو اماں سچی بنی کنگھی چوٹی کیسے کر سی

پر بیٹھی تھی اور پہلے کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا: ”اب آپ کی طبیعت کچھ بہتر ہو؟“

مجھے گھور کر اس نے کہا:

”یہاں تو آنا! تو اب تک کہاں تھا؟ ایس؟“

جواب سننے سے پہلے اس نے میرے بال پکڑ لیے اور ایک لمبی

سی لپلیاتی ہوئی چھری کئی بار ہوا میں گھا کر اس کے موٹے سے مجھے مارا۔

چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔



”اسے اٹھا کر مجھے دینا تو سہی۔“

چھری اٹھا کر میں نے میز پر پھینک دی اور اماں نے مجھے دھکیل دیا۔ تندور پر بیٹھ کر میں سہمی ہوئی چیتوں سے اس کی حرکتوں کو دیکھنے لگا۔

کرسی سے اٹھ کر وہ اپنے پلنگ پر جالیٹی اور رومال سے منہ کا پسینہ بو خچنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دو مرتبہ اس کے ہاتھ منہ کی بجائے تکیہ سے جا لگے۔

”ایک گھونٹ پانی۔“

جب میں کٹورے میں پانی لایا تو بمثل سراٹھا کر اس نے زرا سا پانی پیا۔ پھر اپنے سرد ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو دھکیل کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اس کو نے کی طرف آنکھ پھیر کر جہاں شہ نشین تھا، اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ہونٹوں کو ایسی جنبش دی گویا مسکرا رہی ہو۔ پھر اس کی لمبی لمبی پلکوں نے آہستہ آہستہ آنکھوں کو ڈھنک لیا۔ اس کی گہنیاں پسلیوں سے بھڑکی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ جن کی انگلیاں تڑپ رہی تھیں، سینے سے اُٹھ کر گلے کی طرف گئے۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا گریزا اور اس کی رنگت کو زردی دے کر اعضا میں ایک اُبھار سا پیدا کر گیا۔ اس کا منہ یوں کھلا ہوا تھا گویا وہ محویت کے عالم میں ہو لیکن اس کی سانس نہ سنائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں میں کب تک جُمت بنا ہاتھ میں گلاس لیے اپنی ماں کے پاس کھڑا رہا۔

جب نانا کمرے میں داخل ہوا تو میں نے کہا:  
”اماں مر گئیں“

پلنگ کی طرف دیکھ کر وہ بولا: ”چپ رہ بے گیتی!۔ تندور کے پاس جا کر وہ زور زور سے ہانڈی میں ڈوئی چلانے لگا۔  
مجھے اماں کی موت کا یقین تھا اور میں انتظار کرنے لگا کہ کب نانا کو اس سانحہ کا علم ہوتا ہے۔

میرا سوتیلّا باپ جہازیوں کے لباس میں اندر آیا۔ آہستہ سے ایک کرسی اٹھا کر وہ اماں کے پلنگ کے قریب لے گیا۔ یک بیک کرسی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ گلا بھاڑ کر چلا اٹھا:  
”ارے وہ تو مر گئی — دیکھو!“

نانا بھیٹی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ کر ڈوئی لیے ہوئے تندور سے ہٹ گیا اور اندھوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلا گیا۔

اماں کی تجہیز و تکفین کے چند روز بعد نانا نے کہا:  
”میاں الکی، اب میں تمہارا بار نہیں اٹھا سکتا۔ میرے گھر میں تمہارے لیے جگہ نہیں۔ دنیا میں جاؤ اور اپنی راہ تلاش کرو۔“  
اسی دن میں دنیا میں اپنی راہ ڈھونڈنے نکل گیا۔





